قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

www.urducouncil.nic.in

فروری 2021 قیمت 15₹

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

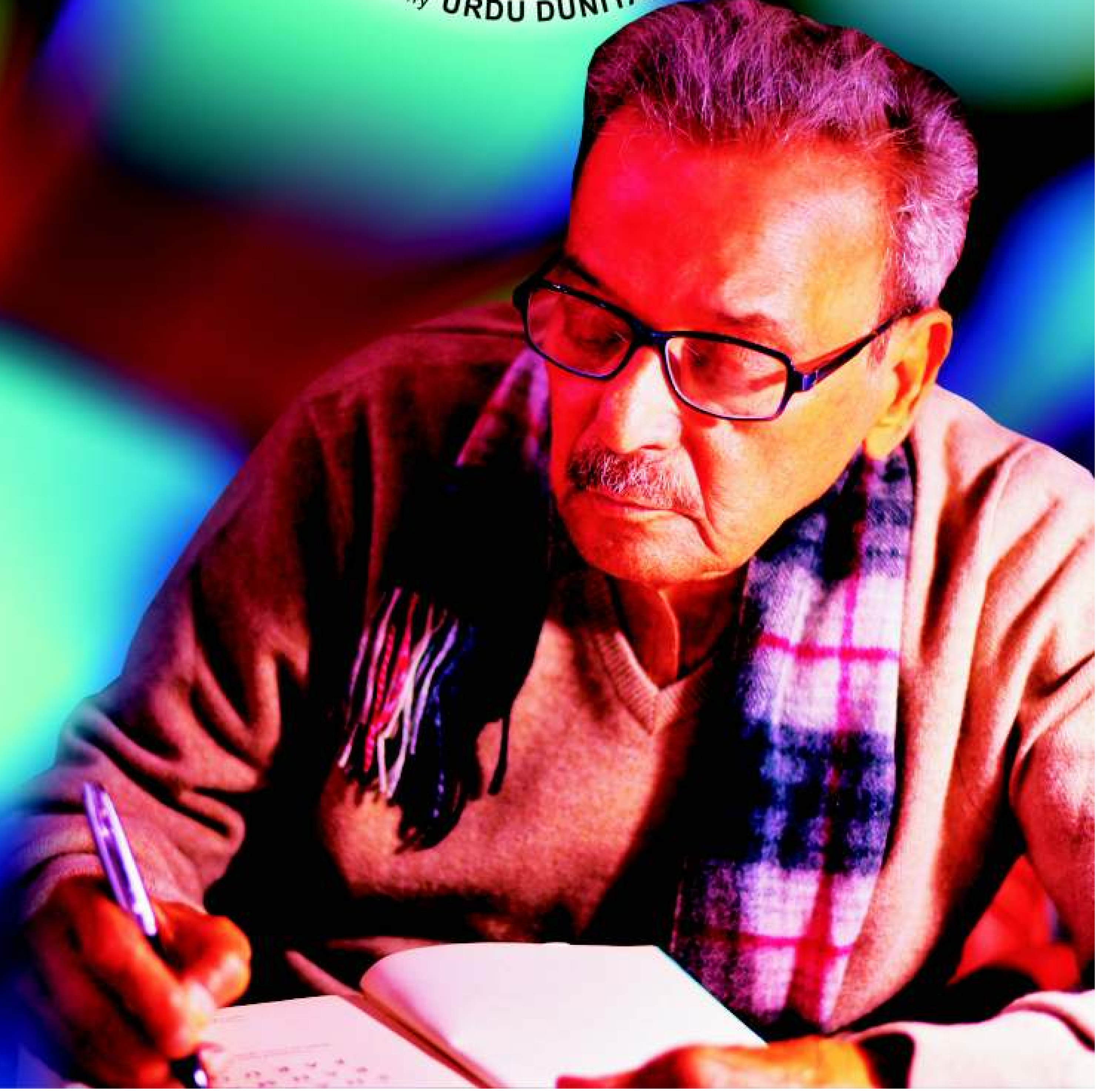

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ بچوں کی دنیا دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں

قسط وار ناول

دل چسپ کہانیاں

معلوماتی مضامین

ہنسنے ہنسانے کی باتیں

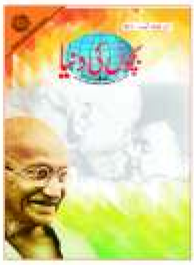

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

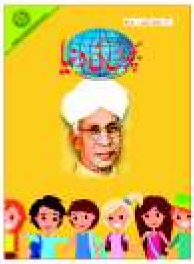

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ
اردو دنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:23،شمارہ:02،فروری 2021

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد
مشیر : حقانی القاسمی
معاونین: عبدالرشید اعظمی، یوسف رامپوری، نایاب حسن

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارتِ تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

مطبع:
ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002
فون: 040-24415194

اداریہ
ہماری بات 4

خطوط
آپ کی بات — قارئین کے خطوط 5

یادفاروقی
شمس الرحمٰن فاروقی — عظیم اقبال 10
شمس الرحمٰن فاروقی کا نظریہ 'ناول کی شعریات کے تناظر میں' — محمد اقبال لون 13
کئی چاند تھے سرآسماں — نورین علی حق 18
ناول 'قبض زماں' ایک ماحولیاتی قرأت — توصیف بریلوی 23

نقد و نگاہ
سید اکبر علی ترمذی کی غالب پسندی — صغیر افراہیم 26
بہار میں رثائی ادب — سلطان آزاد 29
اجتبیٰ رضوی بہ حیثیت نظم نگار — فرحت نادر رضوی 32

ناول 'میری یادوں کے چنار' — محمد محسن 36

خراج عقیدت
پروفیسر احمر لاری — غلام حسین 38
آہ ظفر احمد صدیقی — محمد اختر 43
حنیف ترین — محمد اسلام خان 45

نگر نگر اردو
بیجاپور کا شعر وادب آزادی کے بعد — محمد سمیع الدین 47

ماحولیات
ماحولیاتی سیاحت — ہلال احمد وار 51

شخصیات
کمال الدین کمال عظیم آبادی شخصیت اور شاعری — شاذیہ کمال 54

نذیر بنارسی کی شاعری میں عصری حسیت — جاوید احمد 57

سعادت علی صدیقی اردو زبان وادب کا خدمت گزار — محمد اویس سنبھلی 60

خصوصی گفتگو
محمد خلیل — عبدالحی 62

نیا آسماں نئے ستارے
اسلوبیات کی شعریات اور ادبی تنقید — محمد لطیف شاہ 64
حفیظ میرٹھی کی شعری کائنات — راحت علی صدیقی 67
حیات اللہ انصاری کے افسانوں کا انفرادو اختصاص — نذر الاسلام 69

کتابوں کی دنیا
تعارف وتبصرہ — ادارہ 72

خبرنامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 85

ہماری بات

گذشتہ ایک سال کے دوران درجنوں سے زائد اردو زبان و ادب کی عظیم شخصیات ہمارے درمیان سے رخصت ہوگئیں اور اپنے پیچھے ایسا خلا چھوڑ گئیں جس کا پُر ہونا مشکل ہی نہیں، ناممکن نظر آتا ہے۔ دنیائے اردو زبان و ادب کو الوداع کہنے والے ان اشخاص میں اہم دانشور بھی تھے، شعرا اور ناقد و محقق بھی اور فکشن نگار بھی۔ ان شخصیات کے انتقال سے قحط الرجال کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ یہ وہ شخصیتیں تھیں جن سے جہان شعر و ادب میں روشنی تھی اور جن پر ہماری زبان کو ناز بھی تھا۔ انھوں نے اردو زبان کو فکری، فنی اور لسانی اعتبار سے ثروت مند بنایا تھا اور اس زبان کے دائرے کو وسیع سے وسیع تر کرنے میں ان کا کردار بڑا اہم تھا۔

ادب کے ایسے آفتاب و ماہتاب کی وفات کے بعد یہ سوال فطری ہے کہ ان اسلاف و اکابر کی وراثت کا تحفظ کیسے کیا جائے؟ ان کے علمی اور ادبی اثاثے کو کیسے محفوظ رکھا جائے اور جس زبان سے ان کی وابستگی تھی اس زبان کے فروغ و تحفظ کے لیے کس طرح کے اقدامات کیے جائیں تاکہ وہ زبان زندہ رہے اور اس کا مستقبل بھی تابناک ہو۔ اس حوالے سے جہاں اردو کی تعلیم کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے وہیں اپنے بچوں کو اردو زبان سکھانا بھی بہت ضروری ہے۔ اس کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ اگر والدین اس کے لیے پرعزم اور مخلص ہوں تو دوسری زبانیں اور مضامین پڑھانے کے ساتھ وہ اپنے بچوں کو اردو سکھا سکتے ہیں۔ یہ نا تو کوئی ناممکن بات ہے اور نہ ہی کوئی پیچیدہ عمل۔ جن لوگوں کی زبان اردو یا ہندی ہے، وہ آسانی سے اردو پڑھ اور سیکھ سکتے ہیں۔ آگے چل کر انھیں میں سے کچھ بچے دوسرے شعبوں سے وابستہ رہتے ہوئے اپنے جذبات و احساسات کے اظہار کا وسیلہ اردو زبان کو بنائیں گے، کیونکہ اپنے جذبات و احساسات کا اظہار اپنی مادری زبان میں آسان اور موثر ہوتا ہے۔ پھر انھیں میں سے بعض شاعر بنیں گے، بعض فکشن نگار، بعض تنقید اور تحقیق کے میدان کو سر کریں گے، اس طرح جہاں اردو زبان کے افراد کی تعداد گھٹنے سے رک جائے گی، وہیں اردو کے ادیبوں اور شاعروں کی تعداد میں بھی کمی واقع نہ ہوگی۔

اردو والوں کو یہ بات ذہن نشیں رکھنی ہوگی کہ جب تک وہ اپنے درمیان افراد سازی کے عمل کو تیز نہیں کریں گے، اس وقت تک وہ اردو کے مرحوم بزرگ ادیبوں کے خلا کو پر نہیں کر سکتے بلکہ اپنی زبان کا تحفظ بھی ان کے لیے دشوار ہو جائے گا۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے بزرگ ادیبوں کی تصانیف کے ساتھ رشتہ جوڑیں اور ان کے افکار و خیالات کی وسیع پیمانے پر اشاعت کی کوشش کریں۔ اس سے اردو کو زندگی اور تابندگی ملے گی۔ ساتھ ہی ہمیں ان زندہ ادبی شخصیات کے بارے میں بھی اپنا رویہ تبدیل کرنا ہوگا جو اردو مشن سے جڑے ہوئے ہیں اور اس کے فروغ کے لیے نفع و نقصان کی پروا کیے بغیر کوشاں ہیں۔ ان کے ساتھ جو مسائل و مشکلات ہیں انھیں حل کرنے کی کوشش کرنی ہوگی۔ اس کے علاوہ ہمیں ان کی خدمات کا وقتاً فوقتاً اعتراف بھی کرنا چاہیے تاکہ انھیں کام کرنے کے لیے مزید حوصلہ اور تقویت مل سکے۔ خاص طور پر مراکز سے دور حاشیائی بستیوں میں جو محبان اردو نہایت خلوص کے ساتھ اردو زبان کی بے لوث خدمت کر رہے ہیں ان کی تحسین و ستائش بھی کرنی چاہیے اور ان کے جذبۂ خدمت کو سلام بھی کرنا چاہیے۔

اس شمارے میں کچھ اہم ادبی شخصیات پر تعزیتی تحریریں شامل کی گئی ہیں۔ کوشش تو یہ تھی کہ تمام مرحوم شخصیات پر مضامین کی شمولیت ہوتی مگر یہ ممکن نہ ہو سکا۔ آئندہ ان شاء اللہ بچھڑنے والی شخصیات کو خراج عقیدت پیش کیا جاتا رہے گا۔ شمس الرحمن فاروقی کے تعلق سے فوری طور پر جو مضامین موصول ہوئے انھیں اس شمارے میں شامل کیا گیا ہے۔ ان کے شایانِ شان ایک شمارہ آئندہ شائع کیا جائے گا۔ فاروقی صاحب نے اردو زبان کے لیے جو خدمات انجام دی ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ ان کے علمی و ادبی کارناموں پر تحقیقی اور تنقیدی کام پہلے بھی ہوتے رہے ہیں۔ ان کی وفات کے بعد یہ سلسلہ اور آگے بڑھے گا۔ حقیقت یہی ہے کہ شمس الرحمن فاروقی جیسی دیدہ ور شخصیت صدیوں میں پیدا ہوتی ہے۔ ان کا انتقال اردو زبان و ادب کا بہت بڑا نقصان ہے۔ ان کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے اسے پر کرنا ممکن نہیں ہے۔ مختلف جامعات، اکیڈمیوں اور اداروں نے ان کی وفات پر خراج عقیدت پیش کیا۔ ان کے معاصر پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنے تعزیتی بیان میں صحیح کہا ہے کہ 'فاروقی کے بغیر اردو ادب ادھورا ہے'۔

عقیل احمد

شیخ عقیل احمد

آپ کی بات

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں 'آپ کی بات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا قطعی مقصد نہیں ہوتا کہ محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکہ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے کہ ان میں مشمولہ مضامین کے تعلق سے نئے نکات، مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گذارش ہے کہ ماہنامہ 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان سے ہمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

آپ کی ادارت کے دوران ماہنامہ 'اردو دنیا' میں بعض خوشگوار تبدیلیوں کی وجہ سے اس کے معنوی حسن میں اضافہ ہوگیا ہے، مثلاً آپ نے انٹرویو کے لیے سوالنامہ تیار کرکے اس کا جواب دینے کے لیے غیرمعروف ادیبوں کو جو موقع عطا کیا ہے اور ان کی خدمات سے واقف ہونے کا قارئین کو جو وسیلہ بخشا ہے وہ قابل صدستائش ہے۔ حالیہ دسمبر 2020 کے شمارے میں سید نسیم سلطانہ نے اپنے انٹرویو کے ذریعے مقامی اور علاقائی زبانوں کے فروغ کا جو مشورہ دیا ہے اس کا استقبال کیا جانا چاہیے۔ آپ نے اپنے اداریے میں گھسے پٹے موضوعات سے ہٹ کر لکھنے اور معروف شخصیات پر تکراری مضامین سے احتراز کرنے کی جو تجویز پیش کی ہے وہ قابل عمل ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے دوسری زبانوں کے مسائل اور موضوعات پر بھی لکھنے کی ترغیب دی ہے وہ بھی دعوت فکروعمل ہے۔ مجموعی طور پر ماہنامہ 'اردو دنیا' اردو زبان وادب کا جام جہاں نما ہے۔

ڈاکٹر حیات افتخار: سابق ایسوسی ایٹ پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو، قائد ملت کالج میڈاوا کم چنئی (تمل ناڈو)

یہ رسالہ مسلسل 22 سال سے پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے، اس ادارے سے بچوں کی دنیا، خواتین دنیا اور سہ ماہی 'فکر و تحقیق' بھی شائع ہوتے ہیں۔ فکر و تحقیق کو چھوڑ کر تمام رسالے ملٹی کلر آرٹ پیپر پر شائع ہوتے ہیں۔ ہماری بات کے تحت اداریے میں مدیر نے بڑی اچھی بات کہی ہے "اردو زبان کا دائرہ بہت کشادہ ہے مگر اس کی موضوعاتی زمین تنگ ہوتی جارہی ہے۔" بالکل سچ کہا ہے اور ہمیں اس کو وسعت دینی چاہیے۔

آپ کی بات میں صرف تفصیلی ایک خط ہے جو ڈھائی صفحات کا ہے جو ڈاکٹر کرشن بھاوک کا تحریر کردہ ہے۔ پہلی تخلیق پہلا تاثر میں ایک خط ہے۔ زبان اور زمینی صورت حال کے تحت سوال نامہ برائے انٹرویو میں اس بار سیدہ نسیم سلطانہ نے سوالوں کے بھرپور جوابات دیے ہیں۔ تعلیم و ترسیل کے تحت ڈیجیٹل لٹریسی (ف س اعجاز) اور اسی میں دوسرا مضمون خودانحصاری کا مہاتما گاندھی ماڈل اور نئی قومی تعلیمی پالیسی 2020 (وجیتا پرویز) خوب ہے۔ نقد و نگاہ کے تحت ادب میں اخلاقی اقدار کا تقاضا (محمد کلیم ضیا)، جدید میتھلی اور ہندی قطب نما بابا ناگارجن (مشتاق احمد)، مظہر امام کی نظمیں (شہاب ظفر اعظمی)، پیسہ اور پرچھائیاں کے ڈراموں میں المناک تصویر (سرفراز جاوید)، اردو نصاب ہندوستان کے مدرسوں میں (محمد توقیر عالم راہی) جملہ پانچ مضامین ہیں تمام مضامین معلوماتی اور تحقیقی ہیں۔ چراغ دل کے تحت مدیر شیخ عقیل احمد کا 'اروند گھوش ہندوستانی روحانیت کی مسیحا' جامعیت اور ہمہ گیریت لیے ہوئے ہے۔ انھوں نے اس روحانی مسیحا کی تحریروں کا جائزہ لیا۔

ماہ دسمبر میں غالب کا یوم پیدائش کے موقعے پر جہان غالب کے تحت غالب کی عظمت (نسرین بیگم)، اس شکل سے گزری غالب حقائق اساس ڈرامہ (پرویز شہریار) اور غالب تاریخ کے دوراہے پر (ثاقب عمران) کے مضامین غالب کو خراج عقیدت کے طور پر مکمل نمائندگی ہے۔ اس کے بعد یاد مظفر حنفی کے تحت مظفر حنفی پر تین مضامین بطور خراج کے پیش کیے گئے ہیں جن میں پہلا مضمون مظفر حنفی یادیں باتیں (مناظر عاشق ہرگانوی) کا ہے۔ دوسرا آہ مظفر حنفی (پی پی سریواستو رند) کا ہے۔ اور تیسرا مظفر حنفی کی شاعری میں جدید حسیت محسن جلگانوی کا ہے۔ اس رسالے کی ایک خوبی یہ ہے کہ کم عرصے میں مضامین جمع کرتا ہے اور شائع کرکے بھرپور خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔ ادبیات فارسی کے تحت سیمیں دانشور (مہدیہ نژادشیخ)، ناول ہمسایہ ہا (نگار) اور ہندوستان میں فارسی لغت نگاری ایک تعارف (قمر حیدر) کے مضامین ہیں جو فارسی ادب کی ترجمانی کرتے ہیں۔ شخصیات کے تحت رشید اختر ندوی اور ان کی ناول نگاری (محمد جلیل اختر جلیلی ندوی)، جگر اور ان کی عشقیہ شاعری (ندیم احمد)، راحت اندوری منفرد لہجے کا شاعر (محمد نوشاد عالم) شامل ہیں۔

راحت کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے۔

میرے احباب کو جس وقت بھی فرصت ہوگی
اور تو کچھ نہیں ہوگا میری غیبت ہوگی

شخصیات کے بعد نیا آسمان نئے ستارے کے تحت عابد پشاوری کی غزل گوئی (محمد رفیع) مختصر مگر جامع مضمون ہے۔ عابد کا یہ شعر دیکھیے۔

ایک ایک شعر حاصل صد تجربات ہے
میں جو بھی کہہ رہا ہوں میرے دل کی بات ہے

اس کے بعد کمپیوٹر کے تحت 'ورک شیٹ کو سجانا اور پھر کتابوں کی دنیا میں تعارف و تبصرہ کے تحت دس کتابوں پر تبصرے شامل ہیں۔ آخری صفحات پر خبر نامہ قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں، اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں شامل ہیں۔ قارئین کے لیے آپ کی بات، پہلی تخلیق پہلا تاثر، سوال نامہ برائے انٹرویو اور نیا سلسلہ جن کتابوں نے متاثر کیا ہے۔ مجموعی اعتبار سے یہ رسالہ تمام پروفیسروں، ریسرچ اسکالروں کے ساتھ قارئین کے لیے ہر طرح کا مواد لیے ہوئے ہے جس کے لیے ادارہ و مدیر قابل مبارکباد ہیں۔ 100 صفحات کا ملٹی کلر آرٹ پیپر پر شائع یہ رسالہ صرف 15 روپے میں حاصل کیا جا سکتا ہے۔

م۔ق۔سلیم حیدرآباد

(بہ شکریہ، صحافی دکن، حیدرآباد)

دسمبر 2020 کا اردو دنیا کا شمارہ بروقت ہمدست ہوا۔ سرورق پر رحلت کر جانے والے ادیبوں، شعرا کی تصاویر دی گئی ہیں یقیناً لفظ ان کے ہونے کی گواہی دیں گے۔ اداریہ ہماری بات میں اردو زبان کے تحقیقی موضوعات اور اس کی وسعت، جدت، ندرت پر گفتگو کی گئی ہے جس کی آج بہت ضرورت ہے۔ مدیر صاحب سچ کہتے ہیں کہ اردو ادب میں نئی جہات کی تلاش ان پر تحقیق ناگزیر ہے نئی نسل میں تحقیق سے دلچسپی کم ہوتی جارہی ہے۔ سندی تحقیق میں موضوع کی تکرار ہورہی ہے۔ جامعات کے سربراہوں کا ایک دوسرے سے ربط و تال میل ہونا چاہیے۔ سیدہ نسیم سلطانہ نے مقامی اور علاقائی زبانوں کے فروغ کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔ اپنے انٹرویو میں لکھا ہے کہ مادری زبان اردو سے محبت اولاد کی طرح کرنا چاہیے۔ ف س اعجاز نے درست لکھا ہے کہ اب خط لکھنا ختم ہورہا ہے۔ مکتوب نگاری ڈیجیٹل لٹریسی کی وجہ سے ختم ہوتی جارہی ہے۔ اس پر اہل دانش غور و فکر کریں۔ وجیتا پرویز نے اپنے مضمون 2020 نئی قومی تعلیمی پالیسی کے خد و خال کو واضح کیا ہے اور محمد کلیم ضیا نے ادب میں اخلاقی اقدار کا تقاضا میں اخلاق کی تعریف بہت خوب کی ہے اور قسموں پر گفتگو کی ہے۔ مشتاق احمد نے جدید میتھلی اور ہندی کا قطب نما بابا ناگارجن کے فکر و فن پر اچھا لکھا ہے۔ یہ معلوماتی مضمون ہے۔ شہاب ظفر اعظمی نے مظہر امام کی نظمیں حقیقت اور رومان کا آمیزہ بہت عمدہ ہے۔ سرفراز جاوید نے پیسہ اور پرچھائیں کے ڈراموں میں المناک تصویر ڈاکٹر محمد حسن کا تجزیہ پیش کیا ہے لیکن تعارف میں ان کا ایک ڈراما ضحاک کا بیان ندارد ہے۔ محمد توقیر عالم راہی نے 'اردو نصاب ہندوستان کے مدرسوں میں' پر گفتگو کی ہے۔ مدیر نے اروند گھوش ہندوستانی روحانیت کا مسیحا میں ان کی روحانیت اور انسانیت پر رقم کیا ہے۔ غالب پر تین مضامین لکھے گئے ہیں غالب کی عظمت میں شعری حوالوں سے ان کی عظمت، فکر و فن پر اظہار ملتا ہے تو غالب جیسا شاعر اب تک اردو ادب میں ناپید ہے۔

مظفر حنفی کے تعلق سے تین مضامین ہیں: یہ بھی اردو زبان و ادب کا بڑا اور وقیع وارفع نام ہے۔ انھوں نے اردو شاعری، تنقید، تخلیق کو نیا موڑ دیا اور شعری فن کو اعلیٰ درجے تک پہنچایا۔ جگر اور ان کی عشقیہ شاعری میں جگر کے کلام کی خصوصیات کا ذکر ہے۔ راحت اندوری منفرد لہجے کا شاعر میں ان کی زندگی، فکر و فن پر بات کی گئی ہے۔ راحت بھائی کے یہاں ترسیلی خوبیاں ہیں۔ اس 100 صفحات کے شمارے میں اردو زبان و ادب کے تعلق سے بہت معلوماتی مضامین ہیں۔ نئی نسل کے لیے تنقید، تحقیق، تخلیق کے مبادیاتی اصول پر مضامین شائع کریں تو معلومات میں اضافہ ہوگا۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی: مکان نمبر 335-7-17، برہمن واڑی، یاقوت پورہ، حیدرآباد، تلنگانہ

'اردو دنیا' دسمبر 2020 وصول ہوا۔ یہ بات برحق ہے کہ اکثر لکھنے والے معروف (یا پھر غیر معروف) ادبا پر جب بھی قلم اٹھاتے ہیں تو واقعی تان 'حیات و کارناموں' پر ہی ٹوٹتی ہے۔ اگر اچھا ادیب ہے تو ہر لحاظ سے قابل تعریف ہے۔ متوازن تنقید سے اکثر تنقید نگار غیر محسوس طریقے سے بُعد اختیار کرتے جارہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ تنقید کے لیے تحقیق اور اس پر بھی غور و فکر کی ضرورت ہے لیکن فرصت کہاں۔ سہولتیں بجائے محنت کے تن آسانیوں سے بدلتی جارہی ہیں۔ اس منفی صورت حال پر ٹھنڈے دل سے غور اور اسے مثبت افادی امور سے بدلنے کی ضرورت ہے۔ یہی نتیجہ اس ادارتی سطور سے اخذ کیا جاسکتا ہے۔

اس شمارے میں کوئی چودہ شہ سرخیاں اور ان کے ذیل میں کوئی دو درجن ذیلی سرخیاں قائم کی گئی ہیں۔ زبان اور ذہنی صورت حال کے ذیل میں 'مقامی اور علاقائی زبانوں کا فروغ' (ص 8 تا ص 11) یہ بیانیہ دراصل اُردو کونسل کے فراہم کردہ سوالنامے پر مبنی ہے جس میں دیا گیا ادبی استفسار کوئی 25 سوالات پر مشتمل ہے جب کہ زیر نظر مواد سوال نمبر 19 کے جواب میں مرقوم ہے (تین سوالات کے جوابات حذف ہوگئے) لیکن اس بارے میں جو مشورہ دیا گیا ہے وہ قابل غور، قابل عمل اور قابل قدر ہیں۔ 'تعلیم و ترسیل' (ص 12 تا ص 10) کے ذیل میں شامل مضمون بعنوان 'خود انحصاری کا مہاتما گاندھی ماڈل اور نئی قومی تعلیمی پالیسی 2020' (ص 15) جس میں خود انحصاری کی یہ اصطلاح غالباً خود مکتفی کے بجائے وضع کی گئی ہے۔ یہ مصنف کے مطابق اس منصوبے کو مہاتما گاندھی نے اپنی کتاب 'انڈیا مائی ڈریم' میں پیش کیا تھا۔ اس منصوبے کو پوری طرح بروئے کار لانے کے لیے کئی تعلیمی کمیشن قائم کیے گئے تھے۔ اسی تسلسل میں اس منصوبے کو قومی پالیسی 2020 میں مزید ترقی دینے کی سعی کی جارہی ہے۔ اس میں مساوات، سب کی شمولیت اور پیشہ ورانہ تعلیم سے متعلق نقطۂ نظر، مادری زبان کی اہمیت وغیرہ جیسے اہم ذیلی منصوبے بھی شامل کیے گئے ہیں۔ ص 16 پر دی گئی تصویر میں تختۂ سیاہ کی عبارت اردو میں ہوتی تو مزہ اور بھی آجاتا اور دیے گئے میقنات پر یقین بھی۔ 'نقد و نگاہ' (ص 19 تا ص 33) میں کوئی پانچ مضامین درج ہیں۔ ان میں ایک مضمون 'اُردو نصاب ہندوستان کے مدرسوں میں' (ص 32) کے ذیل میں کسی اچھے نصاب کے چار ارکان گنائے گئے ہیں۔ یہ اصولی بھی ہیں، مشورے بھی اور متوقع بھی۔ 'چراغ دل' (ص 34 تا ص 37) کے تحت مہرشی اروند گھوش پر بڑا روح پرور مقالہ شامل ہے جو ہر طرح سے لائق مطالعہ ہے۔ خصوصاً ان طلبہ اور اساتذہ کے لیے جو یوگا کے عملی پہلوؤں اور فلسفے سے دلچسپی اور تعلق رکھتے ہوں۔

'جہانِ غالب' (ص 38 تا ص 46) میں تین مضامین ہیں جو اس لحاظ سے اہمیت رکھتے ہیں کہ ان سے دی گئی معلومات کا آموختہ ہوجاتا ہے۔ 'یادِ مظفر' (ص 47 تا ص 54) میں تین اچھے اچھے مضامین شامل ہیں جو اُن کی حیات، کلام و کارناموں کا احاطہ کرتے ہیں۔ 'ادبیاتِ فارسی' (ص 55 تا ص 62) میں تین عمدہ مضامین ہیں۔ ان میں

'ہندوستان میں فارسی لغت نگاری' (ص 60) نہ صرف پُر مغز اور پڑھنے کے لائق ہے، بلکہ قابل صد ستائش ہے۔ 'شخصیات' (ص 63 تا ص 74) میں تین مقالے شامل ہیں۔ مقالہ بعنوان 'جگر اور اُن کی عشقیہ شاعری' (ص 67) پر بڑا ہی عمدہ مضمون تحریر کیا گیا ہے۔ اسے ذرا تفصیل سے لکھا جاتا تو تشنگی باقی نہ رہتی۔ 'نیا آسمان نئے ستارے' (ص 71-72) کے تحت عابد پشاوری جن کا اصلی نام شیام لال کالڑا تھا، کی غزل گوئی پر بحث کی گئی ہے۔ ان کی شاعری میں میر تقی میر کی جھلک پائی جاتی ہے۔ نہایت سہل اور آسان لفظوں میں نیا پن اور ستھرا پن ہے۔ اس کے بعد کا عنوان 'کمپیوٹر' (ص 73-74) بڑا ہی اچھا ہے مگر تکنیکی مضمون 'ورک شیٹ کو سجانا' ان ہی دو صفحات پر سجایا گیا ہے۔ 'کتابوں کی دنیا' (ص 75 تا ص 86) میں تبصرہ و تعارف کے تحت کونسل کی تین کتابوں اور باقی سات کتابوں پر تبصرے لکھے گئے ہیں۔ مطالعے کے بعد آپ کو اپنی پسند کی کتب کے انتخاب میں آسانی رہے گی۔ دھیان رہے کہ قومی اُردو کونسل کی کتابیں آپ کو ہر اعتبار سے معیاری محسوس ہوں گی، پھر بھی قیمت برائے نام۔ 'خبر نامہ' (ص 87 تا 98) کے ذیل میں قومی اُردو کونسل کی سرگرمیاں درج ہیں۔ پڑھ لیجیے۔ دنیا بھر کی خبریں پڑھ کر طبیعت بحال ہو جائے گی۔ سبھی کچھ حاضر ہے۔ مزید کیا درکار ہے؟

✤ **مصطفی ندیم خاں غوری**: بی 11، گرین ویلی، روضہ باغ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

ماہنامہ 'اردو دنیا' نومبر 2020 کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ بعد از مطالعہ اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مجھے 'آپ کی بات' کے تحت 'ادب اطفال' کے گوشے پر اپنے دلی جذبات اور خیالات کا اظہار کرنا نہایت ضروری ہے۔ سرورق پر 'ادب اطفال' ماضی اور حال' کی مہر ثبت ہے اور 'ادب اطفال' فن اور فنکار' کے تحت کل 9 مضامین کی شمولیت ہے۔ ان مضامین کے عنوانات ملاحظہ فرمائیں۔

(1) موجودہ عہد کے بچوں کا ادب (2) بچوں کے رسائل اور موجودہ صورت حال (3) اردو میں بچوں کا تحریر کردہ ادب (4) جنوبی ہند میں بچوں کی نظمیں (5) بچوں کے شاعر محمد اقبال (6) مرتضیٰ ساحل تسلیمی (7) گجرات میں ادب اطفال کے شاعر و ادیب (8) رسالہ نور کی خدمات (9) ادب اطفال اور بچوں کی نفسیات

جہاں تک میں سمجھتا ہوں ادب اطفال کا یہ گوشہ 'ادب اطفال' ماضی اور حال' کی عکاسی نہیں کرتا ہے میں اسے صرف نمائندگی کہوں گا۔ جہاں تک ادب اطفال ماضی اور حال کا تعلق ہے مہاراشٹر، مدھیہ پردیش، لکھنؤ، بہار، دہلی اور کرناٹک کا بھی اہم کردار رہا ہے اور آج جہاں اردو زبان اور ادب اطفال کی خدمات کی جارہی ہیں اور اردو زبان کے ادیب الاطفال بھی بے شمار ہیں۔ بچوں کے لیے ادب لکھا جارہا ہے۔ مہاراشٹر میں ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ اردو ذریعہ تعلیم کے اسکول اور کالجز بڑی تعداد میں ہیں جن میں ممبئی، مالیگاؤں، بھیونڈی، دھولیہ، اورنگ آباد، ناگپور، پونا، امراوتی، پربھنی، ناندیڑ، آکول، اچل پور وغیرہ شہر تعلیم کے مراکز ہیں۔ اردو تعلیم حاصل کرنے والے بچے بھی زیادہ ہیں۔ گل بوٹے (ممبئی)، مالیگاؤں سے (گلشن اطفال)، اور خیر اندیش، الفاظ ہند، جنت کے پھول اور بچوں کے ماہنامے جاری ہیں اور اخبارات میں بچوں کے لیے ہفتہ واری گوشہ بھی مختص ہوتا ہے۔ دوسرے قومی کونسل کا بچوں کا ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' کے پڑھنے والے بچے اور بڑے اور خرید و فروخت، ریاست مہاراشٹر میں زیادہ ہوتی ہے۔ قومی کونسل کے پاس اس کا ریکارڈ ہے۔

2 دوسرے مہاراشٹر کے اردو زبان کے ادیب الاطفال کا ذکر کریں، میرے علاقائی سطح کے پروجیکٹ کے مطابق صاحب تصنیف شعرا و ادبا کی خدمات قابل ستائش ہیں۔

3 حال ہی میں میری تصنیف بنام 'ادب اطفال کے درخشاں ستارے' مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کے مالی تعاون سے منظر عام پر آئی ہے۔ اس میں ان کی حیات اور ادب اطفال کی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔ تقریباً 73 شعرا و ادبا کا جائزہ پیش کیا ہوں۔ عمر کی 73 ویں دہلیز پر ہوں، لاک ڈاؤن اور کورونا کے دوران اسے مکمل کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر سروشہ نسرین قاضی ناگپور 'ادب اطفال کے درخشاں ستارے' ایک تاریخ ساز قدم ہے اور ایک سنگ میل کی حیثیت کی حامل کتاب ہے۔ ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین صاحب نے ادب اطفال کے بین الاقوامی ویبنار میں ادب اطفال کی جانب توجہ دلائی۔ بچوں کے شاعروں اور ادیبوں کی خدمات کا اعتراف کرنے کے بارے میں زور دیا۔

آخر میں میرا یہ مشورہ رہے گا کہ قومی کونسل کوئی خصوصی گوشہ منظر عام پر لانے سے قبل 'ماہنامہ' میں اعلان کرے۔ مضامین کی آمد کے بعد انتخاب کرکے شائع کریں۔ شاعروں اور ادیبوں کے مضامین کے ساتھ ان کے موبائل نمبر پتے کے ساتھ تحریر فرمائیں تاکہ ان سے رابطہ کرنے میں آسانی ہو۔

✤ **ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان**: روبرو مولانا آزاد کالج ٹیچنگ کالونی، پلاٹ نمبر 34، اورنگ آباد، مہاراشٹر

ماہ دسمبر 2020 کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ سال رواں کا یہ آخری شمارہ بھی حسب سابق نہایت معلومات افزا نیز ادبی و جمالیاتی ذوق کی تسکین فراہم کرنے والا ثابت ہوا۔ حیرت ہے کہ لاک ڈاؤن کی بندشوں کے باوجود آپ نے اردو دنیا کے مزاج و معیار کو متاثر نہیں ہونے دیا۔ اردو بیزاری کے اس ماحول میں ایک مکمل میگزین پیش کرنے کی سعی لائق صد ستائش و تحسین ہے۔ زیر نظر شمارے میں مرحوم مظفر حنفی پر مختصر گوشہ شامل اشاعت کرکے جو خراج پیش کیا گیا ہے اس کی داد نہ دینا ادبی بد دیانتی ہوگی۔ ویسے تو تمام ہی مضامین معیاری ہیں اور لائق مطالعہ ہیں۔ بطور خاص جناب محسن جلگانوی کا مضمون مرحوم کی ادبی خدمات کا محض اعتراف نہیں ہے بلکہ مرحوم کے فنی محاسن کو بھی ضیا بار کرتا ہے۔

✤ **معین الدین عثمانی**: 264، شاہو نگر، جلگاؤں، مہاراشٹر

جنوری ماہ کے شمارے کے اداریے میں اس بار آپ نے نئے سال کے آغاز میں اردو زبان کو ایک تہذیب کا درجہ عطا کرنے کے علاوہ اس کی فطرت میں جارحیت کی بجائے جمہوریت کے ساتھ ہی شگفتگی و شیرینی کی علامات ہونے کی صحیح نقشہ کشی کی ہے۔

پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ پر مبنی ڈاکٹر محمد عرفان ملک کا مضمون قابل مدح ہے۔ یہ اردو زبان کے متعدد طلبا و اساتذہ کے لیے بے حد مفید مواد فراہم کرنے والا ہے۔

شہرۂ آفاق فلمی شاعر جناب حسرت جے پوری کی غزل گوئی پر نذیر فتح پوری کا

مضمون بھی عرق ریزی کا ثبوت دیتا ہے۔اس خاکسار کا یہ ذاتی اندازہ ہے کہ مولانا حسرت موہانی کے مرغوب تخلص سے راغب ہوکر ہی موصوف نے 'حسرت تخلص اختیار کیا ہوگا، حالانکہ اس کا کوئی مستند ثبوت نہیں ہے۔ یہ نئی واقفیت ہے کہ حسرت جے پوری نے مزاحیہ اداکار جانی واکر کی مانند کبھی بسوں میں ایک کنڈکٹر کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ص 20 پر محولہ قنوطیت آمیز یہ شعر ہے۔

''وہ بے کسی ہے، یہاں کون گھر پہ آتا ہے،ہوا کا جھونکا ہے دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔''

جناب احمد ندیم قاسمی کا یہ شعر اس شعر کا محرک جان پڑتا ہے:۔''انداز ہو بہو تیری آواز پا کا تھا،دیکھا نکل کے گھر سے تو جھونکا ہوا کا تھا۔'' اردو شاعری میں موضوع و اسلوب کے نظریے و توارد کی بنیاد پر اگرچہ چند مضمون بھی شائع ہو چکے ہیں، تاہم مستند اشعار سے مزین ایک ضخیم کتاب کی اشاعت دورِ حاضر کا ایک فوری تقاضا ہے۔

جناب عبدالحفیظ کا مقالہ اول دور کی شاعری میں 'حب الوطنی' کی نشان زدگی کرنے والا ہے۔اگرچہ 'حب الوطنی' اسم مؤنث لفظ اردو زبان میں کثرت سے استعمال ہو چکا ہے، تاہم اس ناچیز کی دانست میں صحیح املا والا لفظ ہے 'حب الوطن'، نہ کہ 'حب الوطنی'۔(مضمون کی سرخی اور ص 24)۔اس بلند پایہ مضمون میں اشعار موضوع کے ساتھ انصاف کرتے ہیں، تاہم کسی نامعلوم شاعر کا سنہ 1947 میں ہند کی زمین کی سیاسی و مذہبی نصب العین کی بنا پر کی گئی دردناک تقسیم پر طنزیہ ردِعمل کرنے کے باعث یہ ایک شعر بھی لائق حوالہ ہے۔

گل و گلشن جدا جدا پر باغباں تو ایک ہے
چاہے زمین بانٹ لو، پر آسماں تو ایک ہے

محترمہ عطیہ حسین کے انگریزی ناول: پرمبنی ڈاکٹر محبوب حسن کا مقالہ نہایت تحقیقی نوعیت کا ہے اور اسی طرح کے انگریزی اور دیگر زبانوں کے شہرۂ آفاق ناولوں اور افسانوں سے وابستہ ایسے ہی پر مغز مقالے شائع کیے جاتے رہیں،تب یہ جریدے کی عظمت کو دوآتشہ کریں گے۔

❖ **ڈاکٹر کرشن بھاوک** : کوٹھی نمبر A-201، گورونانک نگر گلی نمبر K-18-A-201، پٹیالہ (پنجاب)

پہلی تخلیق پہلا تاثر

جب کوئی جوہری ہیرے کو تراش کر شاہکار بناتا ہے۔تو اس کی خواہش ہوا کرتی ہے کہ لوگ اسے دیکھیں اور قدردانِ ہنر کی جانب سے اس کی محنت کی داد ملے۔ اس کے فن کی تعریف ہو۔ظاہری بات ہے کہ اس کے لیے کسی ذریعے کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔اسی طرح ایک قلم کار جب اپنے خیالات اور جذبات و مشاہدات صفحۂ قرطاس پر آراستہ کرتا ہے تو اس کی بھی یہی خواہش ہوا کرتی ہے کہ اس کے رشحاتِ قلم لوگوں کے سامنے آئیں اور قدردانِ علم وادب اس کی محنت وصلاحیت کی داد دیں۔

راقم الحروف بھی ایک خادم ادب کی حیثیت سے اپنے دل میں ایسے ہی خیالات کا امین رہا ہے۔اس کی بھی دیرینہ خواہش تھی کہ اس کی محنت و کاوش کو خراج تحسین سے نوازا جائے۔اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر بے پایاں کہ مسرت و شادمانی کے لا تعداد گلہائے معطر اس کے دامن تصور میں اس وقت مہک اٹھے جب اس کی پہلی تخلیق ''اردو طباعت کا سفر'' عالمی شہرت یافتہ اردو کے مشہور ترین مجلّے 'اردو دنیا' کے جولائی 2006 کے شمارے میں زینتِ قرطاس ہوئی۔اس مضمون کی اشاعت سے جہاں بے پناہ مسرت وشادمانی کا احساس ہوا وہیں مستقبل کے لیے بے شمار منصوبے ذہن و دل میں پناہ گزیں ہو گئے۔ جو آج متعدد تصانیف کی شکل میں زیور طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں۔اور قدردانِ علم وادب سے داد و تحسین حاصل کرنے کے ساتھ ہی مؤقر علمی وادبی اداروں کی جانب سے اعزاز و اکرام سے بھی نوازے جاتے رہے ہیں۔

سچ ہے حسن تبھی حسن ہے جب اسے دیکھنے والی آنکھ ہو۔فن تبھی فن ہے جب اس کو داد دینے والے قدردان ہوں۔ وہی فن پارے شاہ کار بن پاتے ہیں جن کو سراہنے والے ہوں۔اور یہ تبھی ممکن ہے کہ جب انھیں جلوہ نما کرنے کے وسائل موجود ہوں۔کوئی ظاہر و آشکار کرنے والا ہو۔ایک تخلیق کار کے لیے رسائل ومجلات ان ہی وسائل کا مقام رکھتے ہیں جو تخلیق کو سیج قرطاس پر سجا کر عروس ادب بنانے میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ رسائل ہی تو ہیں جنھوں نے ابتدا میں غیر معروف قلم کاروں کی حیثیت رکھنے والوں کی تحریریں زیورطباعت سے مزین کرکے ان کو رشید احمد صدیقی، رتن ناتھ سرشار، شبلی نعمانی، انتظار حسین، عبدالحلیم شرر، قرۃ العین حیدر اور عصمت چغتائی جیسے عظیم ادبا کی شکل میں شناخت عطا کی۔اور علمی دنیا میں ان کو متعارف کرایا۔

واقعی اگر یہ رسائل نہ ہوتے، تو نہ جانے کتنی تخلیقات گوشۂ گمنامی میں روپوش ہو جاتیں اور کتنے ہی قلم کار عدم پذیرائی کی بنا پر ادب سے راہِ فرار اختیار کر گئے ہوتے۔

❖ **رضاء الرحمن عاکف سنبھلی**: میاں سرائے سنبھل یوپی

■

پہلی تخلیق پہلا تاثر

کسی بھی رسالے میں جب آپ کی تخلیق شائع ہوتی ہے تو آپ کو بے انتہا مسرت کے ساتھ ایک نئی تحریک بھی ملتی ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' میں جب آپ کی تخلیق پہلی بار شائع ہوئی تو آپ کو کیسا محسوس ہوا؟ آپ اپنے خیالات لکھ کر ہمیں بھیجیں اور یہ بھی ضرور لکھیں کہ آپ کی ذہنی اور تحریری تربیت میں ادبی رسائل کتنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ذرا سوچیے !اگر یہ رسالے نہ ہوتے تو...؟

قلمکاروں سے چند معروضات

ماہنامہ'اردو دنیا' علمی اور ادبی مجلہ ہے جس میں ادبیات، سماجیات، اقتصادیات، تہذیب وثقافت، تعلیم وتدریس، زبان ولسانیات، سائنس وٹکنالوجی، طب وفلسفہ، فنونِ لطیفہ، نفسیات، زبان کی زمینی صورت حال، عالمی ادبیات اور دیگر موضوعات پر مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ یہ خالص علمی اور ادبی نوعیت کا رسالہ ہے۔ اس میں مذہبی مباحث اور متنازعہ فیہ مسائل پر مضامین کی اشاعت کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ رسالہ صرف 100 صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس رسالے میں پوری اردو دنیا کے دانشوروں، ادیبوں اور قلمکاروں کی تحریریں اشاعت کے لیے موصول ہوتی ہیں۔ بہت سے مضامین اشاعت کے لیے منظور کر لیے جاتے ہیں لیکن بہت سی تحریریں اشاعت سے محروم رہ جاتی ہیں۔ بہ کثرت مضامین موصول ہونے کی وجہ سے ادارے کو بہت سی دقتوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے قلمکاروں سے گذارش ہے کہ اپنی تحریریں بھیجتے وقت مندرجہ ذیل امور کا بطورِ خاص لحاظ رکھیں۔

- مضمون غیر مطبوعہ ہو۔ کسی اخبار/ مجلے میں ارسال نہ کیا گیا ہو اور نہ ہی اپنی یا کسی مرتب کردہ کتاب میں شامل ہو۔
- مضمون ادارے کے مزاج، معیار اور پالیسی کے منافی نہ ہو۔
- مضمون ان پیج پروگرام میں ہو اور 2500 (پچیس سو) الفاظ سے کم اور 4000 الفاظ سے زیادہ نہ ہو۔
- مضمون میں اعداد وشمار رومن میں لکھیں اور مضمون کے آخر میں حوالے/ حواشی (کتب اور مضامین) کا اندراج ضرور کریں۔
- اچھوتے، نئے اور اہم موضوعات پر بھیجے ہوئے مضامین ترجیحی طور پر شائع کیے جائیں گے اور عمومی نوعیت کے مضامین کی اشاعت موصول ہونے کی ترتیب کے لحاظ سے کی جائے گی۔
- ایسے موضوعات یا شخصیات پر مضامین کی اشاعت ممکن نہیں جن پر بہ کثرت کتابیں یا مقالے شائع ہو چکے ہوں۔ ایسے موضوعات/شخصیات پر مضامین بھیجتے وقت چند سطروں میں نئے نکات اور نئے زاویے کی نشاندہی لازمی ہوگی۔
- جن مضامین میں زبان و بیان کی خامیاں اور حقائق، حوالے املا جملہ کی غلطیاں ہوں گی انھیں کسی بھی صورت میں اشاعت کے لیے منظور نہیں کیا جائے گا۔
- مضمون میں اشعار اور اقتباس کی صحت کا التزام اور ضرورت سے زیادہ اشعار اور اقتباسات سے پرہیز لازمی ہے۔
- شخصیات پر مضمون بھیجتے وقت متعلقہ فنکار کی تصویریں، کتابوں کا عکس اور دیگر ضروری معلومات ضرور ارسال کریں۔
- شہر یا ادارے پر لکھتے ہوئے اس سے متعلق تصاویر اور دیگر اہم معلومات لازمی بھیجیں۔
- درج ذیل تصدیق نامہ موصول ہوئے بغیر مضمون کی اشاعت پر غور نہیں کیا جائے گا:

''میرا مضمون غیر مطبوعہ ہے۔ کسی اخبار/ مجلہ/ اپنی یا مرتب کردہ کتاب میں شامل نہیں ہے۔ یہ کسی کتاب/ مضمون کا سرقہ یا چربہ نہیں ہے۔ اگر کچھ نقص پایا گیا تو اس کے لیے میں خود ذمہ دار ہوں گا/ ہوں گی۔''

- کسی دوسری زبان کا ترجمہ اصل متن کے ساتھ ارسال کریں اور مصنف کا اجازت نامہ بھی منسلک کریں۔
- مضمون میں پہلے یا آخری صفحے پر مضمون نگار کا نام، مکمل پتہ مع پن کوڈ (انگلش میں) اور موبائل نمبر ضروری ہے۔

مضمون کی حتمی منظوری ایڈیٹوریل ریویو کے بعد ہی دی جائے گی۔

قلمکار حضرات اخلاقی ضوابط Ethical guidelines کا پورا خیال رکھیں۔

—ادارہ

عظیم اقبال

شمس الرحمن فاروقی

روبرو: ان سے صرف ایک ملاقات میرے حصے میں آئی تھی، جو میرے لیے یادگار بن گئی۔ واقعہ 11 مارچ 1981 کا ہے، جب بہار اردو اکادمی کے لکچر، سمینار اور مشاعرے کا انعقاد ہوا تھا۔ 9,10,11,12 مارچ تقریبات کے لیے مخصوص تھے۔ شرکا میں میری شمولیت بھی تھی۔ اکابرین میں شمس الرحمن فاروقی شامل تھے۔ الگ الگ مقامات— خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، بھارتیہ نرتیہ کلا مندر اور شری کرشن میموریل ہال میں پروگرام ہوئے۔

دوسرے دن ظہرانے کے وقفے کے دوران نرتیہ کلا مندر کی آڈیٹوریم کے برآمدے میں شمس الرحمن فاروقی، سب سے بے نیاز، سر جھکائے، تنہا گزر رہے تھے، میں نے انھیں جالیا، خود کو متعارف کرایا۔ چند ساعتوں کے لیے کچھ رسمی سی باتیں ہوئیں۔ انھیں جانے کی جلدی تھی۔ ان کے پلین کا وقت قریب تھا، بریف کیس لیے وہ ہوائی اڈے کے لیے نکل پڑے تھے۔ اسی شام انھیں دہلی پہنچنا تھا۔

تعارف: ان کی پیدائش 30 ستمبر 1935 ہے، جائے پیدائش کالا کانکر ہاؤس، پرتاپ گڑھ ہے۔ یہاں موصوف کے نانا ان دنوں ملازمت کے سلسلے میں قیام پذیر تھے۔ ان کے اوائل بچپن کے دن یہیں بیتے۔

خانوادہ: ان کے والد کا نام محمد خلیل الرحمن فاروقی تھا۔ کہتے ہیں ان کے خاندان میں گذشتہ 5 سو برس سے زیادہ سے زہد و تقویٰ کی روایت رہی ہے۔ اپنے والد کی شفقت و محبت کا ذکر موصوف نے بارہا کیا ہے۔ ایسے مواقع پر غم زدہ بھی ہوئے ہیں۔ ان کے تئیں، ان کا لگاؤ، بے مثال ہے۔ ان کا خاندان فیروز تغلق کے عہد سے کوڑیا پار ضلع، مئو (یوپی) میں آباد رہا ہے۔ ان کے آبا و اجداد کی جڑیں، تاریخی نوعیت کی رہی ہیں۔ بلاشبہ یہ تحقیق کا ایک موضوع ہوسکتا ہے۔

مزاج: شواہد ہیں کہ بچپن سے ہی انھیں اپنے گھر میں مخبوط الحواس فرد سمجھا جاتا تھا۔ ان میں دوسرے بچوں، جیسے خواص نہیں تھے۔ الگ، تھلگ رہنے اور اپنی سوچوں میں گم ہونے کی ان کی عادت تھی۔ اچھل، کود سے انھیں لگاؤ تھا۔ نہ دوڑ دھوپ میں ان کی سرگرمی تھی۔ وہ خاموش طبع، شرمیلے اور کم آمیز تھے۔ ہم عمر بچوں کے ساتھ ان کے کھیلنے، کودنے سے احتراز کے چرچے ملتے ہیں۔

تنہائی: اس کے بھی نشان ہیں کہ ان کا بچپن مالی تنگی میں گزرا۔ شاید یہی وجہ ہو کہ انھوں نے یاری، دوستی سے گریز کیا۔ جیب خالی ہو تو دوست کہاں ملتے ہیں؟ یہ واقعہ ہے کہ گریجویشن تک انھوں نے پتلون نہیں پہنی، حالانکہ ان دنوں بھی خوشحال گھروں کے بچے کالج پہنچتے، پہنچتے سوٹ، بوٹ اور ٹائی کے رنگ میں رنگ جاتے تھے۔

مطالعہ: انھیں مطالعے کا بہت شوق تھا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کا یہ شوق جنون کی حدوں کو چھو چکا تھا۔ کتاب جو بھی ہو، جیسی بھی ہو، ہاتھ لگ جائے تو اسے پڑھے بنا نہیں رہتے تھے۔ جن دنوں وہ اعظم گڑھ میں رہتے تھے، ان کے گھر کے نیچے ایک جلد ساز کی دکان تھی۔ دکاندار کا بیٹا ان کا ہم عمر تھا۔ اس سے انھوں نے دوستی کرلی۔ اس کا انھیں فائدہ یہ ہوا کہ جلد سازی کے لیے آنے والی ہر کتاب ان کے ہاتھ لگ جاتی، اور اسے وہ کھنگال ڈالتے، کچھ سمجھتے، کچھ نہ سمجھتے، لیکن پڑھے بنا دم نہ لیتے! یہی وہ موقعہ تھا جب پڑھنے کی رو میں روا اور ناروا، وہ سب کچھ پڑھ گئے۔ انھوں نے اسلامیات سے متعلق کتابیں پڑھ ڈالیں، سیرۃ النبی کا مطالعہ کیا، اس دور کے مسائل سے باخبر ہوئے اور خلفائے راشدین کی زندگی

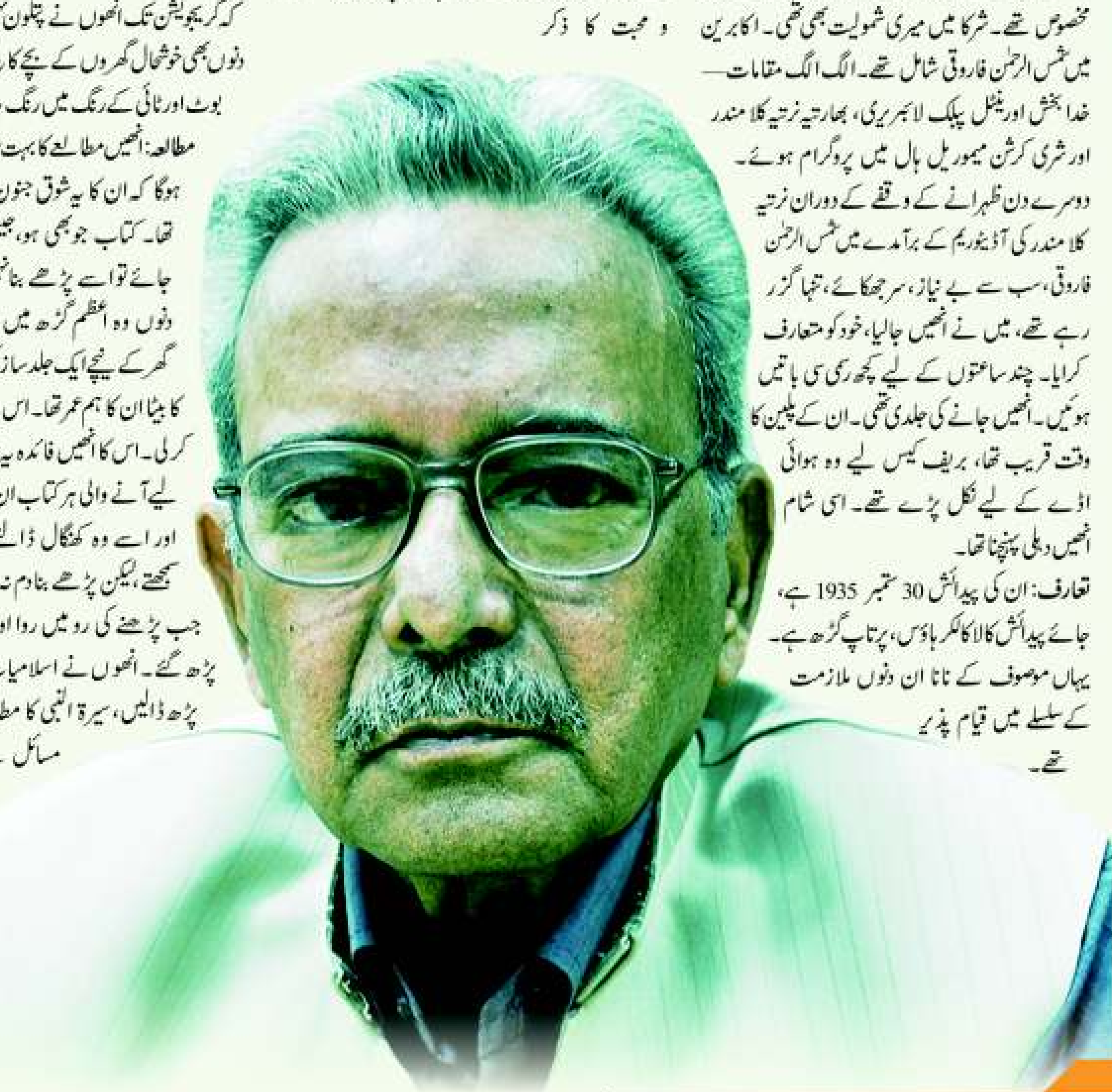

سے واقف ہوئے۔ پھر 'فسانۂ آزاد' سے آشنا ہوئے۔ 'الفاروق' میں وہ کھو گئے۔ عمر خیام مطالعے میں آئے۔ ایم اسلم اور صادق سردھنوی کی تصنیفات پڑھ ڈالیں۔ تیرتھ رام فیروز پوری کے تراجم سے ان کی پہچان ہوئی۔ غرضیکہ ان دنوں تمام پڑھنے والوں کے ہاتھوں میں جو کتابیں بے روک پہنچتی تھیں، وہ سب ان کی دسترس میں آئیں۔ 'الہلال' کی ساری فائلیں بھی وہ دیکھ گئے۔ وہاں آباد جہانوں سے ان کی پہچان ہوئی۔

اثرات: فاروقی اسکول کے دنوں میں سید احتشام حسین اور کالج کے دنوں میں محمد حسن عسکری سے متاثر ہوئے۔ اشتراکی اصولوں اور ترقی پسندی کے تانے بانے سے متعارف ہوئے۔ اپنے والد کے ساتھ آپ نے سید سلیمان ندوی، اقبال سہیل اور عبدالسلام ندوی سے فیض حاصل کیا۔ پھر شبلی نعمانی کے علمی و ادبی مرتبے سے واقف ہوئے۔ اس فیض نیز واقفیت نے انھیں ذہنی پختگی دی۔

تعلیم: انھوں نے گورکھپور سے گریجویشن کیا۔ انگریزی ادبیات میں ایم اے کیا۔ انگریزی کے مطالعے نے ان کے ذہن کو وسعت دی۔ اس پس منظر میں اپنے ادب کی کوتاہیوں پر ان کی نگاہ گئی۔

ذہن سازی: گریجویشن کرتے کرتے وہ شیکسپیئر پر مرمٹے اور اس بڑے شاعر اور ڈراما نگار پر فریفتہ ہوگئے۔ انھیں اعتراف ہے:

''گرمی کی تپتی ہوئی دوپہری اور چاندنی چھٹکی ہوئی راتوں میں لالٹین کی روشنی میں میں نے اس عظیم الشان دنیا کا سفر کیا جو شیکسپیئر کے اوراق میں آباد ہے۔''

وہ آگے کہتے ہیں:

''شیکسپیئر نے مجھ کو اس طرح جکڑ لیا جس طرح کوئی خواب کسی ننھے بچے کو قابو میں کر لیتا ہے۔''

وہ پھر کہتے ہیں:

''ان دنوں سے لے کر آج تک شیکسپیئر اور میرے درمیان ایک ایسا ربط قائم ہے جس کا اظہار الفاظ میں نہیں ہوسکتا۔''

شخصیت سازی: اب آیئے، ان کی شخصیت کے اوراق الٹیں، ان کا حلیہ ان لفظوں میں سمیٹا جاسکتا ہے۔ ''بوٹا سا قد، پھرتیلا بدن، فوجیوں کا سا چہرہ مہرا۔'' وقت کے ساتھ ساتھ وہ بدلے۔ پہلے ان کے سیاہ، گھنگھریالے بال، چھوٹے چھوٹے تھے۔ پھر یہ گیسو دراز ہوگئے۔ ان کے رویے میں تبدیلی آئی۔ پہلے، انداز سے شوخی ٹپکتی تھی، اور مسکراہٹ کا انداز ایسا تھا جیسے اس میں تمسخر شامل ہو۔ پھر چہرے پر سنجیدگی آگئی اور وقار نظر آنے لگا۔

وضع اور عارضہ: محفلوں میں انھیں دیکھنے والے بتاتے ہیں کہ وہ جب تک کہیں بیٹھتے، ماحول کا بغور جائزہ لیتے رہتے۔ بے حد چمکدار آنکھیں، سفید چشمے کے پیچھے ناچتی رہتیں۔ مسلسل پہلو بدلتے رہتے، اور پائپ جلتا، بجھتا رہتا۔ جب سے عارضۂ قلب نے دبوچا، پائپ سے ان کا یارانہ گیا، اور تمبا کو کی خوشبو ہوا ہوگئی۔

مصروفیات: ماسٹرس کی ڈگری کے حصول کے بعد موصوف نے کچھ عرصہ ستیش چندر کالج، بلیا اور پھر شبلی کالج، اعظم گڑھ میں بطور استاد خدمات انجام دیں۔ اس سے ان کے ذہن کی مزید پرتیں کھلتی چلی گئیں۔ 1958 میں انڈین پوسٹل سروس میں ان کا انتخاب ہوگیا۔ لکھنؤ، پٹنہ، دہلی میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ چیف پی، ایم، جی ہوئے۔ پوسٹل بورڈ کے ممبر بنے۔

ادب سے واسطہ: ادبی دنیا میں داخلے کے لیے، انھیں بہت تگ و دو کرنا پڑی۔ ان کی تحریریں لائق توجہ نہ سمجھی گئیں۔ ان کی واپسی سے انھیں دلی رنج ہوا۔ واپس ہوئے مسودوں کے ہمراہ، رد کیے جانے کا پرزہ، یا مدیر کے خط کی غیر موجودگی مزید تکلیف دہ تھی۔

شب خون: شمس الرحمٰن فاروقی کی پہچان ان کے رسالے 'شب خون' سے شروع ہوئی اور جلد ہی اس نے جدیدیت کے لیے ایک نئی راہ ہموار کردی۔ میدانِ ادب، میدانِ حشر بن گیا۔ کہتے ہیں اس رسالے کے اجرا نے بڑے بڑوں کی بولتی بند کردی۔ فاروقی نے سب کی ایسی تیسی کردی۔ فاروقی کے معتقدین کی تعداد بڑھنے لگی۔ لکھنے والوں کی نئی کھیپیں تیار ہونے لگیں۔ کئی پرانے لوگوں نے بھی پالا بدل لیا۔

جدیدیت: جدیدیت کی ابتدا ترقی پسندی کے خلاف ہوئی تھی۔ ترقی پسندی پر جمود اور اشتراکیت کی تشہیر کا الزام لگا اور ترقی پسند ادیبوں پر جدیدیت کے علم برداروں نے ہلہ بول دیا۔ ہر ادب پارے کی پرکھ یہ دیکھنے کے لیے ہونے لگی کہ آیا اس میں ذات کی ترجمانی (Self-Expression) ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو اسے دنیا کو بے کار کی جگہ سمجھنا چاہیے اور انسان کو مردم آزار ہونا چاہیے۔ اس بات کی تشہیر کی گئی کہ ادیب سماج کا ٹھیکیدار ہوتا ہے اور نہ اس کی کوئی سماجی ذمے داری ہوتی ہے۔ سماج میں کچھ ناروا ہے تو اس پر انگلی اٹھانے کا کام اس کا نہیں ہے۔ ہر وہ چیز جو اس نوعیت کی ہوگی وہ ادب کے زمرے میں نہیں آئے گی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ادب پارے یکسانیت کا شکار ہوگئے۔ افسانہ ہو یا شاعری سب میں فنکار بے سمت ہوگیا۔ ترسیل کے تار ٹوٹ گئے۔ ہر وہ چیز جو سمجھ سے

شمس الرحمن فاروقی کی پہچان ان کے رسالے 'شب خون' سے شروع ہوئی اور جلد ہی اس نے جدیدیت کے لیے ایک نئی راہ ہموار کردی۔ میدان ادب، میدان حشر بن گیا۔ کہتے ہیں اس رسالے کے اجرا نے بڑے بڑوں کی بولتی بند کردی۔ فاروقی نے سب کی ایسی تیسی کردی۔ فاروقی کے معتقدین کی تعداد بڑھنے لگی۔ لکھنے والوں کی نئی کھیپیں تیار ہونے لگیں۔ کئی پرانے لوگوں نے بھی پالا بدل لیا

بالاتر ہو، اسے بڑا ادب مانا گیا۔ جو چیز سمجھ میں آجائے اس کی قدر گھٹ گئی۔ الزام تھا کہ ترقی پسند ادیب اشتراکیت کے شراکت دار ہیں۔ اب کہا جانے لگا کہ جدیدیے سرمایہ داری کے نمک خوار ہیں۔

فاروقی کا جواب: حالت اس قدر بگڑ گئی کہ شمس الرحمٰن فاروقی کو اپنی صفائی دینی پڑی۔ انھوں نے کہا:

''... میری بددیانتی صرف اتنی ہے کہ میں نے ترقی پسند ادیبوں اور جدید ادیبوں پر جو کچھ لکھا وہ صرف اپنے معتقدات اور نظریات کی روشنی میں، کسی کے کہنے، سننے سے نہیں۔''

مخالفین: جدید افسانے کے مخالفین کے بقول:

''... جدیدیت نے افسانے کو چیستاں بنا کر ان ہزاروں قارئین سے اسے چھین لیا تھا، جو انسانی مسائل کے تخلیقی افسانوی اظہار کو افسانے کا افسوں جانتے تھے۔''

مخالفین میں جو پیش پیش تھے، وہ تھے قمر رئیس، محمد حسن اور محمد عقیل۔ ان سب کا شمار اگلی صف کے ترقی پسندوں میں ہوتا تھا۔

نئے افسانے کی حمایت: شمس الرحمٰن فاروقی اپنی جانب اٹھتی ہوئی انگلیوں کے اشارے پہچانتے تھے۔ اس لیے انھیں کہنا پڑا:

''... نئے افسانے کے بارے میں عام طور سے اس تشویش کا اظہار کیا جاتا ہے کہ اس کو روایت سے اللہ واسطے کا بیر ہے۔ اس میں روایت شکنی کا رجحان ہے۔ اس میں بیانیہ کی روایتی خوبیاں نہیں ہیں، یا بہت کم ہیں۔ افسانے سے بیانیہ کے اخراج کا ذمہ دار جدیدیت کو ٹھہرایا گیا ہے۔''

حمایت: فاروقی 'جدید افسانے کی حمایت میں' یہ بھی کہنے سے گریز نہیں کرتے کہ:

''...ہمارے لیے نئے افسانے، جن میں کرداروں کی کوئی خاص اہمیت نہیں، بلکہ جن میں واقعہ ہی تقریباً سب کچھ ہوتا ہے، بیانیہ کی اصل روایت سے نزدیک ترین ہے۔''

وہ آگے کہتے ہیں:

''...نئے افسانے میں واقعہ کثرت سے ہے، لیکن عمل بہت کم ہے۔ اس میں مکالمہ بھی سوچ کی شکل میں نظر آتا ہے۔''

جدیدیت کا کمال: آخر میں تحریک کے لیے اپنی اور اپنے معتقدین کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہتے ہیں:

''...نئے افسانہ نگار نے پریم چندی افسانے کو مسترد کر کے ادب کی ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔ اس نے بڑی قربانیاں دے کر یہ سبق سیکھا ہے کہ کردار محض ایک کھونٹی ہے جس پر کسی بھی قسم کا لباس ٹانگا جاسکتا ہے، لیکن پریم چندی افسانے سے ابھی تک پوری طرح گلوخلاصی نہیں ملی ہے۔''

انکشافات: فاروقی نے اپنے ایک مصاحبے میں اپنے ذہنی رویے کے متعلق جو انکشافات کیے وہ قابل غور ہیں۔ ان سے فاروقی کی نفسیاتی کیفیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کہتے ہیں:

''...کبھی کبھی مجھ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ میرے اندر کوئی چیز بے چینی سے ابل رہی ہے، تڑپ رہی ہے، یہ کوئی اور شے ہے میں نہیں ہوں۔''

وہ مزید کہتے ہیں:

''...کوئی بالکل نامعلوم شے میرے اندر ہے اور وہ الفاظ میں نہیں، بلکہ حرکات کے ذریعے اپنا اظہار چاہتی ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنے ہاتھ، پاؤں، سر، گردن، سینہ، منہ سب کو جھنجھوڑ ڈالوں، ان کو الگ الگ اور ایک ساتھ، ایک ہی آہنگ میں متحرک کردوں، سارا زمانہ میرے ساتھ رقص کرے اور جب میں کسی پیچیدہ آہنگ، کسی بے عقل و ہوش گت پر اپنے اعضا کو حرکت میں لاؤں تو میرے دوسرے والے کو معلوم ہو جائے کہ وہی میرا عقل کل نہیں ہے۔ مجھ میں ایک عارفانہ جنون بھی ہے، جو میرے اعضا پر حاوی ہوسکتا ہے۔''

شاعری: الزام تھا کہ کیڑے، مکوڑوں والی شاعری 'شب خون' کے وسیلے سے رائج ہونے لگی۔ سستے احساسات اور مہمل تجربات سے پر شاعری کی پشت پناہی کی گئی۔

دو مثالیں دیکھیے۔

پڑوس کی چھت پر جو بندر گرا
دھڑا دھڑ نیند کا گھر گرا
گھٹنے تڑوائے فرش پر ہی
کھیلتے نہ پلنگ پر کبڈی

فاروقی کا جواب:

''...یہ ممکن ہی نہیں کہ کسی بھی شخص یا اشخاص کے کسی بھی گروہ کے مذاق سلیم کو حوالہ بنا کر شعری حسن و قبح کا معیار مقرر کیا جاسکے۔''

ظاہر ہے فاروقی کا شاعری کے بارے میں اپنا نقطہ نظر ہے۔

شکوہ: فاروقی کا شکوہ یہ بھی ہے کہ:

مجھ سے صدرنگ کو دنیا نہ سمجھ پائی کہ میں
حرفِ تکفیر بھی تھا، نعرہ تکبیر بھی تھا
(فاروقی)

فاروقی: وسیع المطالعہ: شمس الرحمٰن فاروقی کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ اس مطالعے سے وہ فیضیاب ہوئے ہیں۔ ان کی خوداعتمادی کو ان کا غرور سمجھ لیا گیا ہے۔ خاکہ نگار مجتبیٰ حسین نے درست فرمایا ہے کہ ''لوگ جسے فاروقی کا غرور سمجھتے ہیں وہ اصل میں ان کے وسیع المطالعہ ہونے کا اعتماد ہے۔''

مطبوعات: آیئے اب فاروقی کی مطبوعات پر ایک نظر ڈالیں:

- لفظ و معنی 1968
- فاروقی کے تبصرے 1968
- شعر، غیر شعر اور نثر 1973
- افسانے کی حمایت میں، 1982
- تنقیدی افکار 1984
- اثبات و نفی 1986
- تفہیم غالب 1989
- شعر شور انگیز (چار جلدیں) 1990-92
- انداز گفتگو کیا ہے 1993
- اردو غزل کے اہم موڑ 1997
- داستان امیر حمزہ 1999
- اردو کا ابتدائی زمانہ 1999
- ساحری، شاہی، صاحبقرانی 2000
- جدیدیت کل اور آج 2007
- تعبیر کی شرح 2003
- عروض، آہنگ اور بیان 1977
- لغات روزمرہ 2003
- درس بلاغت 1981
- گنج سوختہ 1969
- سبز اندر سبز 1974
- آسمان محراب 1996
- مجلس آفاق میں پروانہ ساں 2018
- سوار اور دوسرے افسانے 2001
- کئی چاند تھے سرِ آسماں (ناول)
- قبض زماں (ناولٹ) 2014

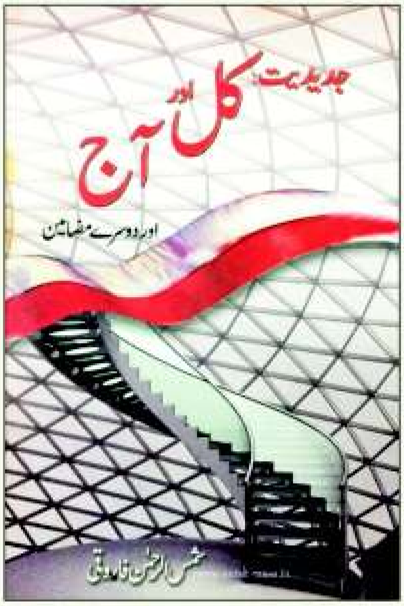

اعزازات: انھیں جو اعزازات ملے، ان میں خاص یہ ہیں:

- سرسوتی سمان، 1996
- پدم شری، 2009

یقین: شمس الرحمٰن فاروقی کے حصے میں سنگ و خشت بھی بہت آئے ہیں۔ وہ خود کہتے ہیں:

''...میرے نظریات کو مہلک، ماخوذ، رجعت پرست، انتہائی غیر رسمی، انقلابی حد تک نئے، گمراہ کن، نئی روشنی سے بھرپور، سب کچھ کہا گیا ہے۔''

اس کے باوجود انھوں نے ہمت ہاری ہے اور نہ اپنی راہ سے ہٹے ہیں۔ کہتے ہیں:

''مجھے نہیں معلوم کہ مستقبل میرے بارے میں کیا فیصلہ کرے گا، اس وقت لوگ جسے یاد رکھیں گے، وہی نقاد ہوگا، وہی شاعر۔''

اختتامیہ: فاروقی ایک فعال اور کثیر الجہت شخص ہیں۔ وہ انقلابی ذہن رکھتے ہیں۔ ان کی آواز پیغمبری کے اوصاف سے تہی دست ہوسکتی ہے لیکن وہ تنہا ہو تب بھی بازگشت بننے کی صلاحیت رکھتی ہے!

مانا کہ اپنے پیچھے وہ کوئی تاج محل چھوڑ کر نہیں جائیں گے، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ وہ 'روشنی کا مینار' بن کر تادیر موجود رہیں گے تاکہ رہروان شعر و ادب کو تاریکیوں میں روشنی کا احساس دلاسکیں!

اضافی کلام: شمس الرحمٰن فاروقی نے علم العروض میں قابل قدر کام کیے ہیں۔ آپ نے ابن صفی کی چنندہ تخلیقات کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔

سانحہ: شمس الرحمٰن فاروقی کو وڈ-19 کی گرفت میں آکر 25 دسمبر 2020 کو رحلت فرما گئے۔

■

Azim Iqbal
Adabistan, Ganj-1
Bettiah - 845438 (Bihar) Mob.: 9006502649

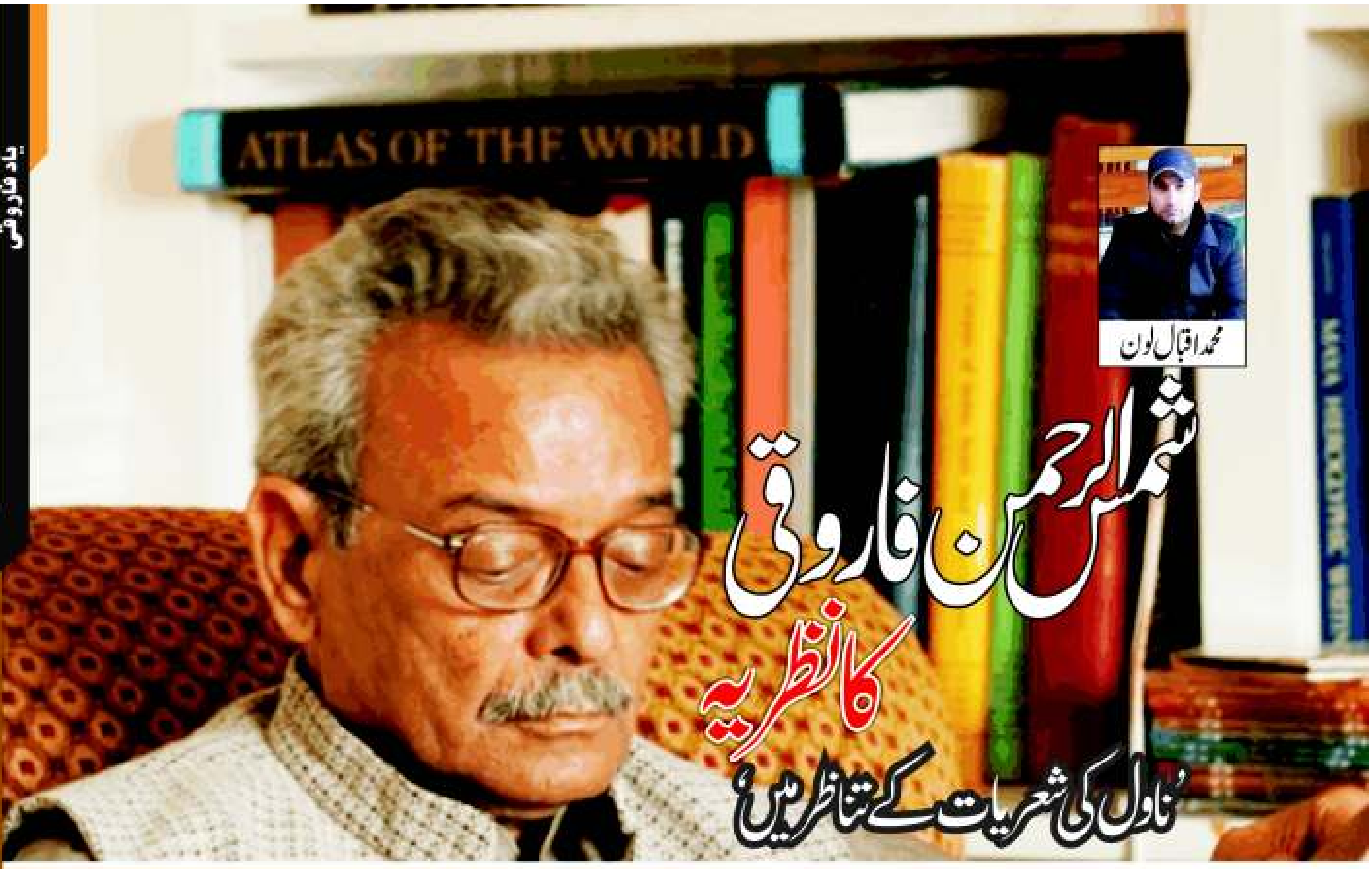

محمد اقبال لون

شمس الرحمن فاروقی کا نظریہ
ناول کی شعریات کے تناظر میں

ناول ادب کی ایک مقبول عام صنف ہے۔ اردو ادب میں اس کی تاریخ تقریباً ڈیڑھ سو سال سے زیادہ عرصے کو محیط ہے اور مغرب میں ناول کی تاریخ کم و بیش تین سو سال پر مشتمل ہے۔ چنانچہ جب اٹھارہویں صدی کے وسط میں یورپ میں سائنس اور تکنالوجی نے ترقی کی اور نتیجتاً صنعتی انقلاب آیا، بہت سارے عقائد و توہمات باطل قرار پائے تو ایسے وقت میں ناول نے جنم لیا۔ بقول فاروقی ''اٹھارہویں صدی ہی ہے جس میں ناول پیدا ہوا اور پروان چڑھا...ناول دراصل ڈرامے کا ایک محدود اور نسبتاً بے جان بدل ہے۔[1] صنعتی انقلاب نے نوآبادیاتی ہندوستان پر گہرے اثرات مرتسم کیے ہیں اور غدر کے ناخوشگوار اور دوررس نتائج نے کولونیل ہندوستان میں زندگی کے دیگر شعبہ جات کی طرح ادب کو بھی متاثر کیا ہے۔ اسی دوران میں اردو ناول معرض وجود میں آیا اور بہت کم عرصے میں ناول نے اردو ادب میں اپنا ایک مقام بنالیا۔ جب ہم ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ واضح ہوتا ہے کہ ادب کی جتنی بھی اصناف ہیں سب میں عہد بہ عہد، مسائل اور فکر وفن کے اعتبار سے تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ سماجی اور ثقافتی رجحانات نے ادب وفن میں بھی خارجی اور داخلی سطحوں پر تبدیلی کا عمل شروع کیا جن کے نتیجے میں نظم ونثر میں موضوعاتی اور ہیئتی تبدیلی واقع ہوئی جس کا ایک مظہر ناول ہے۔ ناول کی ساخت اور ہیئت پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر عتیق اللہ لکھتے ہیں:

''ہر صنف دوسری بہت سی روایتی اصناف کے آثار کا مجموعہ ہوتی ہے اور ناول بھی ایک ایسی ہی نئی صنف، نئی ساخت، نئی ہیئت ہے، جس کی نہ کوئی معین ساخت ہے نہ معین ہیئت اور نہ کوئی معین خاکہ۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ناول کا خاکہ دوسرے ناول سے مختلف ہوتا ہے۔........ ناول کو ایک صنف کا درجہ دینے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کی ساخت و ہیئت کے ایسے قاعدے تشکیل دیے جائیں جیسے مسلمہ اصناف (Canonic genres) کے ساتھ مختص ہیں۔ اسی لیے ناول کا فن بہت سی آزادیاں فراہم کرتا ہے جن سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اپنے اوپر بہت سی پابندیاں عائد کرنی پڑتی ہیں۔ بے اصولے پن میں بھی کسی نہ کسی اصول کی تلاش کو اپنا منصب بنانا پڑتا ہے۔ یہ ایک وسیع کھیل کا میدان ہے جہاں کھلنڈرے پن، تفریح، دل بہلاوے، دماغ سوزی، ٹھوکہ لگانے اور چھیڑ چھاڑ کرنے کی کافی گنجائش ہے۔ ناول نگار کو ایک وسیع تر دنیا آباد کرنی پڑتی ہے۔''[2]

ناول ادب کی واحد صنف ہے جو ایک مکمل کتاب کی صورت و ہیئت میں ہوتی ہے۔ دراصل ناول وہ صنف ہے جس میں حقیقی زندگی کے گوناگوں جذبات کو کبھی اسرار کے قالب میں کبھی تاریخ کے قالب میں کبھی رزم کے قالب میں کبھی سیاحت یا پھر نفسیات کے قالب میں ڈھالا جاتا رہا۔ اس میں پوری زندگی پر لکھا جاتا ہے یعنی ناول زندگی کی مکمل تصویر ہے جس میں زندگی کے مختلف واقعات و حادثات کو دلچسپ پیرائے میں پیش کیا جاتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو جس طرح زندگی مختلف نشیب و فراز اور وسیع سے وسیع ترین تجربات و مشاہدات سے عبارت ہے اور اس کی کلی اور جامع تعریف قلم و قرطاس کے دائرے سے باہر ہے، اسی طرح ناول کا فن یا اس کی شعریات کی تعریف و توضیح کے بارے میں کوئی حتمی حکم لگانا بہت دشوار ہے۔ ناول کی شعریات کے بارے میں معروف نقاد علی احمد فاطمی لکھتے ہیں:

''ناول کے فن یا اس کی شعریات کی حتمی شکل پیش کرنا بھی مشکل بلکہ ناممکن ہے، جس طرح زندگی کی ٹھوس تعریف نہیں کی جاسکتی۔ لیکن زندگی کی تعریف نہ کیا جانا ہی زندگی کی تعریف ہے۔ اسی طرح ناول کی عدم شعریات ہی ناول کی شعریات ہے کیونکہ زندگی ناہموار ہے، اس لیے ادب بھی ناہموار اور فکشن اس سے بھی زیادہ ناہموار۔''[3]

ناول ایک ایسا آئینہ خانہ ہے جس میں انفرادی و اجتماعی زندگی کے اندرونی و بیرونی سارے روپ دیکھے جاسکتے ہیں۔ زندگی کی تفسیر، فطرت کی عکاسی و ترجمانی اور حقائق کی تصویر کشی وغیرہ ناول کی بنیادی شعریات قرار پائے۔ علی عباس حسینی، وقار عظیم، یوسف سرمست، احسن فاروقی اور پروفیسر حسن جیسے ناول کے ناقدین نے انھیں روایتی پیمانوں اور اصولوں پر اردو ناول کی تعیین قدر کی۔ اس دوران عالمی ادب میں ناول تنقید کے ماہرین نے زبان، بیانیہ، تھیم، آئیڈیولوجی وغیرہ کو ناول کی شعریات

قرار دیا جس میں نارتھروپ فرائی، رومن جیکب سن، کلاڈ لیوی اسٹراس، اے جے گریماز، زیرار ژینت، ژوتیاں تودرف وغیرہ کے نظریات وخیالات نے مزید وضاحت و صراحت کی۔ اردو ادب میں بھی ان نظریات و افکار کی گونج سنائی دی اور 1980 کے بعد ناول کو ان نظریات و افکار کے پیمانوں پر بھی پرکھا جانے لگا اور یہ نئے اصول پرانے اصولوں کی توسیع کے بطور ابھرے۔ لہٰذا نئے ناولوں کا تعین قدر توسیع شدہ اصولوں پر ہونے لگا جس سے فنکار اور فن پارے کی قدر شناسی اور قدر سنجی کے معیار و منہاج مضبوط تر ہو گئے۔ گویا اب موضوع، پلاٹ، واقعات، کردار، زندگی اور زمانے سے متعلق نظریات زبان کا برتاؤ، اسلوب، حقیقت کی نقاب کشائی، معاصر یا مابعد جدید تہذیب کی عقدہ کشائی، بیانیہ، تفہیم، آئیڈیولوجی وغیرہ ناول کی شعریات قرار پائے۔

زیر نظر مقالے میں ناول کی شعریات کے بارے میں اردو کے قد آور نقاد شمس الرحمٰن فاروقی کے نظریات و خیالات کو جاننے کی کوشش کی جائے گی۔ یہاں پر اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ فاروقی نے اردو کی تقریباً ہر صنف کی ہیئت، تکنیک اور تعریف و توضیح اور اس کے حدود اربعہ کے بارے خوب صراحت کی۔ لیکن ناول واحد صنف ہے جس کی نظری اور عملی تنقید کے حوالے سے انھوں نے حیرت انگیز طور پر بہت کم لکھا ہے۔

فاروقی نے سب سے پہلے اس موضوع (آج کا مغربی ناول) پر ہنری جیمس کے مضمون 'ناول کا مستقبل' کا ذکر کیا ہے۔ ہنری جیمس ناول کو انعکاس کا بہترین ذریعہ سمجھتا ہے۔ اس کا یہ بھی خیال ہے کہ جب تک موضوعات باقی ہیں ناول برقرار رہے گا لیکن فاروقی یہ دیکھتے ہیں کہ بیسویں صدی میں ناول کی جدید تنقید اس نظرے سے انکار کرتی ہے۔ فاروقی نے ناول پر بحث کرتے ہوئے مغربی مفکرین اور ناول نگاروں کو موضوع بنایا ہے اور مغربی ناول کا منظر نامہ اردو دنیا کے سامنے غالباً پہلی بار پیش کیا ہے۔ اس مضمون میں موصوف نے ناول کی شعریات کے حوالے سے کئی مفید اور بنیادی باتیں کیں۔ بحوالہ کامیو، فاروقی ناول کے متعلق یوں فرماتے ہیں:

''ناول دراصل کیا ہے؟ یہ ایک کائنات ہے جس میں واقعہ یا عمل کو ہیئت بخش دی گئی ہو، جہاں آخری الفاظ کہے جائیں، جہاں لوگ ایک دوسرے کو پوری طرح اپنا لیں، اور جہاں زندگی تقدیر کی شکل اختیار کر لے۔ ناول کی دنیا اس دنیا کی محض تطہیر ہے۔ جس میں ہم انسان کی عمیق ترین خواہشات کی تکمیل کے لیے جیتے ہیں۔ کیونکہ دنیا بلاشبہ وہی ہے جسے ہم دنیا سمجھتے ہیں۔ وہ دکھ، وہ فریب، وہ محبت، سب وہی ہیں۔ ناول کے ہیرو وہی زبان بولتے ہیں جو ہم بولتے ہیں۔ ان کی کمزوریاں ہماری کمزوریاں ہیں... ان کی قوت ہماری قوت ہے''[4]

شمس الرحمٰن فاروقی کا خیال ہے کہ ناول کے بارے میں کوئی ایک تھیوری قائم نہیں ہو سکتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ناول عہد انقلاب کی پیداوار ہے اور عہد انقلاب میں پورے یورپ میں تبدیلیاں پیدا ہو رہی تھیں جس کے نتیجے میں روشن فکری کا زمانہ آیا اور روشن فکری کی بنیاد ہی ان باتوں پر قائم ہوتی ہے کہ ہر چیز کو سوال میں لایا جائے۔ ایسے وقت میں ناول نے جنم لیا لہٰذا ناول میں اس وقت کی تبدیلیوں کا احاطہ کیا گیا۔ اسی لیے ہم زمانے کے زمینی حقائق اور دنیا و مافیہا کے حالات کا عکس ناول میں دیکھتے ہیں۔ ناول زندگی اور اس سے منسلک تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے یعنی انسانی زندگی کے مختلف نشیب و فراز، پیچ و خم اور طرح طرح کے واقعات و حوادث سے عبارت ہے اور زندگی وقت کے کٹہرے میں قید ہے۔ جب ناول کو زندگی کی عکاسی و ترجمانی پر محمول کیا جاتا ہے تو اس میں ان عوامل کا در آنا ایک فطری امر ہے۔ اس تناظر میں فاروقی مغربی مفکرین کے حوالے سے ناول میں واقعیت اور وقت کے تعلق سے کچھ اہم نکتوں کی طرف ہماری توجہ مبذول کرتے ہیں۔ ان کے بقول

''ناول زندگی کا احاطہ کس طرح اور کس حد تک کرتا ہے۔ لہٰذا ناول کے اخلاقی اور فنی مسائل کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ بنیادی مسئلہ واقعیت کا ہے۔۔۔ چونکہ واقعیت کا انعکاس وقت کے دائرے ہی میں ممکن ہے، اس لیے ناول اپنا فنی اظہار کس طرح کرے؟ اس سوال کا جواب بیک وقت واقعیت اور فنکارانہ اسالیب کا احاطہ کرتا ہے۔''[5]

ناول سے متعلق شمس الرحمٰن فاروقی ان لوگوں کے نظریات کو غلط ٹھہراتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ناول ترقی یافتہ صنف ہے اور داستان غیر ترقی یافتہ۔ اس سلسلے میں فاروقی نے جو کچھ کہا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اب تک جو روایت ہے وہ قصہ کہنے کی ہے اور جو ناول کی روایت ہے قصہ لکھنے کی ہے۔ قصہ لکھنے اور کہنے میں فرق ہوتا ہے۔ دونوں کی حرکیات الگ الگ ہوتی ہیں۔ لہٰذا دونوں کو الگ الگ رکھا جائے اور یہ گمان ہرگز نہ کیا جائے کہ داستان غیر ترقی یافتہ اور ناول ترقی یافتہ صنف ہے۔ ناول کی شعریات کے بارے میں فاروقی بنیادی بات یہ کہتے ہیں کہ جب ناول روشن فکری کے زمانے کی پیداوار ہے اور روشن فکری کی اساس کئی سوالات پر قائم ہے۔ مثلاً یہ کہ انسان کی ضرورت اندر سے کیا ہے؟ نفسیات کسے کہتے ہیں کردار کسی چیز سے محبت یا نفرت کیوں کرتا ہے؟ تو ناول کے لیے یہ بات ضروری ٹھہری کہ ناول کے جو کردار ہیں ان کو صرف اوپر سے نہ بیان کیا جائے بلکہ اس کے اندر جو کچھ ہو رہا ہے اس کو پڑھا جائے اور پڑھ کر لوگوں کو بتایا جائے۔ اس لیے ناول نگار سے یہ توقع رہتی ہے کہ وہ زندگی کے بارے میں کچھ بتائے۔ چنانچہ پریم چند کا ناول اس لیے نہیں پڑھتے ہیں کہ کسانوں اور غریبوں کے حالات معلوم ہوں بلکہ یہ چیزیں تو ہمیں تاریخ میں مل جاتی ہیں۔ اس لیے پڑھتے ہیں کہ اس زمانے کے لوگ اندر سے کیسے تھے ان کے احساسات کیسے تھے اور وہ زندگی میں کیسے گھٹتے رہے ہوں گے۔ ان تمام پہلوؤں کے لیے ہم پریم چند کا ناول یا کسی اور ناول نگار کو پڑھتے ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی کا خیال ہے کہ مغربی ناول نگار اور ناقد کو کئی مسائل درپیش ہیں۔ جیسا کہ پہلے ہی کہا گیا ہے کہ فاروقی زیادہ تر مغربی ناول نگاروں اور ناقدین کے حوالے سے اپنی بات رکھتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ناول مغرب کی دین ہے۔ اس لیے اردو ناول کی شعریات پر وہی اصول وقوانین اور قواعد و ضوابط منطبق ہوں گے جو اس کی اصل شعریات کا خاصہ ہے۔ مغربی ناول نگار اور نقاد ناول کے تناظر میں جن مسائل سے دوچار ہیں۔ موصوف اس طرح بیان کرتے ہیں:

''میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے زمانے کا مغربی ناول نگار اور ناول کا نقاد جن مسائل سے دوچار ہے ان کو تین عنوانات کے تحت رکھا جا سکتا ہے: (1) اخلاقی، یعنی ناول میں کیا کہا جائے؟ ناول فرد کا اظہار ہے کہ سماج کا؟ کیا ناول خیر وشر کے مسئلے سے بحث کرتا ہے یا محض زندگی سے، یعنی کیا ناول مسائل سے عبارت ہے یا زندگی کی مکمل معنویت یا بے معنویت سے؟ (2) فلسفیانہ، یعنی کیا ناول نگار وابستگی میں یقین رکھتا ہے؟ اگر ہاں تو کس حد تک؟ اور (3) فنی، یعنی ناول کس طرح اپنے قیود سے آزاد ہو سکتا ہے؟ اور وہ قیود کیا ہیں؟ موجودہ مغربی ناول (......) اور اس کی تنقید گھوم پھر کر انھیں باتوں پر مراجعت کرتی ہے''[6]

ناول سے متعلق شمس الرحمٰن فاروقی کا ایک تصور یہ ہے کہ جہاں ناول نے کچھ چیزیں حاصل کی ہیں تو وہیں پر کچھ چیزیں کھوئی بھی ہیں۔ بڑی چیز تو یہ کھوئی ہے کہ ناول نگار اور اس کے قاری کے درمیان کوئی ربط نہیں، پتہ نہیں وہ قاری کہاں ہے لندن میں ہے یا دلی میں۔ اس بنا پر جو وہ قصہ لکھتا ہے اس کو احساس ہوتا ہے کہ میں اپنے لیے قصہ لکھتا ہوں۔ اس وجہ سے ناول نگار کی ذمہ داریاں

کچھ اور ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنے قاری کو اپنے ناول سے ہم آہنگ کرنے کے لیے قصے کو اتنا وثوق انگیز بناتا ہے یعنی ایسا قصہ بناتا ہے گویا ممکنات سے تعلق رکھتا ہے، وہ اپنے قصے میں غیر امکانی بات بیان کرنے سے پرہیز کرتا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی کی نظر میں ناول کی شعریات اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ناول کسی نہ کسی صورت سے داخلی یا خارجی دنیا کی حقیقت سے روشناس کرے۔ جدید ناول تو فرد کی داخلی یا خارجی دنیا کے ساتھ ساتھ مجموعی طور پر پوری زندگی کا مفہوم و ماحصل کا تقاضا کرتا ہے۔ اس تناظر میں فاروقی بہ حوالہ سول بیلو Sual Bellow لکھتے ہیں۔ ''کہ جدید ناول نے فرد کی داخلی کشمکش کا اخراج کر دیا ہے، کیونکہ یہ داخلی کشمکش محض ایک نقطہ ہے، جب کہ میں ساری زندگی کا خلاصہ اور نچوڑ مانگتا ہوں... ناول میں شکایت، احتجاج، عدمیت سے بھرپور غصہ، واقعیت اور ماحول کی شدید احساس کی کارفرمائی ہے''[7] یعنی جدید زندگی میں ناول سے ہم یہ توقع کریں جس کی توقع میر کو اپنے دل سے تھی۔

دل ہم نے کو مثال آئینہ

ایک عالم روشناس کیا

شمس الرحمٰن فاروقی کا واضح موقف ہے کہ ناول نگار اس بات کا پابند نہیں ہے کہ وہ وہی کہے جو اس سے متوقع ہو بلکہ اسے وہی بات کہنی ہے جو وہ خود کہنا چاہتا ہے۔ یعنی ناول نگار کسی بھی طرح اپنے خیالات و احساسات یا اپنا تجربہ یا vision کو بیان کرنے میں خود مختار اور آزاد ہے جو چیز اسے جیسی نظر آئے اس کو وہ ویسی ہی پیش کرنے کا مجاز ہے۔ مگر انسانی نفسیات اور کرداروں کے مزاج کو ملحوظ رکھنا بہرحال اس کی مہارت اور ہنرمندی پر دال ہے۔ مزید ناولاتی بیان کے تعلق سے فاروقی یوں رقمطراز ہیں:

''ناولاتی بیانیہ میں کردار کے ذریعے واقعات کو Focalise کرتے ہیں یعنی واقعات کے اندر معنویت کردار کے نقطۂ نظر پر منحصر ہوتی ہے یا اس نقطۂ نظر پر جسے بیانیہ نگار بیانیہ پر حاوی کرتا ہے۔''[8]

شمس الرحمٰن فاروقی کے مطابق ناول کے ارتقا میں داستان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ سہیل بخاری کی رائے میں بھی ناول داستان کی ارتقائی شکل نہیں ہے۔ یہ بات اردو فکشن کی روایت کو مدنظر رکھتے ہوئے قابل قبول نہیں لگتی۔ کیونکہ ہمارے اردو ادب میں 1869 میں جب مولوی نذیر احمد کے ہاتھوں ناول کا آغاز ہوا تو اس سے پہلے داستان کا ہر طرف چرچا تھا۔ میر امن کی باغ و بہار

آج سے تیس چالیس برس پہلے تک ناول ایک روایتی قسم کی صنف سخن تھا، جس میں پیچیدہ ادبی اور فنی مسائل کو گھسیٹ لانے کی ضرورت نہ تھی، لیکن جدید ناول نگاروں کے ہاتھ میں ناول ایک مخصوص، کم انتخاب Exclusive اور پیچیدہ صنف کی شکل میں سامنے آیا۔ اس کی توجیہہ اور پچھلے ناول سے انکار کا کام لامحالہ نئے ناول نگاروں نے ہی کیا۔

منظر عام پر آ چکی تھی اور اس کے جواب میں رجب علی بیگ سرور فسانۂ عجائب نامی ایک داستان پیش کر چکے تھے۔ لوگ داستان پڑھتے اور سناتے تھے۔ ایسے میں مولوی نذیر احمد اور ان کے بعد ناول نگاروں نے ضرور ان داستانوں کو پڑھا ہوگا اور ان سے متاثر ہو کر ناول لکھنے کا قصد کیا ہوگا۔ ہمارا دعویٰ اس طرح مدلل ہو جاتا ہے کہ جیسے داستان میں پلاٹ اور کردار وغیرہ ہوتے ہیں، اسی طرح ناول میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ناول کے ارتقا میں داستانوں کا بھی کم و بیش اور کم سے کم بالواسطہ حصہ ضرور رہا ہے۔ ناول ہمارے ہاں براہ راست مغرب سے آیا، جبکہ مغرب میں یہ رومان کی ارتقا یافتہ صورت ہے۔ لہذا ناول داستان کے زوال کا سبب اور وجہ نہیں ہے بلکہ اس کے وجوہ الگ ہیں۔ فاروقی اس بات کو دوسرے لفظوں میں اس طرح کہتے ہیں:

''ناول یا ناول نما تحریریں جو اس وقت بازار میں آ رہی تھیں وہ داستان کی جگہ نہیں لے رہی تھیں۔ ان کے پڑھنے والے عام طور پر کچھ اور طرح کے لوگ تھے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر میں داستان پڑھنے والے لوگ ناول پڑھنے والوں سے زیادہ تھے، اور ان میں کم لوگ ایسے رہے ہوں گے جو نئے زمانے کا ناول بھی پڑھتے ہوں۔ لہذا ناول کی مقبولیت کو داستان کے زوال کا سبب قرار دینا درست نہ ہوگا۔''[9]

ناول کی جدید نظری تنقید کے تعلق سے شمس الرحمٰن فاروقی کا یہ تصور ہے کہ ناول کی جدید نظری تنقید سے ہم اردو والوں کی ملاقات بس واجبی سی ہے۔ ناول کے اصولوں سے ہماری ملاقات ان کتابوں کی بنا پر جو آج سے ساٹھ ستر برس پہلے لکھی گئی تھیں۔ بلکہ ہنری جیمس کے مضامین، جن پر ناول کی زیادہ تر تنقید ہمارے یہاں تکیہ

کرتی رہی ہے، اب سو برس سے بھی اوپر کی عمر پہنچ چکی ہیں، ای ایم فارسٹر کی چھوٹی سی کتاب جس کے بغیر ہمارے اکثر نقاد لقمہ نہیں توڑتے ہیں۔ یہ کتاب 'ناول کا فن' 1927 کی ہے۔ اس کتاب میں کردار اور پلاٹ کے بارے میں جو کچھ کہہ دیا گیا ہے۔ دشت تنقید میں ہمارا زاد سفر اب بھی وہی ہے۔ ہنری جیمس کے پہلے ناول کی نظری تنقید میں کیا مسائل تھے اور تیس پچیس برس میں جو باتیں ہوئی ہیں ہمیں ان دونوں سے کوئی سروکار نہیں۔ جیمس کے بعد ناول کی تکنیک بہت جلد بدلی اور بیانیہ کے ایسے اسلوب کی جگہ جس میں ناول نگار ایک ایسے شخص کے روپ میں سامنے آتا ہے جسے تمام کرداروں پر گزرنے والے تمام واقعات کا علم ہے۔ اس کے بعد کچھ ناول نگاروں کے یہاں بیانیے کا وہ اسلوب نظر آتا ہے جس میں ناول نگار صرف ایک یا چند کرداروں کے شعور و لاشعور میں غرق ہو کر کائنات یا خود ان کرداروں کو اپنے تخیل کی گرفت میں لاتا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی اپنے ایک فکر انگیز مضمون بعنوان ''آج کا مغربی ناول... نظریات و تصورات'' میں ناول کے فن کے تغیر و تبدل کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

''آج سے تیس چالیس برس پہلے تک ناول ایک روایتی قسم کی صنف سخن تھا، جس میں پیچیدہ ادبی اور فنی مسائل کو گھسیٹ لانے کی ضرورت نہ تھی، لیکن جدید ناول نگاروں کے ہاتھ میں ناول ایک مخصوص، کم انتخاب Exclusive اور پیچیدہ صنف کی شکل میں سامنے آیا۔ اس کی توجیہہ اور پچھلے ناول سے انکار کا کام لامحالہ نئے ناول نگاروں نے ہی کیا۔''[10]

شمس الرحمٰن فاروقی جہاں مغرب میں ناول نگاری میں شاندار ادبی روایت اور سرمایے کا تذکرہ کرتے ہیں اور اس کی ترتیب و تشکیل اور ارتقائی مراحل کو مدلل اور مفصل انداز میں پیش کرتے ہیں۔ وہیں موصوف آج مغربی ناول کی صورت حال پر یہ تاثر پیش کرتے ہیں کہ آج کا ناول نگار Idenitity crisis کے دور سے گزر رہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''آج کا ناول تاثر کے اعتبار سے اتنا متنوع ہے کہ اس پر کوئی ایک حکم لگانا مشکل ہے۔ صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاعری کی طرح آج کا ناول نگار بھی Identity Crisis سے گزر رہا ہے اور اس کی تحریروں پر بے چینی کی فضا حاوی ہے''[11]

شمس الرحمٰن فاروقی کا خیال ہے کہ جدید ناول عصری حقیقت کو گرفت میں لانے کا عمل مشکل سے ہی

انجام دے پاتا ہے یا یوں کہیں کہ عصری مسائل اور تقاضوں کا مکمل احاطہ اور موثر ابلاغ وترسیل ناول سے نہیں ہو پاتا ہے۔اس کے کئی وجوہات ہوسکتے ہیں اور ناول کے وجود کا مستقبل دراصل قومی نہیں بلکہ عالمی ناولوں سے وابستہ ہے۔ فاروقی معروف مغربی ناول نگار میری مک کارتھی کے حوالے سے یوں گویا ہیں۔''موجودہ ناول نگار کی مشکل یہ ہے کہ وہ مستقبل کی تعمیر نہیں کر پاتا بلکہ یہ ہے کہ وہ حال کی تشکیل وتعمیر سے مجبور ہے۔''[12]

شمس الرحمٰن فاروقی داستان اور ناول پر بحث کرتے ہوئے ایک اہم بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ہمارے یہاں ناول کی کوئی مستقل روایت نہیں ہے جس کی بنا پر ایک ناول نگار کے فن کو دوسرے کے مقابلے میں رکھا جائے اب اگر کوئی کہے کہ ناول کو داستان کی روایت سے جوڑ کر آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔کیونکہ دونوں بیانیہ کے اقسام میں سے ہیں۔اس تعلق سے فاروقی کا خیال ہے کہ ناول کو داستان کی روایت سے نہیں جوڑ سکتے۔کیونکہ داستان کی جو طرز وجود ہے وہ فکشن کے طرز وجود سے بالکل مختلف ہے،مثال کے طور پر داستان میں داستان گو اور سامعین کے درمیان ایسا ربط ہوتا ہے کہ دونوں فوری طور پر آمنے سامنے ہوتے ہیں اور ناول میں ایسا نہیں ہوتا۔باختن کے لفظوں میں ناول نگار سے زیادہ دنیا میں کوئی تنہا آدمی نہیں ہے وہ اکیلا بیٹھا لکھ رہا ہے۔اس کے پڑھنے والے کہاں ہوں گے اور اس کو کس طرح پڑھیں گے؟ یا ردعمل ہوگا۔پڑھیں گے کہ نہیں یا پھاڑ کے پھینک دیں گے اس کو کچھ نہیں معلوم۔وہ تو صحیح معنوں میں اپنے دل کو اتار کر کاغذ پر رکھ دے رہا ہے،اس کے بعد چپ ہے۔دوسری بات یہ ہے کہ داستان سنائی جاتی ہے اور ناول لکھا جاتا ہے۔زبانی سنانے کی حرکیات الگ ہوتی ہے اور لکھی جانے کی حرکیات الگ ہوتی ہے،تو فاروقی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''ان دونوں کے درمیاں وہی رشتہ ہے جو نارنگی اور آم میں ہے کہ دونوں میٹھے ہیں۔دونوں ایک رنگ کے ہوتے ہیں۔پھر بھی دونوں الگ الگ ہیں۔ان اسباب کی بنیاد پر آپ ناول کی روایت کو آگے بڑھانے کے لیے داستان سے نہیں جوڑ سکتے'[13]

بعض نقادوں کا کہنا ہے کہ ناول جدید عہد کی پیدوار ہے لہٰذا ناول کے تعلق سے بات جدید خیالات کی روشنی میں ہی کرنی چاہیے۔شمس الرحمٰن فاروقی اس بات کی تردید کرتے ہیں اور اپنے نقطۂ نظر کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''یہ کہنا غلط ہے کہ ناول چونکہ جدید صنف ہے اس لیے اس پر جدید خیالات کی ہی روشنی میں بات ہوگی۔ناول تو ہنری جیمس سے پہلے بھی موجود تھا بلکہ دنیا کے سب سے بڑے ناول نگاروں میں سے کم سے کم تین یعنی ڈکنس، بالزاک اور فلوبیر تینوں ہی ہنری جیمس سے پہلے تھے اور دو یعنی دستوفسکی اور تالستائی بھی جیمس کے بزرگ ہم عصر تھے۔لہذا ہنری جیمس (تالستائی) دستوفسکی اور ڈکنس ان تینوں میں سے کسی کو پسند نہیں کرتا تھا کہاں کا ارسطو ہے کہ ہم ناول کے بارے میں اس کی بات مان لیں'[14]

ناول کی ایک تکنیک یہ بھی ہے کہ اس میں واقعات وحقائق کو بیانیہ کے انداز میں پیش کیا جائے۔یہاں یہ سوال ہے کہ اگر بیانیہ کا کوئی راوی ایسا ہو جو زمانہ قدیم سے تعلق رکھتا ہے تو اس صورت میں وہ اس عہد کی زبان استعمال کرے گا یا اس عہد کی جس میں بیانیہ استعمال ہو رہا ہے۔شمس الرحمٰن فاروقی کا اس سلسلے میں نظریہ یہ ہے کہ

جدید ناول عصری حقیقت کو گرفت میں لانے کا عمل مشکل سے ہی انجام دے پاتا ہے یا یوں کہیں کہ عصری مسائل اور تقاضوں کا مکمل احاطہ اور موثر ابلاغ وترسیل ناول سے نہیں ہوپاتا ہے۔ اس کے کئی وجوہات ہوسکتے ہیں اور ناول کے وجود کا مستقبل دراصل قومی نہیں بلکہ عالمی ناولوں سے وابستہ ہے۔ فاروقی معروف مغربی ناول نگار میری مک کارتھی کے حوالے سے یوں گویا ہیں۔''موجودہ ناول نگار کی مشکل یہ ہے کہ وہ مستقبل کی تعمیر نہیں کرپاتا بلکہ یہ ہے کہ وہ حال کی تشکیل و تعمیر سے مجبور ہے۔

راوی اس عہد کی زبان استعمال کرے،جس عہد سے اس کا تعلق ہے۔یہاں پر اس بات کا تذکرہ لازمی ہے کہ فاروقی کا نظریہ ان کے ناول 'کئی چاند تھے سر آسماں' کو سامنے رکھ کر اخذ کرنے کی کوشش کی گئی۔چنانچہ انھوں نے اپنے ناول میں اس بات کا پورا اہتمام کیا ہے،ناول کے اخیر صفحات میں خود فاروقی لکھتے ہیں:

''میں نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ مکالموں میں، اور اگر بیانیہ کسی قدیم کردار کی،زبانی، یا کسی کردار کے نقطہ نظر سے بیان کیا جارہا ہے تو بیانیہ میں بھی کوئی ایسا لفظ نہ آنے پائے جو اس زمانے میں مستعمل نہ تھا۔''[15]

ادب کی ہر صنف میں کچھ نہ کچھ مشترک چیزیں ہیں یعنی شاعری اور نثر کی اصناف میں بھی مشترک عناصر ہوں گے،خواہ وہ بیانیہ زبانی ہو یا تحریری۔لیکن مشترک عناصر کے باوجود ہر صنف کی شعریات اور حرکیات جدا ہے اور ایک صنف کا مطالعہ اس کی شعریات،حرکیات اور روایت کی روشنی میں ہی کیا جاسکتا ہے۔اسی طرح زبانی اور تحریری روایت کے تقاضے مختلف ہیں جن کو مدنظر رکھا جانا نہایت ضروری ہے۔یہ ایسا ہی ہے جیسے جمادات،نباتات اور حیوانات کی دنیا میں کچھ نہ کچھ ضرور مشترک ہے کیونکہ ایک سطح پر سب مخلوق ایک درجے میں ہیں،لیکن جوں جوں اوپر اٹھا جائے اختلاف کی شدت میں اضافہ ناگزیر امر ہوجاتا ہے۔یہاں تک کہ ہر اکائی اپنے ہی کل سے مختلف ہوجاتی ہے۔کل کا حصہ ہوتے ہوئے بھی اس پر کل کے ہر اصول کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔بعینہ بڑی تخلیق اپنی صنف کی روایت کا حصہ ہونے کے باوجود بھی اپنا الگ وجود رکھتی ہے۔اس لیے تخلیق کو محض چند تنقیدی اصولوں کی روشنی میں پوری طرح گرفت میں نہیں لیا جاسکتا۔

چونکہ اردو ناول کے ظہور میں آنے کے بعد ناول کی رسومیات اور شعریات مثلاً واقعیت،کردار،پلاٹ وغیرہ کا اطلاق داستان پر کیا جانے لگا۔موازنے کی حد تک تو یہ بات گوارا ہے مگر ناول کو حسن وعیب کا پیمانہ قرار دینا غلط ہے ذیل میں داستان اور ناول کی رسومیات وشعریات سے متعلق فاروقی کے موقف کو 'ساحری شاہی صاحب قرانی' کی جلد اول سے کشید کرکے پیش کیا جارہا ہے:

1 ناول کے بیانیہ میں کردار کے ذریعے واقعات کو ظاہر کیا جاتا ہے یعنی واقعات کی معنویت کردار یا بیانیہ نگار کی نظر پر منحصر ہوتی ہے،اس کے برعکس داستان میں واقعہ براہ راست اہمیت رکھتا ہے،وہ کردار پر منحصر نہیں ہوتا۔

2 داستان کی دنیا کے قاعدے قانون ہیں،جنھیں جانا جاسکتا ہے۔کائنات کے اٹل اصول ہیں۔دوسرا بنیادی تصور یہ ہے کہ بظاہر دکھائی دینے والی دنیا اور نہ دکھائی دینے والی دنیا،یعنی طلسم کی دنیا، Inter-penetrate کرتی ہیں۔ناول کی دنیا پیچیدہ ہوتی ہے۔اصول وضوابط کو سمجھا نہیں جاسکتا۔بلکہ بعض اوقات ان کا سرے سے وجود ہی نہیں ہوتا۔

3 داستان کی تصنیف کا مقصد سماجی معلومات فراہم کرنا نہیں ہوتا،جبکہ ناول کسی نہ کسی درجے میں ہمیں خارجی دنیا کی حقیقت سے روشناس کراتا ہے۔

4 داستان اور ناول کی شعریات میں ایک لطیف فرق انسان اور انسان کے علم کی حد اور نوعیت کے بارے میں ہے۔داستان میں علم دو طرح ظاہر ہوتا ہے۔ایک خدا کی

شعور کی داخلی حقیقت صرف ان اشیا کے سیاق و سباق میں وجود رکھتی ہے جن سے کہ شعور ٹکراتا ہے یا جن کا وہ سامنا کرتا ہے۔لہٰذا شعور ولاشعور کی پیچ در پیچ جگر کاوی کی اصل اس ماحول کے ذریعے ظاہر ہوسکتی ہے جس میں کوئی شخص یا وجود خود کو موجود پاتا ہے... کسی ناول کے مواد یا موضوع کا ذکر کرنا ناول کو اصناف فن کی فہرست سے خارج کرنے کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔کیونکہ فن نہ کسی چیز کا اظہار کرتا ہے،نہ کسی چیز کا مظروف ہوتا ہے۔فن اپنا توازن اور مفہوم آپ پیدا کرتا ہے۔

ہدایت ہے، جو لوح ،خواب، بشارت وغیرہ کے ذریعے ہوتا ہے اور دوسری طرح کا علم کہانت کے علوم کے ذریعے ظاہر ہوتا ہے۔مثلاً رمل، جعفر، نجوم، ارواح وغیرہ۔ علم کہانت کے ذریعے سے تو معلوم کرسکتے ہیں کہ مثلاً کسی بات کا انجام کس طرح ہوگا، مگر یہ معلوم نہیں کیا جاسکتا کہ یہ انجام کس طرح عمل میں آئے گا۔خدائی کا دعویٰ رکھنے والوں اور ساحروں وغیرہ پر خدائی ہدایت کے ذریعے نصیب ہونے والے علم کے دروازے بند ہوتے ہیں۔علم کی ان دونوں صورتوں میں یہ قدر مشترک ہے کہ انسان جو کچھ جانتا ہے یا جان سکتا ہے اس کے لیے کسی قسم کی امداد ضروری ہوتی ہے، یعنی ہمیں داستان میں انسانی علم کے محدود اور ناقص ہونے کا تصور ملتا ہے اسی لیے داستان میں ذہنی وقوعے بیان نہیں ہوتے۔کسی کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔یہ ہمیں معلوم نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ شخص ہمیں خود نہ بتائے۔جبکہ ناول اپنے کرداروں کے ذہنی کوائف جاننے اور بیان کرنے کا دعویٰ رکھتا ہے۔ ناول نگار تو 'عالم الغیب' ہوتا ہے، اس طرح ناول نگار/ راوی کو بہت بڑا منصب دیا گیا ہے کہ وہ ہر ڈھکی چھپی بات جانتا ہے۔ایک طرح سے ہم اپنی قوت فیصلہ اس کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔ناول سے ہمیں یہ توقع ہے کہ وہ انسانی صورت حال کے بارے میں ہمارے علم میں اضافہ کرے گا۔ناول کو دعویٰ ہے کہ وہ اپنے کرداروں کی اصل شخصیت کو شکار کرے گا۔داستان کے راوی کو مکمل عالم الغیب ہونے کی غلط فہمی نہیں ہوتی۔داستان میں انسانی علم صرف صورت (Appearance) کو جان سکتا ہے، معنی (Reality) کو نہیں جبکہ ناول معنی تک پہنچنے کا دعویٰ کرتا ہے۔

5 داستان اور ناول کی تشکیل کی نوعیت میں بنیادی فرق ہے۔داستان ناول کی طرح 'تصنیف' نہیں ہے۔ ناول کی تصنیف غور وخوض کرنے اور آہستہ آہستہ لکھنے اور لکھے ہوئے پر نظر ثانی کرنے کا تقاضا کرتی ہے۔داستان کے ساتھ فوری پن کا تصور وابستہ ہے۔ناول نگار کے پاس ایک معقول وقت ہوتا ہے اور اس کے قاری یہ بات بخوبی جانتے ہیں۔داستان گو داستان کا غلام بن جاتا ہے۔اسے طے شدہ وقت، ہر روز یا مقررہ وقفہ، پر داستان سنانا ہی پڑتی ہے۔اس طرح جتنی بار داستان سنائی جاتی ہے گویا اسے ہر مرتبہ 'تصنیف' کرنا پڑتا ہے۔اگر چہ داستان گو کے پاس ایک بنیادی قصہ موجود ہوتا ہے، لیکن وہ اس میں کمی بیشی اور رنگ آمیزی کرتا رہتا ہے اور داستان کا سلسلہ دراز ہوتا رہتا ہے۔

6 رتن ناتھ سرشار کہتے ہیں کہ ناول کے ساتھ انسان ذاتی تعلق قائم کرسکتا ہے، جب چاہا اٹھا کر پڑھ لیا، جبکہ داستان کو اس وقت سننا پڑتا ہے جب داستان گو سنا رہا ہو۔لیکن فاروقی اس کی بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ داستان کی فطرت ہی ایسی ہے کہ اس میں کہیں سے بھی داخل ہوا جاسکتا ہے۔کتاب کے معاملے میں مصنف کو کچھ اختیار نہیں، جبکہ داستان گو اور اس کے سامعین میں ہم آہنگی کا رشتہ ہوتا ہے۔

7 اسطور اور داستان 'تصنیف بے مصنف' ہوتی ہیں۔ یہ اجتماعی حافظے کی پیداوار اور اس کا اظہار ہوتی ہیں۔ ناول اپنے مصنف اور عصر کے شعور کا اظہار کرتا ہے۔جبکہ داستان بھی بطور زبانی بیانیہ اپنی تہذیب میں رائج تصورات حیات وموت، قضا وقدر وغیرہ کو زبان دیتی ہے اور تہذیب میں جاری تصورات کو ہم تک پہنچاتی ہے۔

8 واقعیت پر مبنی بیانیہ مثلاً ناول، بیانیہ کا ایک اسلوب ہے۔اسی طرح فوق الفطرت باتوں پر بیانیہ بھی بیانیہ کا اسلوب ہے۔دونوں اسلوب اپنی اپنی جگہ معتبر اور مکمل ہیں۔کسی ایک کا اطلاق دوسرے پر کرنا غلط تصور ہے۔

9 ناول کی ایک بڑی خوبی واقعات اور مناظر کی ندرت ہے۔نئی صورت حال اور نیا منظر دکھانے کے لیے ناول نگار مجبور ہے جبکہ زبانی بیانیہ کی ضرورت واقعات اور مناظر کی ندرت نہیں بلکہ ان کے بیان کی ندرت ہے ایک ہی طرح کے واقعات میں تنوع پیدا کرنا کمال ہے۔

مختصراً ناول کی شعریات کے متعلق یہ معروضات اور خیالات ونظریات شمس الرحمٰن فاروقی نے وقتاً فوقتاً پیش کیے ہیں جن کو راقم نے فاروقی کی تصانیف (ساحری، شاہی اور صاحب قرانی اور افسانے کی حمایت میں) اور دیگر ذرائع (مضامین، مکالمے اور انٹرویوز) سے کشید کرکے حتی الوسع مربوط پیرایہ میں ترتیب دینے کی کوشش کی ہے تاکہ ناول کی شعریات کے حوالے سے ان کا موقف سامنے آئے اور ساتھ ہی ناول اور داستان کی شعریات کے فرق وامتیاز کو فاروقی کے نقطۂ نظر سے پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔آخر میں شمس الرحمٰن فاروقی کے اس قول سے (جو انھوں نے بہ حوالہ روب گریے لکھا ہے) اس بحث کو سمیٹتا ہوں:

''شعور کی داخلی حقیقت صرف ان اشیا کے سیاق و سباق میں وجود رکھتی ہے جن سے کہ شعور ٹکراتا ہے یا جن کا وہ سامنا کرتا ہے۔لہٰذا شعور ولاشعور کی پیچ در پیچ جگر کاوی کی اصل اس ماحول کے ذریعے ظاہر ہوسکتی ہے جس میں کوئی شخص یا وجود خود کو موجود پاتا ہے... کسی ناول کے مواد یا موضوع کا ذکر کرنا ناول کو اصناف فن کی فہرست سے خارج کرنے کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔کیونکہ فن نہ کسی چیز کا اظہار کرتا ہے، نہ کسی چیز کا مظروف ہوتا ہے۔فن اپنا توازن اور مفہوم آپ پیدا کرتا ہے۔''16

حوالے

1 شمس الرحمٰن فاروقی، شعر، غیر شعر اور نثر، ص 260
2 سید علی کریم (مدیر)، فکر و تحقیق (سہ ماہی ناول نمبر) قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 16-2، صفحہ 10-9
3 علی احمد فاطمی، ناول کی شعریات، ص 18، عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی
4 شعر، غیر شعر اور نثر۔ ص 263
5 ایضاً، ص 265
6 ایضاً، ص 263
7 ایضاً، ص 266
8 شمس الرحمٰن فاروقی، ساحری، شاہی، صاحب قرانی، داستان امیر حمزہ کا مطالعہ، جلد اول، ص 85
9 شمس الرحمٰن فاروقی، ساحری، شاہی، صاحب قرانی، داستان امیر حمزہ کا مطالعہ، جلد اول، ص 22-21
10 ایضاً، ص 264
11 ایضاً، ص 282
12 ایضاً، ص 261
13 ساحری، شاہی، صاحب قرانی جلد اول، ص 87
14 شمس الرحمٰن فاروقی، افسانے کی حمایت میں، ص 165
15 شمس الرحمٰن فاروقی، کئی چاند تھے سر آسماں، ص 853
16 شعر، غیر شعر اور نثر، ص 270

■

Mohd Iqbal Lone
Urdu Section, Jammun & Kashmir Cultural Academy, Lalmandi
Srinagar- 190008 (J&K)
Mob.:7006538941

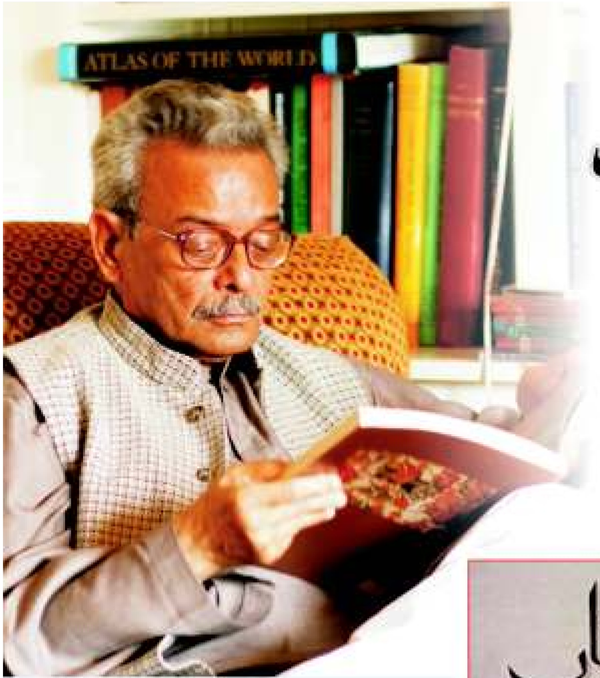

ہند اسلامی تہذیب وثقافت
اور فاروقی کا ناول
'کئی چاند تھے سرِ آسماں'

نورین علی حق

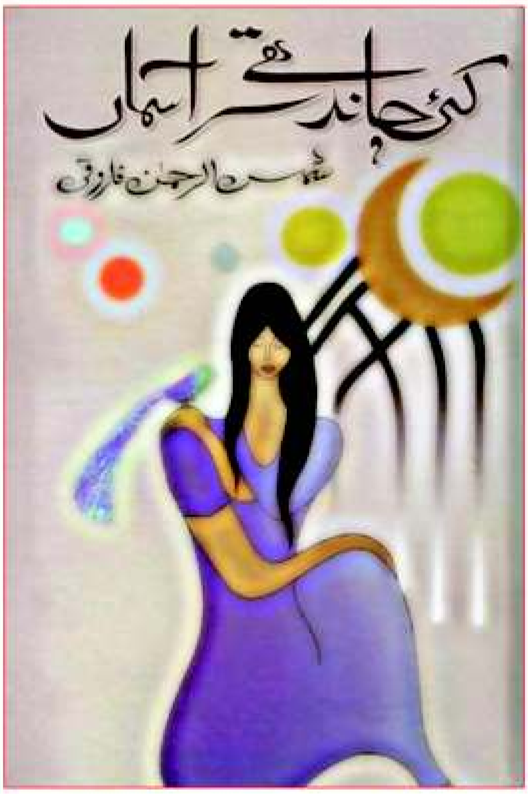

اکیسویں صدی کے اوائل میں شائع ہونے والے ناول 'کئی چاند تھے سرآسماں' نے گزشتہ دوصدیوں یعنی اٹھارہویں اورانیسویں صدی کی ہندوستانی تہذیب وثقافت اورفکری نہج کواپنے پیمانے میں سمیٹ لیاہے اور مذکورہ ان دوصدیوں کے گلاس میں باقی ماندہ تہذیبی تلچھٹ کے اثرات بیسویں صدی پربھی تھے، جو دیگر ادبی شاہپاروں اورناولوں میں نظر آتے ہیں، کئی چاند تھے سرآسماں پراکثرتازے ہوتے رہے ہیں،فاروقی کے مخالفین کئی چاند تھے سرآسماں کونصف تاریخی تو کچھ تاریخی ناول قراردیتے ہیں۔ شاید فاروقی کوموجودہ عہد کے ادبی رویوں کااحساس پہلے سے تھااس لیے انھوں نے خوداپنے ناول کے اظہار تشکر کے باب میں رقم کیاہے کہ:

''یہ بات واضح کردوں کہ اگرچہ میں نے اس کتاب میں مندرج تمام اہم تاریخی واقعات کی صحت کاحتی الامکان مکمل اہتمام کیاہے،لیکن یہ تاریخی ناول نہیں ہے۔اسے اٹھارویں۔انیسویں صدی کی ہنداسلامی تہذیب اورانسانی اورتہذیبی وادبی سروکاروں کامرقع سمجھ کرپڑھاجائے توبہترہوگا۔''(ص850)

فاروقی کا یہ بیان سوفیصددرست ہے کہ'کئی چاند تھے سرآسماں' بنیادی طورپراٹھارویں اورانیسویں صدی کا تہذیبی مرقع ہی ہے۔حالانکہ فاروقی یہ بات کہنے کے لیے بڑاعاجزانہ اسلوب اختیارکرتے ہیں،لیکن اس حقیقت سے انکارنہیں کیاجاسکتاکہ اردوناول کی تاریخ میں کئی چاند تھے سرآسماں کے علاوہ کوئی دوسرا ایسا ناول نہیں،جو اٹھارویں اورانیسویں صدی کی ہنداسلامی تہذیب اوراس کے عبرت ناک زوال کواس قدرمفصل اورمبسوط انداز میں بیان کرتا ہو۔ناول میں اٹھارویں اور انیسویں صدی کی تہذیب وثقافت،طرزفکر، شاعری، تصوف،فن موسیقی،فن عروض،سیاست،حکمرانی، ہندوستان سے مغل حکمرانی کے خاتمے کی جھلکیاں سب کچھ موجود ہے۔حیرت ہوتی ہے کہ اتنے وسیع کینوس کاناول فاروقی کس طرح لکھ سکے۔شاید یہ ان کے لیے اس لیے ممکن ہوسکاکہ انھوں نے اپنی پوری زندگی ادب اورادبی مطالعے میں صرف کی ہے۔

ناول کئی چاند تھے سرآسماں ہندوستان کی تہذیب وثقافت کوپیش کرتاہے۔ناول کے بیانیے اوراس کی جزئیات نگاری میں تہذیبی عکاسی کا بھرپورخیال رکھاگیا ہے اوراسی لیے کئی چاند تھے سرآسماں کودیگرناولوں پرتفوق وامتیاز حاصل ہے۔ناول کے مطالعے سے اٹھارویں اورانیسویں صدی کی طرز بودوباش، رہن سہن،کھان پان، چلت پھرت، آداب مجلس، آداب مے نوشی، آداب آمد و رفت، آداب گفتگو، چھوٹوں پرشفقت اور بڑوں کی عزت، ملازمین اور نوکروں کے آداب، خواتین کے سفرکاطریقہ،نوابوں اور بادشاہوں کی نشست وبرخاست کاطریقہ یہ سب اس ناول کا اختصاص ہیں۔نواب شمس الدین احمد خان جب وزیرخانم کے گھرپہنچتے ہیں تووزیرکس طرح استقبال کرتی ہے۔ملاحظہ کریں۔

''نواب صاحب پوری شان سے اترے،صدر دروازے پروزیرنے خودتعظیم کی،جھک کرمبارک سلامت کہا،چاندی کے گلاب پاش سے ان کے کپڑوں پرہلکے عطرکی پھوارڈالی، گلے میں ہارڈالااورکہا:اے آمدنت باعث دل شادی ما۔زہے نصیب کہ آپ کے قدم اس حقیرکفش خانے تک پہنچے،ہم تہانشینوں کانصیبہ جاگا۔بسم اللہ تشریف لائیے۔''(ص270)

استقبال کایہ طریقہ ناول میں متعددجگہ مل جائے گا۔ولیم فریزرکے گھرمشاعرے میں جب وزیرخانم پہنچتی ہے توولیم فریزربھی اس کااستقبال'اے آمدنت باعث دل شادی ما' کہہ کرکرتاہے۔یہ طریق کارخالص ہنداسلامی تہذیب کاحصہ تھا۔مسلم حکمرانی کے زوال پذیرعہد کے آداب پڑھ کردل خوش ہوجاتاہے۔اس عہد کے آمد و رفت کے آداب سے انسان متاثرہوئے بغیرنہیں رہتا۔ مرزافخرووزیرخانم کی تصویردیکھنے کے بعدامام بخش صہبائی کوطلب کرتے ہیں۔طلب کرنے کاانداز بھی نرالا ہے

اوراس میں بھی ہنداسلامی تہذیب کی ندرت نمایاں ہے۔

''اگلی صبح کومولوی صہبائی ابھی چاشت کی نماز سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ صاحب عالم وعالمیان کاایک چوبدار ایک کوزے میں ٹھنڈادودھ اورایک کوری ہانڈی میں گرم گلاب جامنیں اوردوسری ہانڈی میں مال پوے لے کرمولوی صاحب کے دروازے پرپہنچاکہ صاحب عالم نے ناشتہ بھجوایاہے اورارشادفرمایاہے کہ مولانا صاحب بشتاب حویلی مبارک میں صاحب عالم وعالمیان مرزامحمد سلطان غلام فخرالدین بہادر کے ایوان خاص میں تشریف لے آویں۔چوبدارکوتوانعام دے کررخصت کیاگیااورصہبائی دوگھڑی بعد برآمد ہوکر قلعے کے لیے سوار ہوئے۔''(ص722)

بادشاہ زادے کااس طرح صہبائی صاحب کوطلب کرنانہ صرف یہ بتاتا ہے کہ صاحب عالم اورمولاناصہبائی میں کتنی قربت تھی اس اقتباس سے یہ بھی ظاہرہوتاہے کہ اٹھارویں اورانیسویں صدی میں کسی شخص کواپنے کسی کام کے لیے طلب کرنے کاطریقہ کیاتھا۔لین دین کایہ سلسلہ ناول میں بیشتر مقامات پرمل جائے گا۔اس اقتباس میں مولاناصہبائی کے لیے ہی صرف ناشتہ نہیں آیابلکہ ناشتہ لانے والے چوبدارکو مولانا صہبائی انعام سے بھی نوازتے ہیں۔ناول کاہرصفحہ ہنداسلامی تہذیب کاعکاس ہے۔جگہ جگہ تہذیبی رفعت نظرآتی ہے۔ناول کی قرأت سے اٹھارویں اورانیسویں صدی کی طرزمعاشرت کابخوبی اندازہ ہوجاتاہے۔قلعہ معلی سے لے کرشاہ جہاں آباد کے عوام وخواص کی معاشرت آنکھوں میں سماجاتی ہے۔ ایک طرف ناول جہاں بادشاہ اورنوابوں اورعملی طورپر ہندوستان کے حکمراں انگریزوں کی زندگی کوبیان کرتاہے تودوسری جانب عوام اورپیشے کےاعتبار سے نچلے طبقے کے یوسف سادہ کاراوران کے خاندان کوبھی بیان کرتاہے۔ وزیرخانم کے لیے مرزافخروکارشتہ لے کرمولاناصہبائی جب مولوی محمدنظیررفاعی مجددی یعنی وزیرخانم کے بہنوئی کے گھرپہنچتے ہیں تووہاں کس طرح پردے کاخیال رکھاجاتا ہے۔وہ قابل ذکرہے۔

''بندگی سرکار۔پردہ کرالیں۔مولاناصہبائی صاحب اوران کی بیگم تشریف لائے ہیں۔بڑی بیگم کچھ گھبراکر اٹھیں۔مولوی صہبائی صاحب کی بیگم توبہت کم کہیں آتی جاتی تھیں،آج کوئی خاص بات ہوگی۔انھوں نے نواب مرزاسے کہا:بیٹے توجلددیوان خانے میں مولوی صاحب کوبٹھا،ان کی خوب تعظیم کیجو۔تیرے خالو صاحب شاہ صاحب کے یہاں گئے ہیں،آتے ہی ہوں گے۔اتنے میں تومولوی صاحب سے باتیں کر،میں ابھی بھنڈااورپان بھیجتی ہوں اورچل،توجلد یہاں سے ہٹ کہ میں پردہ کراؤں۔

نواب مرزاتوٹوپی،کرتا،درست کرتا ہوابھاگ کر مردانے دروازے پرگیااورمولوی صاحب کوسلام کرکے ہوادار سے اتارکر بصدتکریم دیوان خانے میں لے آیا۔ اس درمیان اندرسے آوازآچکی تھی کہ پردہ ہے اوربیگم صہبائی صاحب کی پالکی زنانہ دروازے پرلگادی گئی تھی اورچادرکاپردہ چاروں طرف کھنچوادیاگیاتھا۔ڈیوڑھی کے پردے کے پیچھے بڑی بیگم نے ان کااستقبال کیا،اہتمام کے ساتھ آنگن کے پاراندرونی دالان میں لائیں اور انھیں صدر میں بٹھایا۔تشریف آوری کی غایت پوچھنا خلاف تہذیب تھا۔مہمان کواظہارمدعامیں کتنی ہی دیرلگتی، میزبان کوانتظارکرناپڑتااوربظاہروہ مہمان کی غیرمتعلق باتوں پراس قدرمتوجہ رہتاگویامہمان کی آمدصرف معمولی ملاقات اوردیدوادید کی غرض سے ہے۔''(ص751-750)

اقتباس میں ہنداسلامی تہذیب کی کئی جھلکیاں موجود ہیں کہ خواتین پالکی میں ہی چلتی تھیں،چھوٹی بیگم بڑی بیگم یامنجھلی بیگم کوبھی ایک دوسرے کے گھرآناجاناہوتا تووہ بھی پالکی کا استعمال کرتی تھیں۔گھرمیں آنے والی خواتین کے لیے بھی گھرکے مردوں سے پردہ کرانالازمی تھا،لڑکوں کابچپن اورلڑکپن ٹوپی اورکرتے پجامے میں ہی گزرتاتھا۔گھرمیں اگرکوئی بڑاموجودنہ ہواورکوئی مہمان آن پڑے توخواتین اس کااستقبال نہیں کرتی تھیں،اپنے بچوں کونصیحت کرکے مہمان کے استقبال کے لیے انھیں بھیجتیں،مہمان سے آمدکامقصددریافت کرناخلاف تہذیب تھا۔یہ وہ تہذیبی رفعتیں ہیں،جواس عہدکوموجودہ عہد سے ممتازکرتی ہیں۔

کئی چاندتھے سرآسماں کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ ناول تہذیبی جھلکیاں اورجزئیات نگاری کے کسی موقع کوہاتھ سے جانے نہیں دیتا،لیکن تہذیبی جھلکیوں کی بھرپورعکاسی اورجزئیات نگاری کی بہتات کے باوجود ناول کے اصل قصے پرکوئی منفی اثربھی نہیں پڑتا۔مولوی محمدنظیررفاعی مجددی کاتعارف کراتے ہوئے فاروقی سلسلہ رفاعیہ کے راتب اوررسوم کوبھی بیان کرتے ہیں۔ ناول میں جس طرح اٹھارویں اورانیسویں صدی کے تمام اہم شعراکاتذکرہ ہے اسی طرح مذکورہ دوصدیوں میں پائے جانے والے صوفیااورماقبل کے بھی اہم ہندوستانی صوفیاکابھرپورتذکرہ ہے۔کئی جگہوں پرحضرت خواجہ معین الدین چشتی،حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، حضرت بابافریدالدین گنج شکراورخواجہ نظام الدین اولیا کابھی ذکرآیاہے۔

کئی چاندتھے سرآسماں کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ ناول تہذیبی جھلکیاں اورجزئیات نگاری کے کسی موقع کوہاتھ سے جانے نہیں دیتا،لیکن تہذیبی جھلکیوں کی بھرپور عکاسی اورجزئیات نگاری کی بہتات کے باوجود ناول کے اصل قصے پر کوئی منفی اثربھی نہیں پڑتا۔

ولیم فریزرکے گھرپرمنعقدشعری نشست میں مرزا غالب کی غزل پرداد کی برسات دیکھ کرفینی پاکس سوچتی ہے کہ''میرے ملک میں توشیکسپیئر کے ڈرامے پربھی لوگوں کی یہ حالت نہیں ہوتی۔سچ ہے اہل ہندکی تہذیبی بناہی شاعری پرقائم ہے۔''(ص259)

اس فکرکی تصدیق کرتے ہوئے فاروقی نے پورے ناول میں جگہ جگہ شعری اہمیت کااحساس کرایاہے کہ ہندوستانی سماج،معاشرے اوراس کی تہذیب میں شعری جڑیں کافی گہرائی تک پیوست ہیں۔اٹھارویں اور انیسویں صدی کے اکثرقابل ذکرشعراکاکسی نہ کسی طور ذکراس میں موجود ہے۔وزیرخانم،نواب شمس الدین احمد خان اوران کے بعدآغامرزاتراب علی اورنواب مرزاداغ کی آپسی گفتگومیں عموماشعری ذوق کی پختگی کااحساس ہوتا ہے۔ان کے مابین شعرپیش کرناایک عام بات ہے۔اس طرح اس ناول میں سیکڑوں فارسی اور اردو کے کلاسکی اشعاربھی درج ہیں۔وزیرخانم اورشاہ نصیرکی استادی وشاگردی کے مناظرکوپیش کرتے ہوئے فاروقی نے عروضی بحثیں بھی کی ہیں۔

ناول میں ہندومسلم اتحاداوریگانگت کوبھی دکھایاگیا ہے۔ہندومسلم اتحاداورآپسی بھائی چارہ اورمحبت کاایک منظردل ونظرمیں کھب جاتاہے،جہاں وزیرخانم شمس الدین احمدخان کی طرف پیش رفت سے پہلے پنڈت نندکشورکواپنے گھرمدعوکرتی ہے اوران کی تشریف آوری کابہترین انتظام کرتی ہے،جب وہ آتے ہیں تووہ اس معاملے میں لسان الغیب حافظ کے دیوان سے فال نکالتے ہیں۔سکھ مسلم اتحادکامظاہرہ اس وقت ہوتاہے، جب شمس الدین احمدخان کودہلی طلب کیاجاتاہے اورایسا خدشہ درپیش ہوتاہے کہ وہ دہلی میں ولیم فریزرکےقتل کے الزام میں گرفتارکرلیے جائیں گے۔اس وقت پنجاب کاایک سکھ انھیں کہتاہے کہ آپ پنجاب چل چلیں وہاں

سے آپ کو گرفتار کرنا حکومت انگریز کے لیے آسان نہیں ہوگا۔ کئی چاند تھے سرِآسماں بنیادی طور پر تہذیبی ناول ہے۔اس میں ایک طرف اتحاد و یگانگت کا مظاہرہ ہوتا ہے تو دوسری جانب ہندوستان کی مغل حکمرانی کے زوال وانحطاط اور ٹوٹتی بکھرتی مغل تہذیب کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ زوال آمادہ عہد میں ہندوستانیوں کی فکری سطحیت اور انگریزوں کے بڑھتے قدم بھی قارئین کو پریشان کرتے ہیں۔ ہندوستانی تشخص اور تحفظ کو انگریزوں کی آمد نے پارہ پارہ کر دیا تھا۔ لیوان ریلیشن کا تصور بھی اس ناول میں موجود ہے۔

اٹھارویں انیسویں صدی کی دلی میں عمومی طور پر گھروں کے باہر چوبدار، لٹھیت، برچھیت اور دربان ملازم ہوتے تھے، جو آنے والوں کی آمد کی اطلاع پہلے گھر والوں کو دیتے اور اجازت ملنے کے بعد انھیں اندورن خانہ جانے کی اجازت دیتے۔ گھروں میں مامائیں، اصیلیں، کنیزیں اور باندیاں بھی ہوا کرتی تھیں، جو گھریلو کام کرتی تھیں۔ آنے والا اگر کوئی خاص مہمان ہوتو اسے ملازم جوتے پہناتے۔ ملازم اپنے مالکوں کو تین اور سات سلام کرتے۔ مہمانوں کی تواضع کے لیے بھنڈے، پان، شربت، عطر وغیرہ کا انتظام گھر میں ہوتا تھا۔ ٹوٹتی پھوٹتی تہذیب اور تہذیبی اثرات کو فاروقی نے کئی چاند تھے سرِآسماں میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ناول جس عہد کو محیط ہے، اسی عہد کے فاروقی بھی ہیں، اس کے باوجود فاروقی اس عہد کی کسی تہذیبی عکاسی سے چوکتے نہیں۔ فنون لطیفہ سے بھی فاروقی کو بخوبی واقفیت اور دلچسپی ہے۔ وہ مخصوص اللہ کی شبیہ سازی کی باریکیوں اور ندرتوں پر پینی نظر رکھتے ہیں تو مخصوص اللہ کے پوتوں داؤد اور یعقوب کی گائیکی اور موسیقی کو بھی پوری دلچسپی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ فاروقی شبیہ سازی، قالین بافی کے فن کو بیان کر رہے ہوں یا موسیقی کے فن کو وہ کسی بھی فن کو چھو کر گزر نے کے قائل نہیں، جس فن کو وہ موضوع بحث بناتے ہیں اس پر تسلی اور اطمینان کی حد تک اپنے علم کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔

''اس اثنا میں تینوں سنتور آہستہ آہستہ بجنے لگے تھے۔ بیٹوں نے پھر سے طاؤسوں کو چھیڑا، جب سب سرمل گئے تو دونوں نے سرو قد کھڑے ہو کر حضار محفل کو سلام کیا، باپ کے قدم دوبارہ لیے اور کہا:

عالی جاہا، ہمارے نصیب کی بلندی ہے کہ ایسی والا شان وصفات مجلس میں اپنے والد گرامی کی موجودگی میں کچھ ٹوٹا پھوٹا کہنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔ درخواست ہے کہ ہمارے عیوب پر آشفتہ نہ ہوں، بنظر اصلاح ملاحظہ فرمائیں:

''اللہ اللہ، عزیزان گرامی ارشاد فرمائیں۔ سب ہمہ تن گوش ہیں'۔ کسی بزرگ نے جواب دیا۔

بے شک، اب تاب انتظار نہیں۔ بسم اللہ، ایک اور آواز آئی۔

دریں اثنا سہ تاروں کی صدا میں سنتور کی گنگناہٹ شامل ہو کر بلند ہوئی۔ محمد داؤد نے راگ چاندنی کدارا میں الاپ شروع کیا۔ پھر یعقوب نے کہا: حضرت سلطان ابوسعید ابی الخیر کی رباعی ہے، گوش ہوش کا متمنی ہوں۔ سب ذرا اور سنبھل کر بیٹھ گئے۔ یعقوب نے گانا شروع کیا۔

جز دررہ عشق تو نہ پوید ہرگز
دل رازترا بہ کس نہ گوید ہرگز
صحرائے دلم عشق تو شورستاں کرد
تامہر کسے دگرنہ روید ہرگز

پہلا مصرعہ کہہ کر محمد یعقوب نے توقف کیا، محمد داؤد نے الاپ کو اور اونچا کیا، پھر دوسرا مصرعہ ہلکے سروں میں ادا کیا۔ اب دونوں کی جگل بندی شروع ہوئی۔ عام طور پر جوڑے میں گانے والوں میں ایک کی آواز ہلکی یا پست اور دوسرے کی آواز بھاری یا اونچی ہوتی ہے۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی عجب تھا۔ دونوں کی آوازیں متوسط تھیں اور آپس میں اس قدر مشابہ تھیں اور دونوں کا ریاض اتنا پختہ تھا کہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ کس نے الاپ لی اور کس نے انترے سے استھائی میں قدم رکھا۔'' (ص 124-125)

اس اقتباس میں فاروقی نہ صرف یہ کہ آلات موسیقی سے اپنی واقفیت کا اظہار کر رہے ہیں بلکہ الاپ، راگ اور راگوں کی متعدد قسمیں بھی وہ بیان کرتے ہیں۔ دادرا، ٹھمری، خیال، یمن، بسنت، بہار، باگیسری اور کھتریوں اور چرواہوں کی دھنیں جیسے چیتی، بناری وغیرہ کا بھی ذکر بڑی بیگم، منجھلی بیگم اور چھوٹی بیگم کے حوالے سے آیا ہے۔

ناول کئی چاند تھے سرِآسماں میں تہذیبی جھلکیاں پوری طرح موجود ہیں، ناول نگار کی کوشش کامیاب ہے کہ ان دو صدیوں کی پوری تہذیب، ثقافت، تمدن اور فکری جہتیں نکھر کر سامنے آگئی ہیں۔ ادبی اور سماجی تہذیب سے لیس یہ ناول اپنی مثال آپ ہے۔ اس ناول کا راست تعلق اٹھارویں اور انیسویں صدی کی سیاست، تہذیب، ادب، طرز معاشرت، معاشرت کی بدلتی تصویریں، تبدیل ہوتے ہندوستانی رجحانات ومزاج، ہندوستان سے کمزور ہوتی مغل حکمرانی، اس کے اسباب وعلل، انگریزوں کے بڑھتے قدم، ہندوستان پر ان کے مضبوط ہوتے شکنجے، ہندوستانی معاشرت اور تہذیب کے رنگ میں انگریزوں کے رنگنے کی تاریخ، ہندوستانیوں میں انگریزوں کے خلاف باغیانہ تیور، ہوا کا رخ دیکھ کر اوباکی انگریزوں سے بڑھتی قربت، ہندوستانی سماج ومعاشرت کی تفہیم کے لیے انگریزوں کی کوشش، ہندوستان اور ہندوستانیوں پر عرصۂ حیات تنگ کرنے کے لیے انگریزوں کی سیاسی تدبیر، شاہ اور ولی عہد سے خفیہ معاہدے۔ کئی چاند تھے سرِآسماں بظاہر وزیر خانم کی زندگی کے گرد گھومتا اور طواف کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ لیکن وزیر خانم کے بہانے مصنف نے اس عہد کے بیشتر قابل ذکر موضوعات کو بصراحت روشن کیا ہے۔ مصنف نے اس عہد کی زبان کو بھی اپنے موضوع کے دائرے میں شامل کر لیا ہے۔ کئی چاند تھے سرِآسماں ایک مخصوص عہد کی تاریخ کو پیش کرتا ہے، لیکن یہ ناول تاریخ کے لفظ کو اس کے وسیع تر تناظر میں دیکھتا اور اس عہد کی ہر چیز اور ہر قابل ذکر شے کو موضوع بحث بناتا ہے۔ کئی چاند تھے سرِآسماں کے مطالعے سے کسی بھی تاریخی کتاب کی طرح صرف اس عہد کی سیاسی تاریخ کا علم نہیں ہوتا بلکہ اس کے مطالعے سے سیاست، تہذیب، ادب، ادبی تاریخ، ٹھگی، گنگا جمنی تہذیب، مشترکہ ثقافت، سیاسی، تہذیبی، سماجی، مالی واقتصادی، علمی وفکری عروج سے زوال کی طرف گامزن ہونے کی تاریخ بھی پتہ چلتی ہے۔ بسی بسائی دہلی نوآبادکاروں کے شکنجے سے آزادی کے لیے 1857 میں اجڑ گئی۔ ایسے دہلی کے اجڑنے اور بسنے کی تاریخ بھی عجیب وغریب ہے۔ دہلی عموماً یکساں صورت پر باقی نہیں رہتی۔ اس نقطہ نظر کے ساتھ اگر دیکھا جائے، جس نقطہ نظر کے ساتھ فاروقی دلی کو دیکھتے اور دکھاتے ہیں تو ہمیں یہ ماننا ہوگا کہ دہلی کے اجڑنے کا سلسلہ تو انگریزوں کی عملی حکمرانی اور مغل سلطنت کے عملی زوال کے ساتھ ہی شروع ہو چکا تھا۔ چونکہ دلی صرف ایک شہر نہیں دلی ایک دبستان ہے، دہلی تہذیب کا ایک نمائندہ شہر ہے، دہلوی ثقافت کا انحطاط ہی دراصل دلی کا زوال ہے اور یہ کام انگریزوں کے عملی طور پر ہندوستان کا حکمراں بننے کے ساتھ ہی شروع ہو چکا تھا۔ ہاتھی گھوڑوں پر مع جلوس گلیوں میں گھومنے کا رواج عموماً مغلوں کے یہاں نہیں پایا جاتا تھا لیکن انگریز ولیم فریزر گلیوں میں ہاتھی پر گھومتے تھے اور کسی وزیر خانم کے گھر پیشگی اجازت کے بغیر ہی پہنچ جاتے تو کبھی برسرِعام نواب شمس الدین سے ان کی بہن کا ہاتھ مانگ لیتے تھے۔ یہ سوچے بغیر کہ ہندوستانیوں کی بھی کوئی عزت اور وقار ہے۔

ایسی زوال آمادہ صورت حال کا استعارہ فاروقی

کو وزیر خانم میں اور وزیر خانم کی زندگی کی بے سروسامانی اور بے بسی کا استعارہ مغلیہ سلطنت میں مل گیا، جس طرح وزیر خانم اپنی زندگی اور نصیبے کو بیاطن رو رہی تھی، اسی طرح مغل سلطنت بھی اپنے روشن وتابناک ماضی اور ناگفتہ بہ صورت حال پر ماتم کناں تھی۔

''اگلے دن مغرب کے بعد قلعۂ مبارک کے لاہوری دروازے سے ایک چھوٹا سا قافلہ باہر نکلا۔ ایک پالکی میں وزیر، ایک بہل پر اس کا اثاث البیت اور پالکی کے دائیں بائیں گھوڑوں پر نواب مرزا خان اور خورشید میرزا۔ دونوں کی پشت سیدھی اور گردن تنی ہوئی تھی۔ محافظ خانے والوں نے روکنے کے لیے ہاتھ پھیلائے تو میرزا خورشید عالم نے ایک ایک مٹھی اٹھنیاں چونیاں دونوں طرف لٹائیں اور یوں ہی سر اٹھائے ہوئے نکل گئے۔ ان کے چہرے ہر طرح کے تاثر سے عاری تھے لیکن پالکی کے بھاری پردوں کے پیچھے چادر میں لپٹی اور سر جھکائے بیٹھی ہوئی وزیر خانم کو کچھ نظر نہ آتا تھا۔'' (ص 848)

اس اقتباس کا آخری جملہ بڑا ہی معنی خیز ہے۔ اس کے باوجود یہ کہا جاسکتا ہے کہ وزیر خانم کو کچھ نظر آرہا ہو یا نہ آرہا ہو، بہرحال وہ اپنے گھر یعنی نواب شمس الدین کے دیے ہوئے گھر تک تو پہنچ ہی گئی ہوگی لیکن مغل سلطنت جب قلعہ مبارک سے باہر کی گئی تو اس کے لیے کہیں جائے اماں نہ مل سکی اور بہادر شاہ ظفر، ملکہ اور ان کے صاحبزادگان پیدل ہمایوں کے مقبرے تک پہنچے تھے اور انھیں کچھ بھی کہیں نظر نہ آیا حتی کہ خود آخری مغل تاجدار کو ضعیفی کی حالت میں ننگے تختے پر بیٹھ کر رنگون تک کا سفر کرنا پڑا اور بے بسی وغربت میں کوئے یار میں دو گز زمین کی تمنا لیے جاں جان آفریں کے سپرد کرنا پڑی۔

کئی چاند تھے سرآسماں کا موضوع بظاہر وزیر خانم اور اس کی زندگی ہے لیکن وزیر خانم اور اس کی زندگی کو پیش کرتے ہوئے مصنف نے اٹھارویں اور انیسویں صدی کے پورے ہندوستان، انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں کے جذبے، دہلوی تہذیب وتمدن، مذکورہ دو صدیوں کی کوثر وسلسبیل سے دھلی دھلائی زبان، نوابیت و بادشاہت، ہندوستانیوں کے رنگ وآہنگ، مزاج واطوار سب کو موضوع بنالیا ہے۔ اس لیے ناول کا کینوس خاصا وسیع اور دلکش ہوگیا ہے۔

کئی چاند تھے سرآسماں اپنے اسلوب اور انداز تحریر کے اعتبار سے بلا مبالغہ اکیسویں صدی کا سب سے اہم اردو ناول ہے۔ اکیسویں صدی کے ہندوپاک میں ایسا اسلوب بس کئی چاند تھے سرآسماں کا یک وتنہا اسلوب ہے اور دور دور تک سناٹا ہے۔ چونکہ ایسے اسلوب کی تخلیق کے لیے قرآن پاک کی آیتوں کا علم، جگر کاوی، دہائیوں پر مبنی اردو، عربی، فارسی اور انگریزی کا مطالعہ، تصوف کے اعلی پائے اور ماخذ کی حیثیت رکھنے والی کتابوں پر گہری نظر، فارسی واردو کے کلاسیکی شعرا کے دواوین کی قرأت، فن عروض وتقطیع کی مہارت، عربی محاورات سے دلچسپی، صوفیائے کرام کے حالات زندگی اور اقوال پر نظر، ہندستان میں انگریزوں کی تاریخ، اٹھارویں وانیسویں صدی کے ہندوستان کی بھرپور واقفیت، اس عہد کے علما، شعرا، ادبا اور دانش وروں کے تذکروں پر نظر، کم از کم دہلی کے جغرافیہ کی واقفیت، باڑہ ہندوراؤ، پہاڑی، ہندوراؤ اسپتال اور پرانی دلی کی دیگر گلیوں اور محلوں کا مشاہدہ، خانوادۂ فرنگی محل اور خانوادۂ ولی اللہی اور ان خانوادوں کی اہمیت اور علمی فروغ میں ان کے کردار سے واقفیت کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ تقاضا فاروقی نے پورا کیا ہے، یہ انسائیکلوپیڈیائی علم اور واقفیت کئی چاند تھے سرآسماں کے اسلوب کو منفرد، ممتاز اور یکتا بناتی ہے اور بات پھر بھی بنتی نہیں کہ جب تک اٹھارویں اور انیسویں صدی کی زبان کی واقفیت نہ ہو۔ مجھے لگتا ہے کہ اس ناول کی زبان سب سے قیمتی شے ہے، جو اسے باقی رکھے گی۔ یہ خوش کن حیرت کی بات ہے کہ دو صدیاں پیچھے جا کر ایک انسان اس سماج، معاشرے اور اس میں رائج زبان کو لکھے۔ کم از کم اردو ناول کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے۔

اس ناول کا بیانیہ رواں دواں اور جدید عہد کی تراکیب سے بنا گیا ہے، اس کی تراکیب کی بنت فارسی تراکیب پر مبنی نہیں ہیں۔ البتہ درمیان میں ایسے الفاظ ضرور آتے ہیں، جن کا رواج اکیسویں صدی میں عمومی طور پر نہیں ہے، وہ اسمائے معرفہ (Proper nouns) جن کا رواج اٹھارویں اور انیسویں صدی میں تھا، لیکن اب یعنی اکیسویں صدی میں نہیں ہے۔ ایسے اسما سیکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں آئے ہیں، جن کی توضیحات وتشریحات عام فہم لغات میں میسر نہیں لیکن وہ ناول کی قرأت میں مانع نہیں ہوتے، سیاق وسباق سے مفہوم ادا ہوجاتے ہیں۔ انسانی فہم اپنا کام کرجاتی ہے۔ جیسے بندوقوں کی بہت سی قسموں کا تذکرہ فاروقی نے اپنے ناول میں کیا ہے اور ان کی تشریح بھی کردی ہے، اکیسویں صدی میں لفظ بندوق کے علاوہ بندوقوں کی کسی بھی قسم کا اردو نام شاید ہے ہی نہیں تو ہم ان کی تشریح کو سمجھنے سے بھی عاری ہی رہتے ہیں۔ بہت سے ایسے مقامات ہیں، جہاں فاروقی نے اٹھارویں اور انیسویں صدی میں رائج محاورات کا استعمال کیا ہے تو اس کی تشریح بھی کردی ہے، جس سے بیانیے اور مکالمے کی تفہیم آسان ہوگئی ہے۔ ولیم فریزر کی ہفوات کے بعد نواب شمس الدین احمد خان، جب فریزر کی کوٹھی پر پہنچے تو اس وقت کا یہ مکالمہ دیکھیں۔

''ہماری کیا مجال جو پھاٹک نہ کھولیں لیکن صاحب کلاں بہادر سکھ کر گئے ہیں۔ ان کے حکم کے بغیر ہم کسی کو اندر نہ آنے دیں گے۔'' (437)

اس سے آگے فاروقی بڑے عالمانہ انداز میں سکھ کر گئے ہیں، محاورے کی تشریح بھی کرتے ہیں اور اپنی تشریح کو بیانیے کا جزو بھی بنادیتے ہیں۔

''سکھ کر گئے ہیں، کا فقرہ شمس الدین احمد کے کانوں میں تیزاب بن کر ٹپکا۔ 'سو جانے' کے لیے یہ محاورہ صرف بادشاہ ذی جاہ کے لیے بولا جاتا تھا۔ دوسروں کے لیے مناہی نہ تھی، لیکن ایک رسم سی بن گئی تھی اور قلعے کے باہر یہ محاورہ رائج بھی نہ تھا۔ اس دو ٹکے کے مجہول النسب فرنگی کی یہ مجال کہ ہمارے بادشاہ دیں پناہ کے لیے جو فقرہ استعمال ہوتا ہے اسے یہ ہتھیالے! ملک تو یہ لوگ لیے ہی جارہے ہیں۔ اب ہمارے خاص روزمرے اور محاورے بھی اپنے اوپر صرف کرنے لگے۔ (ص 437)

کئی چاندتھے سرآسماں اپنے اسلوب اور انداز تحریر کے اعتبارسے بلامبالغہ اکیسویں صدی کاسب سے اہم اردو ناول ہے۔اکیسویں صدی کے ہندوپاک میں ایسا اسلوب بس کئی چاندتھے سرآسماں کا یک وتنہا اسلوب ہے اور دور دور تک سناٹاہے۔

فاروقی کے اسلوب کی ایک بڑی خصوصیت ناول کئی چاند تھے سرآسماں کے حوالے سے یہ بھی سامنے آئی ہے کہ وہ خود اپنی عبارت کی تشریح بھی ناول کے متن میں داخل اور شامل کرلیتے ہیں۔ ایسا متعدد مقامات پر ہوا ہے۔ لیکن اس کا کوئی منفی اثر ناول کے متن پر نہیں ہوتا۔ فاروقی جتنی توجہ ناول کی قصہ گوئی اور جزئیات نگاری پر مرکوز رکھتے ہیں۔ اتنی ہی توجہ اسلوب اورزبان وبیان پر بھی دیتے ہیں۔ بیک وقت وہ اپنی نگاہیں ناول کے تمام عناصر پر رکھتے ہیں۔ ناول کا کوئی پہلو ان کی توجہ سے محروم نہیں رہ پاتا۔

کئی چاند تھے سرآسماں میں فارسی اور عربی زبان کے بھی کافی اثرات ہیں۔ ناول میں فارسی کے بہت سے اشعار درج ہیں۔ فارسی میں لکھے گئے خطوط بھی موجود ہیں۔ ناول کے ابواب کے بہت سے عناوین فارسی اشعار کے مصرعوں پر مبنی ہیں۔ آپسی گفتگو کو آگے بڑھانے اور

گفتگو کا لطف دوبالا کرنے کے لیے بھی فارسی اشعار کا سہارا لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن پاک کی بہت سی آیتیں بھی موقع ومحل کے مطابق درج کی گئی ہیں۔ عربی محاورات خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں، جن کی موجودگی کی وجہ سے فاروقی کا ناولانہ اسلوب مزید نکھر گیا ہے، ناول کے متن میں رنگارنگی پیدا ہوئی ہے اور خصوصی طور پر ناول کے مکالموں کا معیار قابل رشک ہوگیا ہے، جس سے اس عہد کے لسانی ذوق کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ عربی کے محاورات ایسے نہیں ہیں، جنھیں پڑھ کر کہہ دیا جائے کہ بس کہیں سے مل گیا اور فاروقی نے اپنی عبارت میں چسپاں کردیا، محاورات ایسے ہیں، جنھیں پڑھ کر اردو، فارسی کے ساتھ فاروقی کی عربی پر عمیق نظر کا اندازہ ہوتا ہے اور ناول کے متن میں جو شگفتگی، شائستگی، لطافت، ندرت اور سہ لسانی مٹھاس پیدا ہوئی ہے وہ تو اپنی جگہ، ناول کی عبارت میں ان محاورات کے استعمال کی برجستگی سے اندازہ ہوتا ہی نہیں کہ جو متن ہم پڑھ رہے ہیں، وہ کسی غیر عربی داں کا ہے، ایسا لگتا ہے کہ ناول نگار نبض شناس مزاج عربی ہے۔ کئی چاند تھے سرآسماں میں صرف قرآنی عربی محاورات نہیں ہیں، ایسے محاورات بھی ہیں، جنھیں عربی کے فکشن نگار اور شعرا استعمال کرتے ہیں۔ لیس بین الموت والفراق فرق (ص730) شبابیات کے شعرا عموی طور پر اس طرح کے محاوروں کا استعمال کرتے ہیں۔ اس مفہوم کے اردو میں بہت سے اشعار موجود ہیں، لیکن فاروقی نے ان اشعار کا استعمال نہیں کیا، وہ عربی کے محاورات لاتے ہیں اور یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے ہند اسلامی معاشرے میں زبان وبیان کے حوالے سے کیا ترجیحات تھیں اور اس سے عوام وخواص دونوں کو کتنی رغبت تھی، ظاہر ہے کہ اس اظہار کے ساتھ فاروقی کے قاری کو لطف زبان سے جس طرح آشنائی ہوتی ہے۔ وہ خود بڑی قیمتی شے ہے۔

اذاحاق القضاضاق القضا

الانتظار اشدمن الموت

کل عام وانتم بخیر

البحرلایخاف من السرق

الفضل للمتقدم

نورالقمرمستفیدمن الشمس

مذکورہ بالاتمام محاورات برجستہ استعمال ہوئے ہیں اور مشرقی شعریات کی عظمت، لسانی خودمختاری وخودانحصاری اور خود مکتفی ہونے پردال ہیں، ہم محسوس کرسکتے ہیں کہ اگرکسی مستحکم پس منظر رکھنے والے شخص سے ہمیں گفتگو کا موقع مل جائے اور وہ دوران گفتگو فارسی اشعار، اردو و فارسی کے محاورات اور اپنی گفتگو کو آگے بڑھانے کے لیے قرآن پاک کی آیتوں کا سہارا لیتا ہے تو ہم کس طرح کی داخلی وخارجی مسرتوں سے گزرتے ہیں، اسی طرح کا احساس کئی چاند تھے سرآسماں کو پڑھتے ہوئے قاری کو ہوتا ہے۔ اس طرح کی عبارت آرائی اور اسے 848 صفحات تک نبھانا بچوں اور عام فہم فکشن نگاروں کا کام تو یقیناً نہیں ہوسکتا، یہ حق فاروقی کا ہی ہے، جو انھوں نے ادا کیا ہے۔

فاروقی اپنے ناول میں جہاں کلاسیکی شعرا کی اردو وفارسی شاعری سے کام لیتے ہیں، وہیں ان کے پیش نظر صوفیا کے حالات اور ان کے اقوال بھی ہیں، وہ صوفیا کے اقوال کو حسب منشا اور حسب ضرورت برجستگی کے ساتھ اپنے بیانیے کا جزو بنا دیتے ہیں، جس سے عبارت خوانی کا لطف دوبالا ہوجاتا ہے اور اگر ناول کے قاری کی نگاہ دوررس اور مطالعاتی مشقتوں کی عادی ہے تو وہ نہ صرف فاروقی کی علمیت اور گہری نگاہ کا قائل ہوتا ہے بلکہ وہ ناقابل بیان حدتک فاروقی کی عبارت سے حظ حاصل کرتا ہے اور اس کی پڑھی ہوئی چیزوں کی بازیابی بھی ہوجاتی ہے۔

ناول کئی چاندتھے سرآسماں میں تہذیبی جھلکیاں پوری طرح موجود ہیں. ناول نگارکی کوشش کامیاب ہے کہ ان دو صدیوں کی پوری تہذیب, ثقافت, تمدن اور فکری جہتیں نکھر کر سامنے آگئی ہیں. ادبی اور سماجی تہذیب سے لیس یہ ناول اپنی مثال آپ ہے.

ذرا غور کریں کہ ایک ناول نگار ناول لکھنے کے لیے جہاں کلاسیکی اردو وفارسی دواوین اور تذکرے کا مطالعہ کررہا ہے وہیں اس کی نگاہ اس طرح کے قدیم اور معتبر تصوف کے متن پر بھی ہے۔ کئی چاند تھے سرآسماں کے متن کی عظمت، اس کے عروج، اس کی شگفتگی، شائستگی، سنجیدگی، متانت اور عمق کے رازہائے سربستہ چوطرفہ مطالعے اور دہائیوں کے مشاہدے میں پوشیدہ ہیں۔ غور کرنے کا مقام یہ بھی ہے کہ فاروقی حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کا نام درج کرتے وقت بھی یہ خیال رکھتے ہیں کہ یہ ناول اٹھارویں اور انیسویں صدی کے دہلوی سماج اور معاشرے کا نمائندہ ناول ہے، اس کی زبان بھی دہلی کی ٹکسالی زبان ہے، اس لیے وہ حضرت کے نام کے ساتھ سلطان جی کا اضافہ کرتے ہیں، چوں کہ پرانی دہلی بلکہ کہنا چاہیے کہ دہلی کے باشندے خواجہ صاحب کی زندگی سے اب تک انھیں سلطان جی صاحب ہی کہتے آئے ہیں۔ زبان و بیان کی باریکیوں اور ندرتوں سے فاروقی کہیں صرف نظر نہیں کرتے۔ امیر خسرو نے بھی کہا تھا۔

صاحب جی سلطان جی تم بڑو گریب نواج

اپنا کر کے راکھیو تو ہے بانہہ پکڑے کی لاج

کئی چاند تھے سرآسماں کردار کے معاملے میں بھی اکیسویں صدی کا شاندار ناول ہے، جس نے اردو ناول کو وزیر خانم جیسا تاریخی اور ناقابل فراموش کردار دیا۔ اس کے زیادہ تر کردار تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی ورثے کا حصہ ہیں، خیالی اور فرضی کردار سازی نسبتاً آسان ہے، لیکن تاریخی کرداروں کو لکھنے اور انھیں پیش کرنے کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں اور ان تقاضوں کو فاروقی نے پورا کیا ہے۔ اس ناول کے زیادہ تر مرد کردار اٹھارویں اور انیسویں صدی کے شناسا کردار ہیں، جن کا تذکرہ تاریخی کتابوں میں موجود ہے۔

ناول کے بیانیہ کا ابتدائی تذکراتی اور شجراتی اسلوب شعوری اور تکنیکی وجوہ کی بنا پر ہے اور ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اس ناول میں بیان کیے جانے والے واقعے کا تعلق چونکہ اٹھارویں اور انیسویں صدی سے ہے اور ان صدیوں میں تذکرے کا رواج اور خاندانوں کے علم اور شجرے جوڑنے اور بنانے کا رواج کافی تھا اور مصنف انھی صدیوں میں ڈوب کر ناول تحریر کرنا چاہتے تھے، لہٰذا اس کا آغاز تذکراتی اسلوب سے کیا تاکہ زبان اور بیان کے ساتھ اس کا طرز اور انداز بھی اٹھارویں اور انیسویں صدی کا ہو اور ناول کا پلاٹ مضبوط و مستحکم اور قاری کے لیے دلچسپ ہوجائے، گو کہ اس طریق کار کی وجہ سے پلاٹ میں پیچیدگی آئی ہے مگر وزیر خانم مرکز میں ضرور ہے۔ ناول نگاری جزئیات نگاری میں بھی تذکراتی اسلوب کا بڑا دخل ہے۔

فاروقی نے ایک ناول لکھتے ہوئے ناول نگاری کے تمام عناصر کو قوت بخشی ہے۔ انھوں نے تہذیبی، فکری، سیاسی، سماجی، موضوعاتی، اسلوبیاتی، کرداری، استعاراتی اور تکنیکی نقطۂ نظر سے ناول کو باندھے رکھا ہے اور قاری کی دلچسپی کہیں ختم نہیں ہوتی، پورا ناول پڑھنے کے باوجود اسے تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ چونکہ اس کا اسلوب اور واقعات کی برجستگی اور سماجی حقیقت نگاری خاصے کی چیز ہے، جو قاری کو مطمئن نہیں ہونے دیتی۔ ناول کئی چاند تھے سرآسماں ہرلحاظ سے قابل ذکر اور ناول نگاری کی روایت اور تاریخ کو مستحکم اور مضبوط کرنے والا ناول ہے۔

■

Noorain Ali Haque
C-139, Gali No.3, Near Iqra Masjid
Wazirabad,Delhi- 84

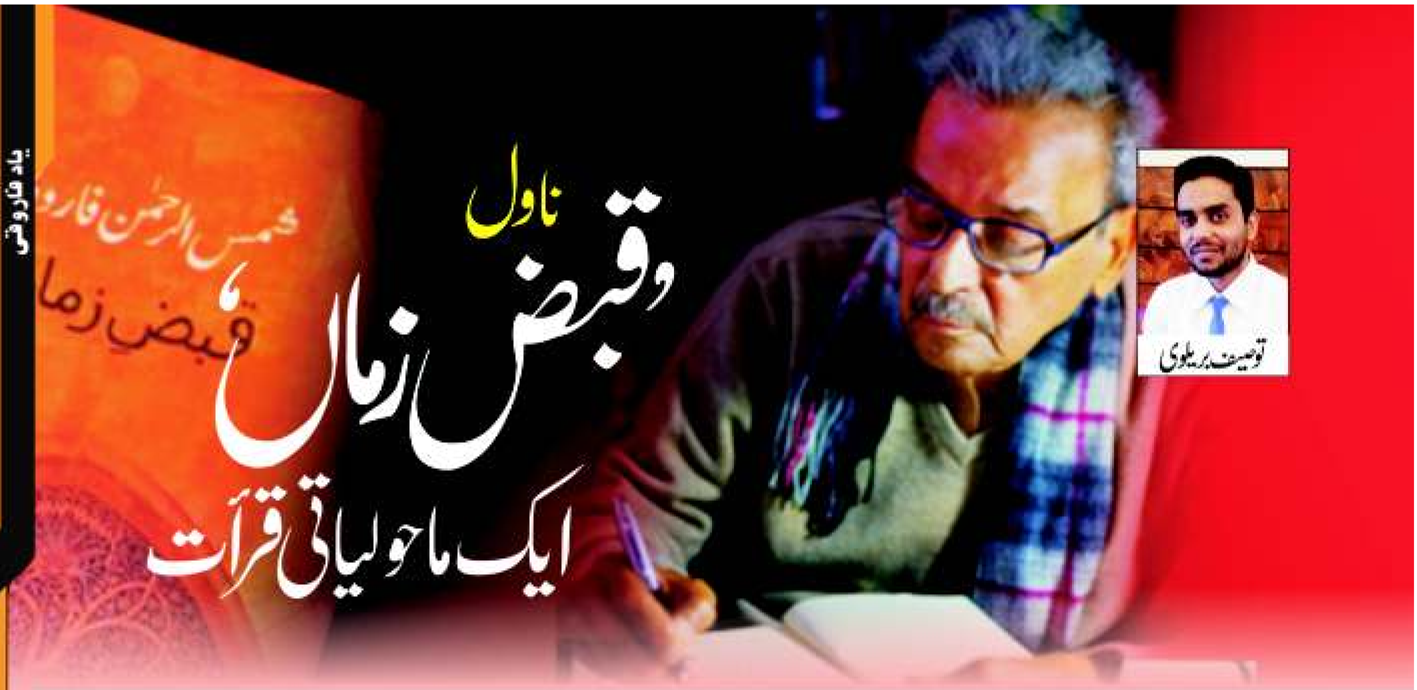

ناول

قبضِ زماں

ایک ماحولیاتی قرأت

توصیف بریلوی

شمس الرحمن فاروقی ناول نگار سے زیادہ نقاد کی حیثیت سے معروف ہیں لیکن ان کی ناول نگاری کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ان کا ناول 'کئی چاند تھے سر آسماں' زوال پذیر مغلیہ عہد کی داستان سناتا ہے۔ اس وقت کے رہن سہن، کھان پان، پہناوے اور زیورات پر خاصی توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ موصوف کا دوسرا ناول 'قبضِ زماں' 2012 میں پہلی بار پاکستان میں منظر عام پر آیا اور اب 2020 تک اس کے متعدد ایڈیشن آچکے ہیں۔ 'قبضِ زماں' کے متعلق ایک سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ اسے ناول کی صف میں رکھیں یا داستان کی صف میں یا پھر طویل افسانے کی؟ کیوں کہ اس میں ناول اور افسانے والے تمام اجزا تو ہیں لیکن Time Travel بھی اس کا خاص وصف ہے جس کی وجہ سے داستان کا شائبہ گزرتا ہے۔ حالانکہ دنیا کے بیشتر مذاہب کی کتابوں میں اس طرح کے واقعات درج ہیں پھر بھی ایسی باتوں پر یقین کرنا آسان نہیں۔ مذکورہ ناول 'قبضِ زماں' سے مراد بھی یہی بات ہے کہ وقت کو قبضے میں کر لینا یا یوں سمجھیں کہ وقت کی قید سے آزاد ہو جانا۔ 'قبضِ زماں' کی کہانی یہ ہے کہ ایک سپاہی جو سکندر سلطان لودی کی حکومت کے آخری سال یعنی 1517 سے مغلیہ حکومت کے زوال کے وقت یعنی اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں پہنچ جاتا ہے۔ ہوا یوں کہ سکندر سلطان لودی کا ایک سپاہی ڈاکوؤں سے لٹ جانے کے بعد اپنی بیٹی کے بیاہ کے لیے ایک طوائف سے قرض لیتا ہے اور اپنی بیٹی کی شادی کر دیتا ہے۔ کچھ سال کے بعد جب وہ قرض واپس کرنے جاتا ہے تو اس طوائف کا انتقال ہو چکا تھا۔ وہ اس کی قبر پر فاتحہ پڑھنے جاتا ہے تو اسی قبر سے ہوتے ہوئے ایک ایسی دہلی میں پہنچ جاتا ہے کہ جس کا زمانہ اورنگ زیب کے بعد کا ہے۔ جو رقم وہ اپنا قرض اتارنے کے لیے لایا تھا وہ تو اس زمانے میں رائج ہی نہ تھی جس کی وجہ سے وہ بہت حیران و پریشان بھی ہوتا ہے۔ اُس موقعے پر اصحاب کہف کا واقعہ بے ساختہ یاد آجاتا ہے۔ جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سیکڑوں برس گزار آیا ہے تو اس کی کیفیت مجنونانہ ہو جاتی ہے اور ذہن کچھ سوچنے کے لائق بھی نہیں رہتا ہے۔

راقم کو ناول کی کہانی بیان کرنا مقصود نہیں تھا پھر بھی ناول کے تعارف میں اختصار سے کام لیتے ہوئے اب اصل موقف کی طرف بڑھا جائے۔ شمس الرحمن فاروقی صاحب نے ناول میں جو زبان (بلکہ املا بھی) استعمال کی ہے وہ واقعی قدیم اردو کی یاد دلاتی ہے اور تاریخی نقطہ نظر سے بھی ناول اہمیت کا حامل ہے۔ ادبی ماحول کا جو تانا بانا مغلیہ حکومت کے آخری وقتوں میں اردو ادب کے عظیم شاعروں پر مبنی ہے مثلاً میر تقی میر، سودا، درد اور ان کے معاصرین کا تذکرہ، ان کی صحبتیں اور ان کی ادبی محفلیں ان سب کا تفصیلی تذکرہ ایک عہد آنکھوں کے سامنے Visualize کر دینے کی قوت رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں مغل حکومت سے بھی پہلے دہلی اور اطراف دہلی میں آب و ہوا کیسی تھی؟ کون کون سے جانور، چرند اور پرند انسانی بستیوں اور جنگلوں میں پھرتے تھے۔ ان کے بارے میں بہت سی معلومات ناول میں مہیا کی گئی ہیں۔ جس سے اس وقت کے ماحولیات کا اندازہ ہوتا ہے۔ آگرہ جب بسایا جا رہا تھا اس وقت سے لے کر روہیل کھنڈ میں دھام پور کے نزدیک مغل اور روہیلوں کی جنگ تک تکنیکی اسلحوں کا ارتقا، ایسی بہت سی باتیں ناول کو معنی خیز بناتی ہیں اور قاری کو پرانے عہد میں لے جاتی ہیں۔

ماحولیات اپنے آپ میں زندگی کی علامت ہے۔ اگر ماحولیاتی نظام ہی درہم برہم ہو جائے تو زندگی اجیرن ہو جائے۔ مختلف قسم کی آلودگی، جانوروں اور پرندوں کا حد سے زیادہ شکار اور جنگلوں کا بے تحاشا کاٹا جانا ماحولیات کے لیے سم قاتل ہے۔ ماحولیات کو بچائے رکھنے کے لیے چھوٹے سے چھوٹے جرثومے سے لے کر بڑے بڑے جانوروں تک کا زندہ رہنا بہت ضروری ہے لیکن انسان نے اپنی ضرورت کے مطابق نہ صرف جانوروں کا شکار کیا بلکہ جنگلوں کو کاٹ کر کھیت اور اب ان کھیتوں کو ختم کر کے بستیاں بسانے اور فیکٹریاں لگانے میں منہمک ہے۔ یہ سلسلہ دراز ہوتا جا رہا ہے جس سے جانوروں اور پیڑوں کا تناسب روز بہ روز کم ہوتا جا رہا ہے اور یہ سیارہ ہمہ وقت ایک عجیب و غریب خطرے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ چونکہ ناول کی قرأت ماحولیات کے حوالے سے کی گئی ہے تو اس میں ان اقتباسات پر گفتگو کی جائے گی کہ جہاں پر ماحولیات سے متعلق کوئی پہلو سامنے آتا ہوگا۔

راوی جب رات کو اپنے گاؤں کے گھر میں رات کو سونا چاہتا ہے اور اسے پرانی باتیں یاد آتی ہیں جو اس کے بچپن کی یادوں میں سے ہیں، اس میں سے ایک جگہ تالاب اور اس میں رہنے والے چیونٹوں اور دیگر کیڑے مکوڑوں کا تذکرہ بڑی باریکی سے کیا گیا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''بہر حال ہماری گڑھی میں مچھلیاں نہیں، لیکن جونکیں، گھونگے اور پانی کے چیونٹے بے شمار تھے۔ یہ پانی کے چیونٹے بھی خوب تھے، نہایت دبلے پتلے، بالکل جیسے وہ تنگ اور پتلی اور لمبی ہلکی بادبانی کشتیاں جنھیں Pinnace کہتے ہیں، یا جیسے کشمیری شکارے، بے حد ہلکے پھلکے۔ سیاہ بھورا رنگ، جسے Steel Grey کہیے، اور اس قدر لمبی لمبی ٹانگیں جیسے وہ سرکس کے جوکروں کی طرح پاؤں میں بانس باندھے ہوئے ہوں۔ وہ پانی کی سطح پر

اس قدر تیز دوڑتے جیسے دوڑ کے میدان میں گرے ہاؤنڈ کتے دوڑتے ہیں۔ مجھے اب یہ تو نہیں یاد کہ وہ کتنی دور تک دوڑتے نکل جاتے تھے (گڑھی خاصی چوڑی تھی، یا مجھے وہ چوڑی لگتی تھی۔) مجھے یاد نہیں کہ کوئی چیونٹا کبھی اس پار سے اس پار پہنچتا ہوا دکھائی دیا ہو۔ لیکن وہ جانور بالکل ننھے منے اور ہلکے پھلکے تھے اور گڑھی کا پانی بھی کچھ بہت روشن نہ تھا، اس لیے اگر وہ اس پار نکل بھی گئے ہوتے تو مجھے نظر نہ آ سکتا تھا کہ وہ اس کنارے پر پہنچ ہی گئے ہیں۔ لیکن جہاں تک مجھے یاد آتا ہے ان کی دوڑ یہی کوئی دو ڈھائی فٹ کی ہوتی تھی اور مجھے ایک چھوٹے سے آبی منطقے میں دوڑتے بھاگتے نظر آتے تھے، اپنے تئیں ایک عجب اہمیت کا احساس اور خودنگری کا رنگ لیے ہوئے، گویا وہ سارا پانی انھیں کے لیے بنایا گیا تھا۔ اکثر میں دیکھتا کہ وہ ایک طرف دوڑتے ہوئے گئے، پھر دفعتاً کنی کاٹ کر کسی اور طرف نکل گئے۔ چراگاہوں میں کلیلیاں کرتے ہوئے آہو بچوں اور الل بچھیروں کی طرح انھیں ایک دم قرار نہ تھا۔"

(شمس الرحمٰن فاروقی، قبض زماں، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی 2020 (چھٹا ایڈیشن) ص 35-36)

مندرجہ بالا اقتباس میں فاروقی صاحب نے گاؤں کے چھوٹے سے تالاب جسے گڑھی کہا جاتا تھا اس میں چیونٹوں جیسے کیڑوں کا ذکر نیز ان کی جسمانی ساخت اور ان کی دوڑ بھاگ کے متعلق تفصیلی ذکر کیا ہے۔ تالاب کے کیڑے مکوڑوں اور جانوروں کا اپنا ایک نظام ہوتا ہے۔ یہ چیونٹے نما کیڑے اسی نظام کا حصہ ہوتے ہیں جو اپنے اپنے طور پر ماحولیات کو بنائے رکھنے میں اپنا تعاون پیش کرتے ہیں۔ یہاں اختصار کی وجہ سے یہ اقتباس مختصر کرنا پڑا ورنہ آگے چل کر گھونگوں اور جونکوں کا ذکر بھی مصنف نے دلچسپ انداز میں قلم بند کیا ہے۔

راوی جب سونے کی کوشش میں ناکام ہو جاتا ہے تو اپنے گاؤں کے وہ دن بھی یاد کرتا ہے جب اس کے دادا کے دروازے پر نیم کا پیڑ تھا۔ اصل میں درخت ہندوستانی تہذیب کا بہت اٹوٹ حصہ رہے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ درخت انسانی تاریخ اور زندگی کا اہم حصہ ابھی بھی ہیں۔ درختوں نے ہی انسان کو شروع میں سر چھپانے کو اور جنگلی جانوروں سے بچنے کے لیے اپنی شاخوں کو آغوش کی طرح پھیلا دیا تھا۔ بہر کیف آج درختوں کی کٹائی جس بے حسی کی ساتھ ہو رہی ہے اس کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہے۔ نقصانات کے طور پر پوری دنیا میں آکسیجن کو صاف رکھنے کے لیے پیڑ پودے دن بہ دن کم ہوتے جا رہے ہیں۔ اپنے اسی طرح کے ایک عزیز نیم کے درخت کے نہ ہونے پر مصنف جن لفظوں میں افسوس کرتا ہے ملاحظہ فرمائیں:

"دادا کے دروازے پر نیم کا پیڑ، جس کے نیچے خاندان کے لوگوں کے ساتھ گاؤں کا ہر اجنبی مسافر کھانا کھاتا تھا، اب نہیں ہے۔ جس درخت کے سائے میں اس وقت میں لیٹا ہوا سونے کی کوشش کر رہا ہوں، اس کی عمر بمشکل تیس چالیس برس ہوگی۔ وہ گڑھی اور وہ پیپل تو اس طرح صفحۂ وجود سے محو ہو چکے ہیں گویا کبھی تھے ہی نہیں۔

ہم تو جیسے یہاں کے تھے ہی نہیں
خاک تھے آسماں کے تھے ہی نہیں

جون ایلیا نے ہجرت کے پس منظر میں کہا تھا۔ ان بچاروں کو کیا معلوم کہ ہم لوگ جو یہیں کے تھے اور کہیں نہ گئے، ہم لوگوں کا سارا بچپن، سارا لڑکپن، تمام اٹھتی ہوئی جوانیاں، تمام دوستیاں اور رقابتیں ان اشجار کے ساتھ گئیں جو کٹ گئے، ان تال تلیوں کے ساتھ ڈوب گئیں جو سوکھ گئے، ان راہوں سے اٹھا لی گئیں جن پر گھر بن گئے۔" (ایضاً، ص 39)

محولہ بالا عبارت سے اُس افسوس کا انکشاف ہو جاتا ہے جو ایک طویل عرصے بعد مصنف کو اس کے ماضی کی یاد ہی نہیں دلاتا بلکہ بچپن، جوانیاں، دوستیاں اور رقابتوں سے متعلق بہت سے واقعات تازہ کر دیتا ہے جن کا تعلق گاؤں کے متعدد اشجار کے ساتھ تھا اور وہ اشجار ان کے گواہ تھے۔

راوی اپنے گاؤں میں رات کے وقت نیند سے عاری ہے اور اپنے بچپن کے قصے یاد کرتا ہے پھر اسے بھوت، چڑیل، جنات وغیرہ سبھی کے واقعات یاد آتے چلے جاتے ہیں۔ پیپل کے درخت کا برم بھی اسے یاد آتا ہے اور پھر اسے ایسا لگتا ہے کہ کوئی روح اس کے قریب آ کر اپنا واقعہ سنانا چاہتی ہے۔ اسی واقعے پر اصل ناول مبنی ہے۔ سکندر سلطان لودی کی حکومت میں ایک سپاہی جب جنگل میں لٹ جاتا ہے اور وہ لٹیرے اسے باندھ کر ڈال جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں اسے خیال آتا ہے کہ کہیں جنگلی جانور اسے اپنا نوالہ نہ بنا لیں۔ اس موقعے پر اس کے ذہن میں نقصان پہنچانے والے جانوروں اور ان کے مناسب ماحولیات کی باتیں گردش کرتی ہیں۔ اس ذیل میں ناول سے ایک عبارت یہاں رقم کی جاتی ہے:

"کیا بہت دیر ہو گئی تھی؟ کیا اب کوئی آنے والا نہیں ہے؟ ابھی ابھی میں نے شیر کی دہاڑ سنی تھی کیا؟ شیر تو اس علاقے میں تھے نہیں، ہاں گلدار بہت تھے۔ گلدار تو جمنا کے کنارے کی کچھاروں میں دہلی سے کرنال تک چھوٹے ہوئے سانڈوں کی طرح بے روک ٹوک گھومتے تھے اور بھیڑیے بھی۔ گلداروں کی تو ہمتیں اس قدر کھلی ہوئی تھیں کہ دہلی کے مضافات میں جو آبادیاں بوجہ نقل مکانی کے ذرا چھدری ہو جاتیں، ان کے خالی گھروں میں گلدار آباد ہو جایا کرتے تھے۔ یہاں تو میں جمنا کے کنارے سے دور تھا۔ سلطان فیروز شاہ خلد مکانی نے یہ نہر بنوائی ہی اسی لیے تھی کہ جمنا کا پانی جن علاقوں میں پہنچتا نہیں ہے وہاں بذریعہ اس نہر کے پہنچ جائے۔ لیکن یہاں بھی اب درختوں کے گھنے اور نہر کی رطوبت نے کچھار جیسا سماں پیدا کر دیا تھا۔ سلطان فیروز کو اللہ نے جنت میں اونچا مقام ضرور دیا ہوگا۔" (ایضاً، ص 53)

مذکورہ بالا اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سپاہی جسے ڈاکو باندھ کر چلے جاتے ہیں وہ دل ہی دل سوچتا ہے کہ اس علاقے میں شیر تو ہیں نہیں ہاں گلدار بہت ہیں بلکہ ان کی اتنی بہتات ہے کہ وہ جمنا کے کنارے کنارے کچھاروں میں دہلی سے کرنال تک پھیلے ہوئے ہیں یہاں تک کہ یہ گلدار دہلی کے مضافات میں بسی بستیوں کے خالی گھروں میں بھی رہنے لگتے تھے۔ علاوہ ازیں اس اقتباس میں ایک نہر کا بھی ذکر ہے جو اپنی رطوبت سے کچھار جیسا ماحول بناتی ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے قدیم زمانے کی دہلی کی ماحولیات میں پائے جانے والے جانوروں کا بھی خاصا مطالعہ کیا ہوگا۔

سپاہی جب اپنے گاؤں میں بیٹی کی شادی کے بعد کچھ برس گزارتا ہے تو سردیوں کی آمد پر جانوروں اور پرندوں کی بہتات گاؤں کے آس پاس اور باغ میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس ضمن میں ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"چیل کوے گوریاں درختوں اور آسمانوں میں شور مچاتے پھرتے کہ سردیاں اب واپس آنے والی ہیں۔ باغوں میں موروں کی کثرت تھی۔ کالے تیتر اپنے اپنے بھٹ سے نکل کر اتراتے پھر رہے تھے۔ تنومند، بلند و بالا نیل گائیں، بارہ سنگھے، چھریرے چیتل، کانکر، لمبی پیچ دار سینگوں والے کالے، ٹھگنے چوسنگھے، سبھی طرح کے ہرن ہر موڑ پر اور ہر کھلی جگہ پر دکھائی دیتے اور آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتے۔" (ایضاً، ص 72)

مندرجہ بالا اقتباس میں ناول نگار نے موسم کا ذکر کیا ہے اور اسی کی مناسبت سے مختلف جانوروں اور پرندوں کا بھی ذکر آیا ہے۔ جانور انسانوں سے بھی زیادہ حساس ہوتے ہیں انھیں موسم کی تبدیلیوں کا اندازہ ہم انسانوں سے پیشتر ہی ہو جاتا ہے۔ اقتباس کے شروع ہی میں بتا دیا گیا ہے کہ سردیوں کا موسم آنے کو تھا اس لیے سپاہی کے گاؤں کے آس پاس کے علاقے میں پائے جانے والے مختلف قسم کے جانوروں اور پرندوں کے جھنڈ اور غول دیکھنے میں آنے لگے تھے جو کہ آنکھوں کو سکون

بخشتے تھے۔ یہ جس زمانے کی کہانی ہے اس زمانے میں مور، نیل گائے، مختلف قسم کے ہرن، چیتل اور کانکر جیسے جانوروں کی بہتات تھی جو ماحولیات کو بنائے رکھنے میں ظاہر ہے اپنا تعاون پیش کرتے رہے ہوں گے۔ اب ان میں سے کچھ جانور ناپید ہیں اور کچھ اختتام کی دہلیز پر ہیں۔ آج جب جنگل ہی ختم ہو رہے ہیں تو ان جانوروں کے لیے کوئی جائے رہائش ہی کہاں ہے۔ یہ آج کے وقت کا بہت ہی سنجیدہ مسئلہ ہے۔

سپاہی جب امیر جان نامی طوائف کا قرض ادا کرنے جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ فوت ہو چکی ہے اور اس کی محل نما حویلی بھی اب کھنڈر ہوئی جاتی ہے تو اس نے سوچا کہ اب امیر جان کی قبر پر فاتحہ پڑھنا اس کا فرض ہے۔ اسی غرض سے وہ قبرستان کا رخ کرتا ہے اور اس موقعے پر قبرستان میں کھلے پھولوں، پرند اور جانوروں کی وجہ سے وہاں کا ماحول خاصا پر فضا دکھائی دیتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''پھولوں اور پیڑوں کے باعث قبرستان خاصا پر فضا تھا۔ قمریاں اور کبوتروں اور فاختائیں غول کے غول ہر طرف یا ہوا اور غٹرغوں کرتے دانہ چنتے نظر آتے تھے۔ مور بھی کثرت سے تھے۔ کبھی کبھی تیتر، لومڑیاں اور خرگوش بھی دکھائی دے جاتے۔'' (ایضاً،ص 75)

مذکورہ بالا اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پھول، پیڑ، پرندے اور دیگر جانور اپنے طور پر ماحولیات میں توازن برقرار رکھتے ہی ہیں ساتھ ہی ان کے دم سے فضا میں بہار محسوس کی جاتی ہے۔ تصور ہی نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی بھی چمن صرف پیڑ پودوں کی وجہ سے مکمل ہو، تصور ہی نہیں کیا جا سکتا کہ مختلف قسم کے جانور بغیر جنگل اور پیڑ پودوں کی شوخیوں کے ساتھ گھومیں پھریں۔ ان سب سے مل کر ہی ماحولیات تیار ہوتا ہے جو سب کے لیے مفید ہے۔ ناول نگار نے مذکورہ بالا حصے میں قبرستان کے پر فضا ہونے کی بات کہی ہے جب کہ قبرستان میں جا کر اداسی چھا سکتی ہے، لواحقین کی یاد تازہ ہو سکتی ہے لیکن مختلف قسم کے خوبصورت پرندے مثلاً مور، فاختائیں اور کبوتر اور جانور مثلاً خرگوش یہ سب مل کر اس اداس ماحول کو بھی تر و تازہ بنانے کی قوت رکھتے ہیں۔ یہیں ماحولیات کی اہمیت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اُس کا صحت مند ہونا انسانوں کے لیے بھی کتنا ناگزیر ہے۔

سپاہی جب امیر جان کی قبر میں راستہ دیکھتا ہے تو پس و پیش کے بعد اس میں اتر جاتا ہے اور ایک الگ ہی دنیا میں پہنچ جاتا ہے جہاں اس کی آنکھوں کو خیرہ کرنے کے سامان بہت تھے۔ امیر جان نے اس سے وہ رقم تو واپس لی نہیں اور منہ پھیرتے ہوئے اسے باہر نکل جانے کو کہا بلکہ اپنی اردابیگنی (محافظ لڑکی) سے کہہ کر اسے باہر کا راستہ دکھا دیا۔ باغ سے باہر آ کر سامنے ہی ایک بازار تھا جو مختلف قسم کی جنس، میوہ جات اور دیگر سامان سے بھرا پڑا تھا۔ حسینوں کا جمال بھی بازار میں جا بجا نظر آتا تھا۔ بیچ بازار کے ایک نہر تھی، آئینے کی طرح شفاف جس کے دونوں طرف پھل پھول والے درخت تھے۔ اس نہر کو کوئی بھی شخص گندا نہیں کر سکتا تھا۔ شاہی ملازمین اس کام پر بھی مامور تھے اور جو نہر کو گندا کرتا تو اسے لہولہان کر دیا جاتا۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''بیچ میں بازار کے ایک نہر، تازہ خوش گوار پانی کی رواں، اس کے دو رویہ درخت پھولوں اور پھلوں سے لدے ہوئے۔ مگر کسی کو یارائے گل چینی نہیں۔ ثمر ہائے شیریں و پختہ کو ملازمان شاہی چن چن کر توڑتے اور مونج کی سبد میں اکٹھا کرتے ہوئے۔ نہر کا پانی خس و خاشاک سے پاک آئینے کی مانند۔ باغبانیاں، گری ہوئی پتیوں اور پنکھڑیوں کو جال سے سمیٹتی ہوئی۔ کیا مجال جو کوئی بے خیالی میں بھی کوئی تنکا، کوئی خاش، کوئی دھجی، نہر میں ڈال دے۔ محتسبان بازار کا یہ بھی ایک کام ہے۔ سونٹے لیے ہوئے پھرتے ہیں۔ جہاں کسی نے ایک دھجی بھی گرائی، سونٹا لہرا کے اس سے کہا کہ اٹھا، ورنہ پیٹھ لہولہان کر دوں گا۔''

(ایضاً،ص 87)

مندرجہ بالا اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت کے شاہی انتظامات نہر کے لیے بھی کتنے سخت تھے۔ نہروں کو صاف رکھنے کے پیچھے وجہ یہ بھی تھی کہ انھیں نہروں سے کاروبارِ زمانہ چلتا تھا۔ ان نہروں کی صفائی اور خوبصورتی کا ذکر پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ صاف و شفاف نہریں اس وقت ماحولیاتی نظام میں بڑی معاون ثابت ہوئی ہوں گی۔ ہاں بے شک اس زمانے میں فیکٹریوں سے نکلنے والی گندگی کا رخ نہروں کی طرف نہیں موڑا جاتا ہوگا، نہ ہی برسات میں کھیتوں سے بہہ کر مہلک کیمکل نہروں میں شامل ہوتے ہوں گے۔ پھر بھی ان کی صفائی کا کیسا خیال رکھا جاتا تھا۔ مندرجہ بالا اقتباس میں نہر کی صفائی کا جو نظام پیش کیا گیا ہے وہ متاثر کن ہے۔

وہ سپاہی جب خواب جیسی زندگی سے نکل کر اپنے گاؤں کا تصور کرتا ہے تو اسے اپنے بیوی بچوں کے پیکر تو نظر آتے ہی ہیں ساتھ ہی اپنے باغ اور وہاں کے چرند پرند بھی یاد آتے ہیں۔ باغ کے ختم ہونے کا افسوس بھی وہ کرتا ہے اور پھر یہ بھی سوچتا ہے کہ نیا باغ کسی نے لگا لیا ہوگا۔

'' کچھ نہ ہوگا تو میرا گاؤں تو ہوگا۔ کوئی تو میری زمینوں کو کاشت کر رہا ہوگا۔ میرا اپنا باغ سوکھ گیا ہوگا، دیمک کھا گئے ہوں گے لیکن اس کی جگہ نیا باغ تو کسی نے لگا لیا ہوگا۔ اس میں پپیہے اور کوئلیں تو کوکتی ہوں گی۔ اس پر بارش کی پہلی پھوار سے گرد آلود آم کا منھ تو اب بھی دھل جاتا ہوگا؟'' (ایضاً،ص 142)

محولہ بالا اقتباس میں مصنف نے بتانے کی کوشش کی ہے کہ وہ سپاہی اپنے گاؤں کو اور اپنے کنبے کو یاد کرتا ہے ساتھ ہی اپنے کھیت کھلیان، باغ اور اس میں رہنے والے پپیہے اور کوئلوں کو بھی یاد کرتا ہے۔ پیڑ پودے روزِ اول ہی سے انسان کو سہارا دئے ہوئے ہیں۔ اس کی یادوں کے مسکن اور زندگی میں اہم ستون کی اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ سپاہی ایک الگ ہی دنیا میں پہنچنے کے بعد بھی اپنے کنبے کے ساتھ ساتھ اپنے کھیت کھلیان اور باغ کو بھلا نہ سکا۔ اس حصے سے انسان کا قدرت کے ساتھ اہم رشتے کی وضاحت ہوتی ہے۔

زیرِ نظر مضمون میں حتی المقدور ان عبارتوں اور اقتباسات کو پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے جن میں ماحولیات یا ماحولیات کو بنائے رکھنے میں معاون چرند، پرند، موسم، ندی نہر، فصلیں، پھل پھول، باغات اور کھیت کھلیان کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ناول کا مطالعہ کرنے پر مصنف کی باریک نظر، عمیق فکر اور ماحولیاتی حسیات کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے 'قبضِ زماں' میں ایسے کئی مواقع پر ماحولیاتی مسائل کو بڑی حسیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ سب سے زیادہ باریکی سے ص 35 سے 38 تک مختلف قسم کے آبی کیڑے مکوروں کا ذکر ہی نہیں کیا بلکہ ان کی عادات و اطوار کو بھی پیش کیا ہے جس سے ان کا مشاہدہ اور مطالعہ صاف جھلکتا ہے۔ ضرور موصوف نے Animal Behaviour اور Entomology کا بڑی دلچسپی سے اور تادیر مطالعہ کیا ہوگا۔ اس ضمن میں طوالت سے بچنے کے لیے ص 35 تا 36 تک ہی اقتباس دیا جا سکا ہے۔

علاوہ ازیں ناول میں کئی جگہوں پر پیڑوں کے کٹنے یا وقت کی آندھیوں میں کھو جانے پر شدید اظہارِ افسوس ملتا ہے۔ بہت سے جانوروں اور پرندوں کا ذکر پر فضا ماحول اور زندگی کی علامت کے طور پر کیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ناول ''قبضِ زماں'' میں تاریخی، جغرافیائی اور Time Travel جیسے نکات سموئے ہوئے ہے لیکن اس کا ماحولیاتی پہلو بھی قابلِ غور و فکر ہے۔

■

Tauseef Barelvi
Research Scholar, Dept of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh - 202001 (UP)
Mob.:7302702087
Email.: venuseefvi@gmail.com

صغیر افراہیم

سید اکبر علی ترمذی کی غالب پسندی

ممتاز مؤرخ اور معروف آرکایولوجسٹ پروفیسر سید اکبر علی ترمذی 8/جون 1924 کو ایک مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ 1948 میں بمبئی یونیورسٹی سے فارسی، اردو اور انگریزی کے ساتھ بی اے کیا۔ 1950 بمبئی ہی سے فارسی میں ایم اے کرنے کے بعد سرکاری ملازم ہوگئے۔ 1962 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تاریخ میں ایم اے کیا۔ رحم علی الہاشمی نے اپنی کتاب 'یادیں' مطبوعہ اکتوبر 1976 (کتاب کار علی گڑھ) میں لکھا ہے:

''... نیشنل آرکائیوز میں ترمذی صاحب کا میرا بہت دن ساتھ رہا۔ اور وہ ہمیشہ مجھ سے خلوص اور محبت کا برتاؤ کرتے تھے۔ وہ آرکائیوز کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھے۔ اور پبلک سروس کمیشن نے ان کا انتخاب کیا تھا۔ اس کے پیشتر یہ اجمیر کالج میں تاریخ کے اُستاد تھے۔ تاریخی معلومات اور تاریخی مواد سے کافی واقفیت رکھتے ہیں اور تاریخی تحقیق کے شائق ہیں...''

موصوف جون 1982 کو نیشنل آرکائیوز آف انڈیا سے بحیثیت ڈائریکٹر ریٹائر ہوئے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی میں تاریخ کے وزیٹنگ پروفیسر مقرر ہوئے۔ سرینگر سے نکلنے والے مجلّہ 'گزیٹیز' کے چیف ایڈیٹر رہے۔ اس سے قبل ہمدرد انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹاریکل ریسرچ کے اعزازی ڈائریکٹر ہوئے۔ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف سائنس، ٹیکنالوجی اینڈ ڈولپمنٹ اسٹڈیز میں مشیر رہے۔ قدیم وجدید تاریخ اور ثقافت وتمدن سے خصوصی دلچسپی کی بنا پر تقریباً آٹھ برس یونیسکو میں ایشین اسٹڈیز کے شعبے سے بھی تعلق رہا۔ موصوف نے حکومتِ ہند کے نمائندے کی حیثیت سے امریکہ، افریقہ اور یورپ کے ملکوں بشمول اسپین کے علاوہ مختلف ایشیائی ممالک میں محکمۂ آثار قدیمہ کے تعلق سے منعقد ہونے والے سیمناروں میں شرکت کی، اُن کا معرکۃ الآرا مضمون 'ہندوستانی دفتر خانوں میں فارسی دستاویزیں' علمی مجلسِ دلّی کے سہ ماہی رسالہ 'تحریر' میں جولائی تا ستمبر 1971 میں شائع ہوا، جس کے مرتب مالک رام تھے۔

تاریخ، تحقیق اور تدوین سے انھیں خصوصی شغف تھا اور انگریزی، فارسی اور اردو کے ادیب کی حیثیت سے وہ اپنی ایک پہچان رکھتے تھے۔ ساٹھ سے زیادہ تحقیقی مضامین دنیا کے مختلف رسائل وجرائد کی زینت بنے ہیں۔ ان موضوعات پر ان کی تقریباً دو درجن کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ یہ کتابیں ہندوستانی تاریخ کے ماخذ، مغل دستاویز کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد اور جدید ہندوستان، نیز یونیسکو گائڈ ادبی حلقوں میں اعتبار کا درجہ رکھتی ہیں۔

'نامہ ہائے فارسی غالب' (Persian Letters of Ghalib) ان کی زبردست دریافت ہے۔ دو سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب فروری 1969 میں غالب اکیڈمی سے شائع ہوئی ہے۔ کتاب پر پچاس صفحات پر مبنی انگریزی میں ان کا تعارف نامہ بجد وقیع ہے۔ اس میں مسودہ میں شامل تمام فارسی خطوط کا احاطہ کیا گیا ہے۔ مدلل اور موثر مقدمہ قائم کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

''غالب کے فارسی خطوط کا ایک بے یار ومددگار مسودہ محفوظ رہ گیا ہے جسے شائع کیا جارہا ہے۔ یہ خطوط بہت اہم ریکارڈ فراہم کرتے ہیں۔ شاعر کے سفرِ کلکتہ کے بارے میں یہ تفصیلات اب تک سامنے نہیں آئی تھیں۔''

سید اکبر علی ترمذی تفہیم غالب میں ان مکاتیب کی حوالہ جاتی حیثیت اور افادیت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان خطوط سے شاعر کی زندگی اور فن کے بارے میں نئے حقائق پر روشنی پڑتی ہے۔ نیز ان خطوط اور ضمیموں سے جو اس مجموعے میں پیش کیے جارہے ہیں، ایک ایسا مرقع تشکیل پاتا ہے، جس سے شاعر کی دہلی سے غیر حاضری اور کلکتہ کے عارضی قیام کی تصویریں سامنے آتی ہیں۔''

اس مجموعۂ مکاتیب کی نیرنگی اور انفرادیت کے تعلق سے وہ 'دیباچہ' میں رقم طراز ہیں:

''1960 میں میرے ایما پر نیشنل آرکائیوز آف انڈیا سے یہ مجموعہ حاصل کیا گیا اور چونکہ اس کا موضوع میرا میدان نہیں تھا، میں نے اپنے دوست قاضی عبدالودود صاحب سے، جو ایک مسلمہ غالب شناس ہیں، درخواست کی کہ ان خطوط کو مرتب فرمائیں۔ انھوں نے میری درخواست کو قبول فرمایا اور 1961 میں چھ خطوط علمی رسالہ 'تحقیق' میں شائع فرمائے۔ لیکن بعض اور کاموں میں مصروفیت کی وجہ سے اُنھیں اس کام کے لیے وقت نہ ملا اور گزشتہ اکتوبر میں انھوں نے رائے دی کہ میں خود اس کام کو سرانجام دوں۔''[1]

ترمذی صاحب اُس وقت شعبۂ آثار قدیمہ میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی حیثیت سے اہم کاغذات کی ترتیب وتدوین میں بے حد مصروف چل رہے تھے لیکن قاضی عبدالودود صاحب کے مشوروں اور حوصلہ افزائی سے وہ اس جانب یکسوئی سے متوجہ ہوئے۔ لکھتے ہیں:

''جب میں نے اس مجموعہ کو باریک بینی سے پرکھا تو اس کام کو بے شمار مشکلات سے پُر پایا... اول یہ کہ میرے پاس صرف ایک مسودہ تھا جس سے مجھے تدوین کا کام کرنا تھا۔ دوسرے، یہ قلم برداشتہ غیر دوستانہ اُسلوب میں لکھا ہوا تھا۔ تیسرے، اسے کئی مقامات پر کیڑوں نے کھالیا تھا... مگر ان سب مشکلات کے باوجود میں نے انتہائی کوشش کی ہے کہ متن کو برقرار رکھوں تاہم جو چند خلا رہ گئے ہیں، ان کی جانب فنِ طباعت کی مختلف اختراعات سے اشارہ کردیا گیا ہے''۔ (مکتوبات غالب، ص10)

غالب صدی (1969) کے موقع پر شائع ہونے والی کتابوں میں شاید سید اکبر علی ترمذی کی یہ کتاب سب سے اہم ہے جو مزید تحقیق کے در وا کرتی ہے۔ لطیف الزماں خان اس کی خوبیوں کو گنواتے ہوئے 'مکتوباتِ غالب' (مطبوعہ دسمبر 1995) میں لکھتے ہیں:

(i) تعارف، دیباچہ اور مقدمہ انگریزی میں ہے جو ہر اعتبار سے معتبر اور مستند ہے۔ مذکورہ کتاب اُس توجہ سے محروم رہی جس کی یہ مستحق تھی۔

(ii) غالب نے چار سال کے عرصہ میں اپنے احباب خصوصاً محمد علی، صدر امین باندہ کو جو خطوط لکھے، وہ انتہائی اہم ہیں۔ یہ خطوط نہ صرف سفرِ کلکتہ کے تعلق سے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ اُس پورے عہد کو سمجھنے میں معاون ہیں۔

(iii) یہ مکتوبات اس اعتبار سے بھی نہایت قیمتی ہیں کہ

سید اکبر علی ترمذی نے مسودہ کی خستگی کو باریک بینی سے دیکھتے ہوئے بعض مقامات پر جو اشعار، مصرعے وغیرہ غائب ہو رہے تھے انھیں دیگر کلیات سے نقل کرتے ہوئے ماہرین غالب کی مدد لی ہے۔

خوبیوں کے اعتراف کے ساتھ ساتھ دانشورانِ ادب سے یہ شکوہ بھی کرتے ہیں کہ مذکورہ کتاب اُس توجہ سے محروم رہی جس کی یہ مستحق تھی۔

قاضی عبدالودود نے لطیف الزماں کی کتاب 'مکتوباتِ غالب' کے پیش لفظ میں لکھا ہے:

''جناب سید اکبر علی ترمذی نے غالب کے فارسی خطوط دریافت کیے ہیں جو غالب کے سفرِ کلکتہ کے بارے میں ہمارے علم میں اہم اور حقیقی اضافہ کرتے ہیں۔ انھوں نے ایک جامع تعارف کے ساتھ ان خطوط کو مرتب کیا ہے اور بڑی محنت سے شاعر کے بیانات کا تقابلی مطالعہ اُس خارجی شہادت سے کیا ہے جو حکومتِ ہند کے سرکاری ریکارڈ میں موجود ہے۔ اُن کی یہ کوشش قابلِ تعریف ہے کہ مختلف اثرات جو شاعر کے ذہن پر مرتب ہو رہے تھے اُن پر تحقیق کی ہے... اِن خطوط کو تاریخی ترتیب دینے میں بڑی باریک بینی سے کام لیا ہے۔ اصل عبارت کے استقرار، اشخاص اور مقامات کے نام جو اُن خطوط میں آئے ہیں ان کے تعین کے سلسلہ میں بڑی ژرف نگاہی سے کام لیا ہے...''

نامہ ہائے فارسی غالب یعنی Persian Letters of Ghalib کا مسودہ کس طرح محفوظ رہ گیا، اس پر سید اکبر علی ترمذی بھرپور روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''... مجموعہ کا مسودہ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا نے 1960 کے لگ بھگ سید محمد رفیع نقوی سے حاصل کیا جو کارا کے رہنے والے ہیں۔ کارا اُتر پردیش ضلع الہ آباد کا ایک تاریخی قصبہ ہے، سید علی حسن خاں اسی قصبہ کے رہنے والے تھے جنھوں نے ان خطوط کو نقل کیا تھا۔ مسودہ کے اختتام پر بہ زبانِ انگریزی یہی لکھا گیا ہے۔ بہر کیف اس بات کا علم قطعیت کے ساتھ نہیں ہو سکا کہ یہ مجموعہ کب مرتب ہوا اور کب نقل کیا گیا لیکن اس کا امکان ہے کہ یہ 1839 میں لکھا گیا۔ یہ بات ضلع باندہ پرگنہ بادوس اور کالنجر کے تحصیل دار سید افضل علی کے ایک خط سے معلوم ہوتی ہے جو 5/اگست 1839 کو منشی سید علی حسن خاں کو ان کے باندہ کے پتہ پر لکھا گیا (خط نمبر 33)۔ منشی سید علی حسن خاں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا لیکن بادوسا[2] اور کالنجر [3] کے تحصیل دار نے جس عزت و تکریم کے ساتھ انھیں مخاطب کیا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ باندہ کی انتظامیہ کے تحت خاصے بڑے عہدے پر فائز رہے ہوں گے۔ امکان ہے کہ ان خطوط کو وہیں نقل کیا گیا۔ اس مفروضہ کی اضافی تصدیق اس حقیقت سے ہوتی ہے کہ اس مجموعہ میں غالب کے خطوط کی بڑی تعداد باندا کے صدر امین یا سول جج مولوی محمد علی صاحب کو لکھے گئے ہیں۔''

'نامہ ہائے فارسی غالب' کی اشاعت کے بعد ہی سفرِ کلکتہ کی مکمل تصویر اُبھرتی ہے اور اس تصویر کے کینوس پر جو منظر نامہ چھاتا ہے وہ محمد علی صدر امین باندہ کا ہے۔ یہ بیش قیمت مسودہ 33/اوراق پر مشتمل ہے۔ ہر صفحے پر اٹھارہ سطور ہیں جن کی پیمائش 7x10' ہے۔ چونتیس خطوں میں سے بتیس خط غالب کے ہاتھ سے لکھے ہوئے ہیں باقی دو خط منشی سید علی حسن کو اُن کے احباب نے لکھے ہیں۔ ان بتیس خطوط کے علاوہ جن میں خط نمبر 5، خط نمبر 2 کی نقل ہے۔ مسودہ میں دو نثر پارے، کلکتہ میں غالب کی ادبی محاذ آرائی کے بارے میں ہیں۔ یہ نثر پارے اس کتاب کے ضمیمے 2-1 کی شکل میں پیش کیے گئے ہیں۔ مسودہ خطِ شکست میں ہاتھ سے بنے ہوئے کاغذ پر سیاہ کاربن روشنائی سے لکھا گیا ہے۔ بہت سے مقامات پر اسے کیڑوں نے کھالیا ہے، جگہ جگہ سوراخ ہو گئے ہیں جن میں سے اکثر کو میں نے کلیاتِ نثر غالب[4] یا کلیات[5] غالب کی مدد سے پُر کرنے کی کوشش کی ہے۔ جہاں ان دو کتابوں سے مجھے مدد نہیں ملی، وہاں میں نے قوسین میں اپنی قیاسی عبارت لکھی ہے۔ بہ صورتِ دیگر ان مقامات کو جنھیں کیڑوں نے چاٹ لیا ہے، نقطوں کے ذریعہ ظاہر کیا گیا ہے۔ مسودہ میں کرم خوردگی کے علاوہ ایک ستم یہ ہے کہ اس میں تاریخ درج نہیں کی گئی ہے۔ جن خطوط میں تاریخ لکھی ہے وہاں سال نہیں دیا گیا ہے۔ نہ ہی خطوط کو کسی خاص تسلسل سے ترتیب دیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ کہ اِن کے مطالعہ سے انتشار، ابتری اور بے ترتیبی کا احساس ہوتا ہے۔ دنوں اور تاریخوں کو مقابلہ اور اندرونی شہادت کی مدد سے میں نے تاریخی اعتبار سے ترتیب دیا ہے۔ ہر خط کے اوپری سرے پر شمار کنندہ تاریخی ترتیب کا تعین کرتا ہے اور نسب نما مسودہ میں پائے جانے والے خط کے مقام کو ظاہر کرتا ہے۔

اوّل تو اِن خطوط کی تاریخی ترتیب غلط ہے دوسرے یہ کہ مکتوب الیہ حضرات کے نام نہیں ہیں۔ سوائے خط نمبر 31/ کے جہاں مکتوب الیہ کا نام ہگلی کے نواب اکبر علی خاں دیا گیا ہے۔ یہ خط ذرا سی تبدیلی کے ساتھ پنج آہنگ کی ابتدا[6] میں ملتا ہے۔ اس مجموعہ میں سات خطوط اور ہیں جو پنج آہنگ میں موجود ہیں۔ اگرچہ کہ ان سات خطوط کی عبارت ذرا مختلف ہے لیکن پنج آہنگ میں ان کے مکتوب الیہ کا نام مولوی محمد علی خاں باندہ دیا گیا ہے۔[7]

اس مشابہت سے مجھے ہمت ملی۔ میں نے عبارت کا غور سے مطالعہ کیا اور قوی باطنی شہادت کی بنیاد پر اس نتیجے پر پہنچا کہ باقی ماندہ 31/خطوط میں سے 27/خط باندہ کے مولوی محمد علی خاں کو لکھے گئے ہیں۔ ایک خط ہگلی کے نواب سید علی اکبر خاں طباطبائی کو لکھا گیا ہے۔ دو خطوط کے مکتوب الیہ اور ان کے پتوں کی شناخت نہیں ہو سکی۔''

سید اکبر علی ترمذی کے اِس طویل اقتباس کی کئی باتیں مرتب کے لیے پریشان کن تھیں۔ مثلاً مسودہ کے اُن حصوں کو جنھیں کیڑوں نے کھالیا تھا، اُس سے پیدا ہونے والے خلا کو انھوں نے مستند اور معتبر حوالوں سے پُر کرنے کی امکانی کوشش کی۔ مکتوب الیہ سے قاری کو ممکن حد تک متعارف کرایا۔ ابتری اور بے ترتیبی کو دُرست کیا۔ تاریخی ترتیب کو بھی ماہ و سال کے ساتھ واضح کرنے کی کوشش کی۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

نمبر1- ''ان خطوط کے مکتوب الیہ مولوی محمد علی خاں، اُتر پردیش ضلع اُناؤ کے قصبہ موہان کے رہنے والے تھے اور کلکتہ کی صدر عدالت کے قاضی القضاۃ یا قاضی اعظم سراج الدین علی خاں کے چھوٹے بھائی تھے۔ محمد علی خاں، برطانوی انتظامیہ کے زیرِ انصرام بندیل کھنڈ میں مفتی کے بڑے عہدے پر فائز تھے۔ ان کا کام اسلامی قوانین کی تفسیر و تشریح کرنا تھا، بعد میں وہ ترقی پا کر باندہ میں صدر امین یا سول جج ہو گئے۔ یہ بڑا اہم عہدہ تھا۔ یہ منصب اس وقت بھی ان کے پاس تھا جب غالب 1234ھ/ 1827 میں باندہ سے گزر کر کلکتہ جا رہے تھے۔ یہ عہدہ انتقال تک ان کے پاس رہا۔ اُن کا انتقال 1247ھ/ 32-1831 میں ہوا۔ وہ مختلف اصناف میں شعر کہتے تھے اور فارسی میں بھی بغیر کسی تخلص کے شاعری کرتے تھے''۔

(بحوالہ علی حسن خاں، صبح گلشن ص 379، کلیات نثر، ص 164، قاضی عبدالودود، مآثر غالب، ص 39)

نمبر2- ''علی اکبر خاں سے ملنے کے فوراً بعد باندہ کے مولوی محمد علی خاں کی ہدایت کے مطابق غالب قاضی القضاۃ کی قبر پر پہنچے۔ 20/رمضان 1243ھ مطابق اتوار 6/اپریل 1828 کو مرحوم قاضی صاحب کی بیوہ کے ہاں اُن کی رہائش اینٹلی میں مولوی محمد علی خاں کا تعارفی خط لے کر پہنچے۔ مولوی غلام علی نے بیگم صاحب سے غالب کا تعارف کرایا۔ انھوں نے پس پردہ رہ کر نہایت لطف اور گرم جوشی سے گفتگو کی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ شملہ بازار شہر سے بہت دور ہے۔ اپنے بھانجے ولایت حسین کے سفر سے آنے کے بعد غالب کو اپنے گھر میں قیام گاہ فراہم کریں گی''۔ (خط 7-6)

(کچھ محققین نے لکھا ہے کہ غالب کلکتہ پہنچنے کے تیسرے دن یعنی 22/فروری کو مذکورہ خط لے کر علی اکبر

خاں کے گھر گئے تھے اور دو ڈھائی گھنٹہ قیام کر کے واپس آگئے تھے۔ دو دن بعد دوبارہ گئے اور رات قیام بھی کیا۔ تیسری بار دہلی روانگی سے قبل وہاں گئے اور پانچ دن قیام کیا۔)

نمبر3- ''20/جون 1828 کو غالب نے باندہ کے مولوی محمد علی خاں کو خط بھیجا اور یہ درخواست کی کہ ان کے لیے مزید ایک ہزار روپے قرض حاصل کیے جائیں...'' (خط نمبر9)

نمبر4- ''...9/اکتوبر 1828 کو غالب کے پاس سو روپے رہ گئے تھے کہ باندہ کے مولوی محمد علی خاں کی جانب سے مولوی ولایت حسین کے توسط سے ایک ہنڈوی ملی۔ غالب خوشی سے پھولے نہ سمائے اور خود بازار گئے تاکہ مالک اور ہنڈوی کی رقم کے بارے میں معلومات حاصل کرسکیں''۔ (خط نمبر11)

نمبر5- ''10/مارچ 1829 کو انھوں نے باندہ کے مولوی محمد علی خاں کو خط بھیجا کہ وہ نواب ذوالفقار علی خاں سے درخواست کریں کہ باندہ کے امین (امی) کرن سے مزید ایک ہزار روپیہ قرض حاصل کریں۔ مرزا مغل کے چھوٹے بھائی مرزا ازبک جان کے لیے انھوں نے ایک خط لفافہ میں رکھ دیا۔ لکھا تھا کہ نواب صاحب کو ترغیب دلائیے کہ اُن کی درخواست مان لی جائے''۔ (خط نمبر18)

نمبر6- ''... ان گزارشات کے نتیجے میں شوال 1244ھ مطابق 2/مئی 1829 کے آخر میں باندہ کے مولوی محمد علی نے انھیں ایک شاہ جوگ ہنڈوی بھیجی۔ غالب نے ہنڈوی مولوی ولایت حسین کو دی اور وہ اُس کے عوض دو سو روپے لے آئے''۔ (خط نمبر20)

نمبر7- ''غالب نے باندہ کے مولوی محمد علی کو 8/محرم 1245ھ مطابق 10/جولائی 1829 کو لکھا کہ دلّی میں منشی محمد محسن کو تاکید کریں کہ ان کے کاغذات جس قدر جلد ممکن ہو روانہ کردیں۔ اسی خط میں اُنھوں نے دو مادہ ہائے تاریخ بھی لکھے''۔ (خط نمبر22)

نمبر8- ''13/صفر 1245ھ مطابق 4/اگست 1829 کو انھوں نے اپنا سامان کشتی کے ذریعے باندہ روانہ کردیا اور خود پنج شنبہ یا جمعہ 19/یا 20/صفر 1245ھ مطابق 20/ 21/اگست 1829 کو روانہ ہوئے...... 30/ اکتوبر 1829 کو باندہ پہنچے...... ہفتہ یکم جمادی الاول 1245ھ مطابق 7/نومبر 1829 کو باندہ سے دہلی کے لیے روانہ ہوئے...... اتوار 29/نومبر 1829 کو دہلی واپس پہنچے''۔ (خطوط 28-24)

نہایت دیانت دارانہ ترتیب و تنظیم اور ممکن وضاحتوں کے باوجود مسودہ کی خستگی سے پیدا ہونے والی قباحتیں، اور خطوط کی صحیح تعداد کے تعین میں جو ضمنی کمیاں رہ گئیں، انھیں پہلے لطیف الزماں خاں نے دُور کرنے کا جتن کیا پھر نہایت یکسوئی اور دلجمعی سے پرتو روہیلہ نے اسے سرانجام دیا۔ انھوں نے غالب کے منتخب فارسی مکتوبات (اردو ترجمہ 2006، دوسرے ایڈیشن 2009 اور 'کلیاتِ مکتوباتِ فارسی غالب' مطبوعہ 2010 کے پیش لفظ میں جو وضاحت درج کی ہے اس سے قاری بڑی حد تک مطمئن ہو جاتا ہے۔ پہلا اقتباس:

''نامہ ہائے فارسی غالب کے ترجمے کے لیے میرے پیشِ نظر سید اکبر علی ترمذی کا وہ مرتبہ نسخہ تھا جو پہلی بار غالب اکیڈمی نظام الدین-نئی دہلی 13، انڈیا سے 1969 میں طبع ہوا۔ اس نسخہ کی اہم چیز مرتب کا وہ انگریزی کا 54 صفحے کا دیباچہ ہے جو اس کی اہمیت کو بڑھاتا اور متن کے سیکڑوں حقائق کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ لیکن اصل متن میں کاتب کی بدخطی اور حیران و پریشان کن تحریفات کے علاوہ سب سے بڑی قباحت اس مخطوطہ کی کرم خوردگی تھی جس کے سبب نثر کے اس شاہکار میں قدم قدم پر شدید بدمزگی اور بے لطفی در آتی تھی۔ مرتب کے لیے اس مشکل سے گلو خاصی بہت آسان تھی کہ کرم خوردہ جگہوں پر نقطے ڈالے اور آگے بڑھ گئے لیکن مترجم کو جملے اور عبارت کے سیاق وسباق کو نظر میں رکھتے ہوئے یہ بھی متعین کرنا تھا کہ نقطہ زدہ جگہ سے ایک لفظ غائب ہے یا ایک جملہ یا کئی سطریں کہ ترجمے کی روانی قائم رکھنے کے لیے اس کو اپنے طور پر قیاسی الفاظ سے خالی جگہ کو پُر کرنا بھی ہوتا تھا۔ اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے میں نے اُس وقت کے ڈائریکٹر جنرل نیشنل آرکائیوز (Archaives) اسلام آباد سے رابطہ کیا اور گزارش کی کہ وہ اپنے ہندوستانی ہم منصب سے اگر اس مخطوطے کی مائیکرو فلم منگوا سکیں تو ہماری مشکل قدرے کم ہو جائے گی لیکن یہ نہ ہو سکا۔ نتیجتاً یہ ساری خالی جگہیں اس طرح رہ گئیں اور ہماری زندگی کے سیکڑوں توجہ طلب شعبوں کی طرح اس منصوبے پر بھی بدنما داغ کی طرح باقی ہیں۔ مترجم نے البتہ حتی المقدور اپنے قیاسی الفاظ سے ان جگہوں کو پُر کیا ہے اور بریکٹ میں لفظ قیاسی لکھ بھی دیا ہے۔ لیکن جہاں ترتیب ٹوٹ جاتی ہے اور مفہوم بھی ساتھ نہیں دیتا اور ظاہر ہوتا ہے کہ خلا وسیع ہے وہاں نثر کے متعلقہ ٹکڑے کا اسی طرح ترجمہ کر کے بریکٹ میں لفظ 'نامکمل' لکھ دیا گیا ہے''۔

پرتو روہیلہ کا یہ دوسرا اقتباس بھی ملاحظہ ہو:

''نامہ ہائے فارسی غالب میں نمبر شمار کے مطابق 31/خطوط ہیں ترمذی صاحب کے دیباچہ کے مطابق اس میں 27/خطوط باندے کے محمد علی خان کے نام ہیں۔ ایک خط نواب سید علی اکبر خان طباطبائی کے نام ہے اور دو خطوط کے مکتوب الیہ 'مردمان معین' ہیں۔ اس صورت حال کے پیش نظر شروع میں فہرست کے آخر میں 'مردمان نامعین' کا ایک علیحدہ عنوان دے کر خطوط نمبر 28، 29 اور 30 کو اسی میں ڈالا گیا تھا لیکن فاضل محقق و غالب شناس ڈاکٹر حنیف احمد نقوی سابق پروفیسر اردو ڈپارٹمنٹ بنارس ہندو یونیورسٹی وارانسی ہندوستان کی تحریری ہدایت پر کہ اس مجموعہ میں صرف دو خط 29-28 ص:90 اور 32-13، ص:100 نواب علی اکبر خاں طباطبائی کے نام جب کہ باقی تمام خطوط محمد علی خان صدر امین باندہ کے نام ہیں۔ فہرست مکتوب الیہم میں ضروری تبدیلی کرلی گئی ہے اور اب 'مردمانِ نامعین' کو فہرستِ مکتوب الیہم سے خارج کردیا گیا ہے۔ میرے لیے یہ سعادت ہے کہ مجھے موصوف کی اس مستند رائے سے بروقت آگاہی مل گئی اور نتیجتاً ترتیب کا ایک بڑا سقم دور ہو گیا''۔

سید اکبر علی ترمذی کے دریافت شدہ مسودے کی بدولت یہ بات بھی اُبھر کر سامنے آتی ہے کہ کلکتہ میں غالب کو جو مخلص اور قابل اعتبار دوست مثلاً مولوی سراج الدین احمد، مولوی عبدالکریم، منشی عاشق علی خاں، آغا محمد حسین، مرزا احمد بیگ تپاں میسر آئے، وہ باندہ اور وہاں کے لائق صد احترام دوست محمد علی صاحب کی بدولت ملے۔ اس گراں قدر کام کی وجہ سے پرتو روہیلہ، لطیف الزماں، قاضی عبدالودود ہی نہیں عصر حاضر کے غالب کے شیدائی ادیب بھی سید اکبر علی ترمذی کو غالبیات کے مطالعات کی فہرست میں بخوشی شامل کرتے ہیں۔ بلاشبہ انھوں نے نہایت توجہ، محنت اور لگن سے دیوان محمد علی کے نام لکھے گئے غالب کے خطوط دریافت کیے ہیں۔ اور مکتوب الیہ پر جس طرح روشنی ڈالی ہے وہ لائق تحسین وستائش ہے۔

حواشی

1 'نامہ ہائے فارسی غالب' کے فارسی متن اور طویل انگریزی مقدمہ کا اردو ترجمہ لطیف الزماں خاں نے 'مکتوبات غالب' کے نام سے دسمبر 1995 میں شائع کیا۔
2 ضلع باندہ میں تحصیل اور پرگنہ ڈی ایل ڈریک بروخ مین، باندہ اے گزیٹر (الٰہ آباد 1909) صفحات، 7-203
3 مشہور پہاڑی قلعہ اور قصبہ تحصیل گردان باندہ ایضاً ص: 234-47
4 کانپور ایڈیشن 1875
5 مرتبہ امیر حسن نورانی لکھنؤ، 1968
6 کلیات نثر غالب، ص96
7 کلیات نثر غالب، ص 164-71

Sagheer Afrahim
Ex. Head: Dept of Urdu
Aligarh Muslim University,Aligarh-202001 (UP)
Email.: s.afraheim@yahoo.in

بہار میں رثائی ادب

سلطان آزاد

'رثا' سے لفظ مرثیہ بنا۔ اصطلاح میں مرثیہ اس نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی کی موت پر رنج والم کا اظہار ہو۔ اس کی وضاحت میں کئی دانشوران علم وادب نے اپنی اپنی رائے پیش کی ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں: 'رثا' یا 'رثی' کے معنی کسی کی موت پر آہ وزاری کرنا۔ عربی میں جو شاعری کے موضوع شمار کرائے گئے ہیں اس میں رثا کو ہمیشہ شامل کیا گیا ہے۔ عزیزوں اور محبوبوں کی وفات پر آنسو بہانے کے لیے جو نظمیں لکھی جاتی ہیں وہ مرثیہ کہلاتی تھیں'' (بحوالہ: ادبی اصناف از ڈاکٹر گیان چند جین)

اسی کڑی کو آگے بڑھاتے ہوئے الطاف حسین حالی فرماتے ہیں:

''مرثیہ کے معنی ہیں کسی کی موت پر جی کڑھنا اور اس کے محامد اور محاسن بیان کر کے اس کا نام دنیا میں زندہ رکھنا۔''

(بحوالہ: مقدمہ شعروشاعری از الطاف حسین حالی)

عام طور سے محققین کی رائے ہے کہ لفظ مرثیہ عربی لفظ کا مشتق ہے اور اس کا مولد ومسکن عرب ہے۔ اس سلسلے میں قاسم نقوی لکھتے ہیں:

''مرثیہ کا صحیح مرکز ملک عرب ہے اور زبان عربی ہے۔'' (بحوالہ: رسالہ شاعر ممبئی، جولائی 1971)

گویا عربی میں رثائی شاعری بالخصوص مرثیہ نگاری کے جائزے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں دور جاہلیت سے ہی مرثیہ گوئی کی روایت رہی ہے۔ خصوصی طور پر حضرت امیر حمزہؓ کی شہادت پر کئی عربی شعرا نے مرثیے کہے خصوصی طور پر حضرت کعب بن مالک انصاری نے بھی مرثیہ لکھا۔ جس میں اظہار غم کے علاوہ کئی اشعار تلوار کی تعریف میں کہے گئے تھے جو عربی مرثیہ نگاری میں نئی ایجاد تھی۔

فارسی رثائی شاعری میں ایران کے حوالے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا باضابطہ رواج قیام صفوی کے دور حکومت میں ہوا۔ اس دور کا کامیاب مرثیہ محتشم کاشی کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ بقول علامہ شبلی نعمانی ''محتشم کاشی نے آٹھ، دس بندوں کا ایک مرثیہ لکھا جو درد وغم کی مجسم تصویر ہے اور اس کا جواب آج تک نہ ہو سکا۔''

(بحوالہ: موازنہ انیس ودبیر از علامہ شبلی نعمانی)

اگرچہ اس دور کے دیگر مرثیہ نگاروں میں مقبل، مخلص، موزوں نسیم، حاجی محمد جان قدسی اور شفیع وغیرہ بھی تھے۔ (بحوالہ: دبستان دبیر از ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی)

ان فارسی شعرا کے علاوہ اہم فارسی مرثیہ نگاری میں شیخ سعدی اور حضرت امیر خسرو کے نام بھی سرفہرست ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

''شیخ سعدی اور امیر خسرو کے دو مرثیے بہت مشہور ہیں اور چونکہ دل سے نکلے ہیں حسرت خیز اور درد انگیز ہیں۔'' (بحوالہ: موازنہ انیس ودبیر از علامہ شبلی نعمانی)

اردو مرثیہ نگاری کی ابتدا کب ہوئی اس کی کوئی واضح تاریخ نہیں ملتی۔ اس سلسلے میں علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

''یہ معلوم نہیں کہ مرثیے کی ابتدا کس نے کی لیکن اس قدر یقینی ہے کہ سودا اور میر سے پہلے مرثیے کا رواج ہو چکا تھا۔'' (بحوالہ: موازنہ انیس ودبیر از علامہ شبلی نعمانی)

تاریخ ادب اُردو اور مختلف تحقیق سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اُردو رثائی شاعری بالخصوص مرثیہ نگاری میں پہل صوفیائے کرام نے کی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انھیں عوامی طور پر شہرت نہیں ملی یا تشہیر نہیں کی گئی، جو بعد کے مرثیہ گو کو شہرت ملی لیکن ان میں نداقی، طپاں، ظہور اور وسعت کو تقدم ضرور حاصل ہے۔ ہندوستان میں اردو شعرا نے بھی اہل عرب کی طرح شخصی مرثیے کہے ہیں لیکن اُردو مرثیہ کی جو روایت باضابطہ طور پر شروع ہوئی اور رائج ہوئی وہ خصوصی طور پر واقعات کربلا حضرت امام حسینؓ اور ان کے رفقا کے لیے مخصوص ہوئی۔

مختصر یہ کہ ہندوستانی رثائی ادب میں مقبول ترین صنف مرثیہ نگاری تو ہے لیکن اس کے ارتقائی دائرے میں سلام، نوحہ وغیرہ بھی شامل ہیں، جس پر شعرائے اردو کثرت سے طبع آزمائی کرتے رہے ہیں جو بدستور جاری ہے۔

صوبہ بہار علم وادب کا قدیم گہوارہ رہا ہے۔ یہاں بھی رثائی ادب کی تاریخ بہت قدیم ہے بقول ڈاکٹر اختر اورینوی:

''بہار کے ابتدائی مرثیے 1206ھ کے ملتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ شاہ آیت اللہ اور ان کے صاحبزادے شاہ

غلام علی وسعت کا ایک ایک مرثیہ ملا ہے، جس پر 1206ھ درج ہے۔ اس سے قبل کا مرثیہ انھیں نہیں ملا۔''

(بحوالہ: بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء از ڈاکٹر اختر اورینوی)

اس تحقیق کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے متین عمادی فرماتے ہیں:

''حضرت شاہ آیت اللہ کا سال وفات یکم رجب 1210ھ ہے یعنی یہ مرثیہ جسے اختر اورینوی صاحب نے دیکھا وہ ان کی ضعیفی کی عمر کا مرثیہ ہے۔ میں نے حضرت نورالحق طپاں (1156ھ/4 شعبان 1233ھ) کے 46 مرثیوں کی جو بیاض کتب خانہ عمادیہ میں دیکھی ہے اس میں 1184ھ سے لے کر 1200ھ کے مرثیے ہیں۔ اور ہر مرثیہ پر سنہ دیا ہوا ہے۔ مرثیہ اوّل و دوم پر سُرخ روشنائی سے 1184ھ درج ہے۔ اس طرح مرثیہ نگاری کی تاریخ اور بھی قدیم ہو جاتی ہے۔ میں بے تکلف کہہ سکتا ہوں کہ مرثیہ نگاری کا آغاز بہار میں 1184ھ سے ہوا ہے۔''

(بحوالہ: مراثی ظہور مرتبہ متین عمادی، ص 14، مطبوعہ 2006)

گو کہ یہ بات ثابت ہوگئی کہ بہار میں رثائی شاعری کی ابتدا باضابطہ طور پر 1184ھ سے شروع ہو چکی تھی۔

رثائی ادب میں تو صوفیائے پھلواری شریف نے ابتدائی دور جسے تشکیلی دَور بھی کہہ سکتے ہیں، نہ صرف شروعات کی بلکہ اسے فروغ دینے میں بھرپور کوششیں بھی کیں۔ اس سلسلے میں متین عمادی اپنے مضمون بعنوان 'بہار کے چند مرثیہ نگار صوفی شعرا' میں فرماتے ہیں:

''اس قصبے کے صوفی حضرات نے بہار میں مرثیہ نگاری کو جنم دیا اور اسے پروان چڑھایا۔ ان ہی قدسی نفوس سے بہار میں مرثیہ نگاری کی تاریخ مرتب ہوتی ہے۔''

(بحوالہ: بہار کے چند مرثیہ نگار صوفی شعرا از متین عمادی، مطبوعہ النّاصر، پٹنہ، 1402ھ)

تاریخ ادب اُردو اور مختلف تحقیق سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اُردو رثائی شاعری بالخصوص مرثیہ نگاری میں پہل صوفیائے کرام نے کی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انہیں عوامی طورپر شہرت نہیں ملی یا تشہیر نہیں کی گئی، جو بعد کے مرثیہ گو کو شہرت ملی لیکن ان میں مذاقی، طپاں، ظہور اور وسعت کو تقدم ضرور حاصل ہے۔ ہندوستان میں اردو شعرا نے بھی اہل عرب کی طرح شخصی مرثیے کہے ہیں لیکن اُردو مرثیہ کی جو روایت باضابطہ طورپر شروع ہوئی اور رائج ہوئی وہ خصوصی طورپر واقعات کربلا حضرت امام حسینؑ اور ان کے رفقا کے لیے مخصوص ہوئی۔

بہار کی رثائی شاعری میں مرثیہ کے علاوہ نوحہ، مسدس، سلام اور قصیدہ وغیرہ بھی شامل ہیں، جسے رثائی شعرا نے ہر دور میں بڑی دلجمعی اور عقیدت و محبت کے ساتھ طبع آزمائی کرتے رہے ہیں۔ یہ سلسلہ زمانہ قدیم سے آج تک جاری ہے۔ لہٰذا بہار کے رثائی ادب کو تاریخی اور تحقیقی اعتبار سے بالترتیب چار ادوار میں تقسیم کرتے ہوئے ارتقائی منزل تک پہنچا جا سکتا ہے۔ وہ ادوار اس طرح ہیں: (1) آغاز اور ابتدائی دور (2) تعمیری دور (3) ارتقائی دور اور (4) جدید دور۔

آغاز اور ابتدائی دور:

یہ دور رثائی شاعری یعنی اردو مرثیہ نگاری کا تشکیلی دور ہے۔ اس دور کے زیادہ تر شعرا صوفی ہیں یا تصوف پسند ہیں۔ اس دور میں مرثیہ یا دوسرے رثائی کلام میں ابتدائی نقوش کے علاوہ ان میں تصوف کا بھی بھرپور رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ ایسے دور کے مرثیوں میں جذبات و تاثرات کے سمندر جیسے بہاؤ ملتے ہیں جن میں درد کی گہرائیاں ہیں اور اس میں غم ہی غم ہیں۔ علاوہ ازیں اس دور میں علاقائی زبان بھی جلوہ گر ہے جن میں مگہی یا پوربی، فارسی اور اردو کی آمیزش ہے۔ اس دور کے رثائی شعرا جن کے تذکرے ہمیں بازیافت میں ملتے ہیں ان میں شاہ آیت اللہ جوہری، غلام جیلانی محزوں، مفتی غلام مخدوم ثروت، شاہ نورالحق تپاں، شیخ غلام علی راسخ عظیم آبادی، شاہ امان علی ترقی، شاہ ظہورالحق ظہور، غلام شبلی وسعت، شاہ ابوالحسن فرد، قاضی مخدوم عالم مخدوم، سید شاہ غلام حسن، حسن عظیم آبادی، مولانا شاہ عبدالغنی، مولانا احمدی عظیم آبادی، پیر شاہ دمڑی فقیر، مولوی محمد عالم علی، حیدری وغیرہ میں رثائی شاعری کے وہ نقوش ملتے ہیں جس میں اعلیٰ قسم کی فنکاری اور بھرپور رثائیت ہے۔

اس دور میں بہار کی رثائی شاعری میں اور بھی بہت سے شعرا ہوئے ہیں یہ اور بات ہے کہ ان کے مراثی یا دوسرے رثائی کلام مثلاً نوحہ، سلام وغیرہ دستیاب نہیں ہیں یا زمانہ کی گردشوں میں گُم ہوگئے یا ضائع ہوگئے۔ ان شعرا کے اسمائے گرامی اس طرح درج کیے جاتے ہیں۔

* شاہ محمد وحدت (1217ھ تا 1295ھ)
* مولوی علی وارث (1227ھ تا 1296ھ)
* مولوی وجیہ (1213ھ تا 12965ھ)
* مولوی سید ابراہیم (......................)

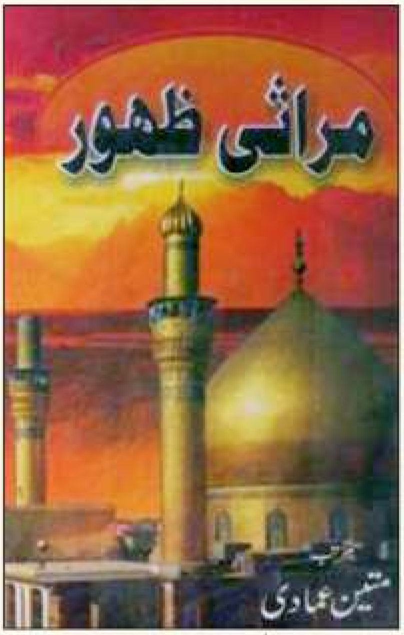

* مولوی کمال علی (......................)
* مولوی رضی الدین (......................)
* مولوی محمد طالع مغموم (......................)
* قاضی حق (......................)

اس کے علاوہ اسپرنگر نے صوبہ بہار کے کچھ شعرا جو مرثیہ گو تھے ان کا ذکر کیا ہے۔ وہ سبھی قدیم مرثیہ گو ہیں ان کے متعلق جناب ذکی الحق نے اپنے مضمون بعنوان 'بہار کے مرثیہ گو' میں ضمناً ذکر کیا ہے ان کے اسمائے گرامی اس طرح ہیں:

(1) غلام حسن حسن (شاگرد عشقی)، (2) میر ممنون حیراں (مظلوم، مرثیہ گوئی کے لیے) (3) سید اللہ بخش شیفتہ دہلوی، (4) سید محمد خاں نواب، (5) مرتضیٰ خاں نثار دہلوی، (6) میاں محمد نجات دہلوی وغیرہ۔

تعمیری دور:

یہ عہد رثائی شاعری بالخصوص مرثیے کی ترقی کے لیے نہایت سازگار ثابت ہوا۔ مرثیے نے ارتقائی منزلیں طے کیں۔ صوبہ بہار میں جس کا مرکز دبستان عظیم آباد بنا۔ یہی وہ دور ہے جسے میر انیس اور مرزا دبیر کا دور بھی کہہ سکتے ہیں۔ اسی زمانے میں مرزا دبیر کا تعلق عظیم آباد سے ہوا۔ اس دور میں رثائی شاعری کے تحت مرثیہ، مسدس، نوحے اور سلام وغیرہ بھی خوب کہے گئے۔ بہار کی رثائی شاعری میں اس دور کی نمائندگی کرنے والے شعرا میں صفیر بلگرامی، شاد عظیم آبادی، عفت عظیم آبادی، حسن کھجوی، فقیر حسن عظیم، دوست محمد فہیم، شمیم کھجوی، سید مظہر حسن مظہر، میر سید محمد زکی بلگرامی، سید محمد باقر متین، حلم شیخ پوروی، فضل حق آزاد عظیم آبادی، بہار حسین آبادی، خورشید کاظمی، حامد عظیم آبادی، کاظم حسین زار عظیم آبادی، حفاظت بھیک پوری،

بدرالدین احمد بدر عظیم آبادی، مظہر عظیم آبادی، مرتضیٰ رشید، نوازش حسین مداح، کامل دھرمپوری، مشتاق کریم چکی، اسحاق فریدی، مائل دھرم پوری اور خلیل بریلوی وغیرہ۔

اس دور، یعنی تعمیری دور کے دیگر رثائی شعرا میں درج ذیل شعرا بھی ہیں، جن کے تذکروں میں ان کی رثائی شاعری، مثلاً مرثیہ، نوحہ، سلام وغیرہ کہنے کی صرف اطلاعات ملتی ہیں۔ نمونۂ کلام نہیں۔ ممکن ہو کہ ان کے ایسے کلام پردۂ اخفا میں ہوں لہٰذا ان کے اسمائے گرامی درج کیے جاتے ہیں، جو اس طرح ہے: شاہ انوار عالم المتخلص بہ شاہ عظیم آبادی (تلمیذ مرزا دبیر)، علامہ سریر کابری کے والد سید شاہ رستم علی، احمد در بھنگوی، اظہر کاظمی، شفیع فریدی، مظہر فاروقی، حکیم مولانگری، میر فدا حسین بحر، میر ممتاز حسین نہر، اختر حمزہ پوری اور حیرت حمزہ پوری وغیرہ۔

ارتقائی دور:

یہ وہ دور ہے، جب رثائی ادب میں مرثیہ نگاری، نوحہ اور سلام وغیرہ بام عروج پر پہنچ چکا تھا۔ اگرچہ اس دور میں مراثی سے عجائب پرستی کا عنصر ختم ہوا۔ صبر و استقامت کے تاریخی نقوش ابھارے گئے۔ اس طرح مرثیے کی متانت اور سنجیدگی میں اضافہ ہوا۔ عہد کی ضرورت کے پیش نظر تبدیلیاں ہوئیں۔ اس دور کی نمائندگی کرنے والے شعرائے کرام میں علی اکبر کاظمی، شمیم گوپالپوری، ندیم گوپالپوری، مظفر حسین آبادی، جمیل مظہری، عطا کاکوی، عابد کھجوی، منظر عظیمی، حیات حسین وفا، اصغر امام فلسفی، احسن رضوی داناپوری، یحییٰ نقوی، دانش عظیم آبادی، جذب گوپالپوری، سید مہدی حسن مہدی، نقی احمد ارشاد، ہوش عظیم آبادی، وفا ملک پوری، نسیم عظیم آبادی، ناصر زیدی، تپش گوپال پوری، قاسم صہبا جمیلی، نادم بلخی، صابر بہاری، شہزاد معصومی اور سید اشتیاق حسین کیف عظیم آبادی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

جدید دور:

ادب میں رثائی شعرا بہت کم ہیں۔ جو لوگ مرثیہ کہہ بھی رہے ہیں ان کے بند اب دو سو یا تین سو بند کے نہیں بلکہ بہ مشکل سو سے ڈیڑھ سو سے زائد بند نہیں کہتے۔ کیونکہ سننے والوں کے پاس نہ وقت ہے اور نہ سنانے والے کے پاس۔ طوالت سے گریز کیا جاتا ہے۔ اس دور میں نوحے، سلام، رباعی اور رثائی نظمیں کہیں جاری ہیں۔ گویا ضروریات کے تحت تبدیلیاں کی گئیں۔ اگرچہ اس میں بھی بھرپوری رثائیت ہے۔ تبلیغی، اصلاحی اور انقلابی رُخ بھی نظر آتا ہے۔ غرض، محض تقلید پر اکتفا نہیں بلکہ اجتہاد کے مظاہرے ایسے کلام میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس دور کی نمائندگی کرنے والے شعرا میں، شہرت بلگرامی،

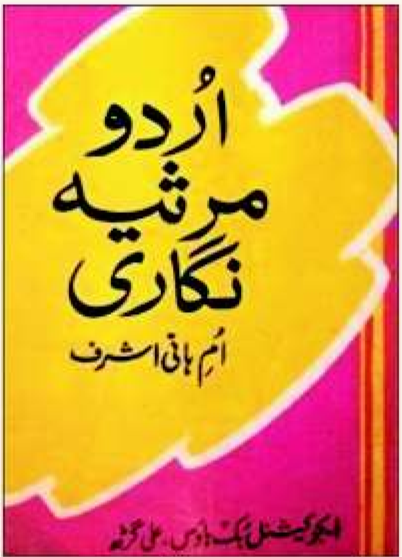

اختر عظیم آبادی، جرار رضوی، مرتضیٰ اظہر رضوی، پیارے مرزا، معین افغانی، صبا نقوی، حسن نواب حسن، ارتضیٰ رضوی، عابد رضا عابد، تراب حسین فردوسی عظیم آبادی، متین عمادی، رہبر حسین آبادی، گوہر شیخپوروی، سید رضا مہدی رضا، سید مشتاق حسین وقار عظیم آبادی، اسد رضوی، شمیم عظیم آبادی، محسن رضا رضوی، رباب زیدی اور رومان رضوی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

رثائی شاعری کے فروغ میں عزائی انجمنوں کا بھی اہم رول رہا ہے۔ جو عزا خانوں نیز امام باڑوں میں قبل مجالس پیش خوانی اور بعد مجالس ماتمی جلوس میں مرثیے اور نوحے وغیرہ لحن میں پڑھے جاتے ہیں۔ ایسے ماتمی جلوس کا اہتمام محرم اور چہلم کے موقع پر خصوصی طور سے ہوتا ہے۔ ایسی انجمنیں بہار کے اہم شہروں میں عظیم آباد (پٹنہ) کے علاوہ مظفرپور، شیخ پورہ، حسین آباد اور کھجوہ وغیرہ علاقوں میں بھی موجود ہیں۔ فی الوقت مرکز بہار، عظیم آباد (پٹنہ) کی کچھ اہم عزائی انجمنیں اس طرح ہیں:

انجمن پنجتنی، پٹنہ سٹی۔ انجمن حسینیہ، باؤلی، پٹنہ سٹی۔ انجمن حیدری، پٹنہ سٹی۔ انجمن سجادیہ، پٹنہ۔ انجمن دستہ سجادیہ، پٹنہ سٹی۔ انجمن عباسیہ، پٹنہ سٹی۔ انجمن ہاشمیہ، پٹنہ۔ انجمن قاسمیہ، پٹنہ۔ انجمن اصغریہ، پٹنہ سٹی۔ انجمن معصومیہ، پٹنہ سٹی۔ انجمن جعفریہ، پٹنہ سٹی۔ انجمن فیض معصومین، پٹنہ سٹی۔ انجمن زینبیہ، پٹنہ سٹی اور انجمن معین العزا (وقف ہاؤس گلزار باغ، پٹنہ) وغیرہ۔

درج بالا عزائی انجمنوں کے علاوہ رثائی شاعری کے فروغ میں رسالہ، اخبار و جرائد کا بھی حصہ رہا ہے۔ اس میں خصوصی طور پر رسالہ الناصر (پٹنہ سٹی) اور دیگر مقامی اخبارات کے ساتھ ریڈیو، پٹنہ کی اُردو سروس کا بھی خصوصی پروگرام ہر سال بہ موقع محرم اور چہلم نشر ہوتا ہے۔ جس میں بہار کے اہم رثائی اور مرثیہ خواں حصہ لیتے رہے ہیں۔

مختصر یہ کہ بہار میں رثائی ادب کو فروغ دینے اور اسے ارتقاء کی منازل تک پہنچانے میں جہاں بہتیرے شعرا کا حصہ رہا وہیں عزائی انجمنوں، رسائل و اخبارات اور الکٹرانک میڈیا میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا بھی دخل رہا ہے، جس کی شمولیت اور ذکر لازم ہے۔

حوالے:

1. اردو مرثیہ نگاری: اُمِ ہانی اشرف
2. اردو مرثیے کا ارتقا: ڈاکٹر مسیح الزماں
3. انیس و فردوسی کا تقابلی مطالعہ: ڈاکٹر فدا حسین
4. ادبی اصناف: گیان چند جین
5. اردو ادب کی تاریخ میں نالندہ ضلع کی خدمات: ڈاکٹر عشرت آرا سلطانہ
6. بہار میں اُردو زبان و ادب کا ارتقا: ڈاکٹر اختر اورینوی
8. بہار میں اردو مرثیہ نگاری کا ارتقا: ڈاکٹر محمد ارمان
8. بہار میں تذکرہ نگاری: ڈاکٹر منصور عالم
9. بحر الفصاحت: محمد نجم الغنی نجمی
10. بیسویں صدی کے اردو مرثیہ نگار: عاشور کاظمی
11. پیغمبران سخن: شاد عظیم آبادی
12. تذکرہ بزم شمال جلد اول: شاداں فاروقی
13. تذکرہ شعرائے سارن: مسیح بہواروی
14. تاریخ ادب اردو، جلد سوم: وہاب اشرفی
15. تاریخ شعرائے بہار جلد اول: سید عزیز الدین بلخی بہ راز عظیم آبادی
16. تذکرہ آرہ: ایک شہر سخن: ش۔م۔ عارف ماہر آروی
17. تذکرہ اردو شعرائے پلاموں: ارشد قمر
18. تذکرہ مسلم شعرائے بہار (مکمل): حکیم سید احمد اللہ ندوی
19. تذکرہ مشاہیر ادب: شیخ پورہ: ابوالکلام رحمانی
20. دبستان دبیر: ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی
21. دبستان عظیم آباد: سلطان آزاد
22. ذکر و مطالعہ: ذکی الحق
23. عکس اشک: محسن رضا رضوی
24. فضل حق آزاد عظیم آبادی: عصر حیات اور فن: ڈاکٹر روحی حسن مجید
25. گل رعنا: حکیم سید عبدالحیٰ
26. مقدمہ شعر و شاعری: الطاف حسین حالی
27. موازنہ انیس و دبیر: شبلی نعمانی
28. مراثی شاد: شاد عظیم آبادی، مرتبہ نقی احمد ارشاد
29. مراثی ظہور: شاہ ظہور الحق ظہور: مرتبہ از متین عمادی
30. مرزا سلامت علی دبیر: حیات اور کارنامے: مرزا محمد زماں آزردہ
31. مظفرپور، علمی، ادبی اور ثقافتی مرکز: محمد حامد علی خاں
32. رسالہ الناصر۔ خاص نمبر: محرم نمبر، پٹنہ سٹی: مدیر ناصر زیدی

■

Sultan Azad
Sultan Azad, Pannu Lane Gulzarbagh
Patna- 800007 (Bihar)
Mob.: 8789934730

فرحت نادر رضوی

اجتبیٰ رضوی بہ حیثیت نظم نگار

شاد عظیم آبادی کے بعد بہار میں اردو شاعری کے حوالے سے تین نام خصوصی اہمیت کے ساتھ لیے جاتے رہے ہیں، پرویز شاہدی (1919 تا 1968)، جمیل مظہری (1904 تا 1980) اور اجتبیٰ حسین رضوی (1908 تا 1991)۔ معاصر ہونے کے علاوہ یہ گہرے دوست بھی تھے، ان تین شعرا کے درمیان پرویز شاہدی اسلوب اور فکر کے اعتبار سے کافی مختلف نظر آتے ہیں، جبکہ اجتبیٰ رضوی اور جمیل مظہری میں مغائرت کے باوجود کہیں کہیں شدید مشابہت بھی پائی جاتی ہے، اور ان دونوں کے شعروں پر ایک دوسرے کا شبہہ بھی ہوتا ہے، دراصل یہ صاحبان اس قدر بے تکلف تھے کہ اکثر ایک ہی زمین پر طبع آزمائی کرتے اور بعض اوقات یوں بھی ہوتا کہ باہم اشعار کی رد و بدل کر لی جاتی، لیکن ایسا ہمیشہ ہی ہوا ہو، یہ قطعی ممکن نہیں، کیونکہ تفلسف و تفکر، غیاب و شہود، حیات و مقصد حیات جیسے ماورائی موضوعات کے علاوہ زمینی موضوعات اور عصری حسیت کے حوالے سے بھی ان کے درمیان رد عمل اور اظہاری رویوں میں گہری انفرادیت نمایاں ہے، ڈاکٹر منظر اعجاز (سابق صدر شعبہ اردو اے این کالج پٹنہ) نے بہت درست بات کہی ہے:

''میلان طبع کے لحاظ سے پرویز شاہدی ترقی پسند تھے، جمیل مظہری اپنے جذب دروں سے مغلوب مجذوب صفت لیکن فلسفی شاعر تھے، اجتبیٰ رضوی کا میلان متصوفانہ اور عارفانہ تھا۔''

(شاد کے بعد بہار کی شعری مثلیث، پرویز شاہدی، جمیل مظہری، اجتبیٰ رضوی: مرتبہ ڈاکٹر محمد حامد علی خان، ص 21)

اسی حوالے سے پروفیسر علیم اللہ حالی (سابق صدر شعبہ اردو، مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا) لکھتے ہیں:

''جمیل مظہری کے یہاں عصری شعور کا اظہار کبھی راست مخاطبت، للکار اور حدی خوانی کے انداز میں سامنے آتا ہے، یا پھر موضوعات و مسائل فلسفیانہ سطح پر پہنچ جاتے ہیں...انھوں نے اس خارجی تغیر کو رومانی تصورات میں تبدیلی کے حوالے سے پیش کیا ہے، جبکہ پرویز نے ان موضوعات و مسائل کو اپنی ذات کے حوالے سے پر اثر بنایا ہے، اجتبیٰ رضوی کی شاعری میں جو خفتہ شعلگی اور داخلی التہاب کی کیفیت ملتی ہے اس میں خارجی موضوعات زیریں لہر کے طور پر نظر آتے ہیں۔ ان کی متصوفانہ کیفیت اور تھیوسوفیکل فکر کی وجہ سے بظاہر ایک گریز کا اندازہ ہوتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے خارجی وقوعوں نے اپنی ذات میں محبوس ہو جانے پر مجبور کر دیا ہے...اجتبیٰ رضوی کی شاعری میں موضوعات دھندلکے میں پوشیدہ ہو جاتے ہیں، ان کی عارفانہ اور فلسفیانہ شخصیت مسائل کو Etheric سطح پر لے جاتی ہے اور بسا اوقات قاری کے پیش نظر ایک متحرک عکس لطیف ہی آپاتا ہے۔''

(ایضاً ص 16,17,18)

مندرجہ بالا بیانات کافی حد تک درست ہیں لیکن مسائل کا بیان ہمیشہ ہی Etheric سطح سے ہوا ہو، ایسا سمجھنا درست نہیں، دراصل اجتبیٰ رضوی کی شاعری کے مختلف ادوار ہیں جن میں ان کی شاعری مختلف فکری، جذبی، نظریاتی اور اظہاری جہتوں کی حامل نظر آتی ہے، اگرچہ ان کا عمومی رجحان ہمیشہ ہی گہرا فلسفیانہ رہا ہے، جس کی ایک اہم وجہ ایسے ماورائی موضوعات ہیں جو ایک باریک رشتے سے مادی حالات و عوامل کے ساتھ گندھے ہوئے ہیں، جن پر انھوں نے زیادہ لکھا ہے، چنانچہ قارئین کی عمومی توجہ ان کی شاعری کے ان زیادہ لکھے جانے والے مخصوص حصوں پر ہی رہی ہے، جس کی وجہ سے مندرجہ بالا خیال ناقدین کے درمیان فروغ پا گیا، لیکن ان کی شاعری کا ایک دور ایسا بھی رہا جب انھوں نے شوریدہ انسانی جذبات اور لطیف احساسات سے لبریز نہایت خوبصورت اور عام فہم شاعری کی، حب الوطنی اور قومیت کے جذبات سے لبریز احساس کو جھنجھوڑنے والی پیامی نظمیں لکھیں اور عصری سیاست، معاشی استحصال اور عدم مساوات جیسے زمینی مسائل کے حوالے سے طنز کی گہری کاٹ رکھنے والی حساس شاعری کی، یہ اور بات ہے کہ ان کے یہاں ارضی موضوعات

کے بیان میں بھی اس داخلی التہاب اور شعلگی کی دبی دبی لہریں محسوس کی جاسکتی ہیں جو ان کی شاعری کے مزاج کے ساتھ مخصوص ہے۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ ان کی شاعری کا یہ حصہ ان کے عرفانی مشاہدات اور روحانی اکتسابات سے لبریز مخصوص قسم کی شاعری کے بالمقابل قلیل نظر آتا ہے۔

اجتبیٰ رضوی زود گو نہ تھے، گفتگو کی طرح ہی شاعری بھی بہت نہیں کی، لیکن فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہے۔ نظم، غزل، اور رباعیات وقصائد کے علاوہ ان کی ایک آزاد نظم 'پہنائی' (غیر مطبوعہ) ان کے شعری اثاثے کی صورت دستیاب ہوئی ہے۔ ان کے علاوہ ان کی نثریات ایک دستی روزنامچے کی صورت میں موجود ہیں جن میں انھوں نے اپنے عقائد و نظریات زندگی اپنے ذاتی تجربات کے افشردے کی صورت قلم بند کیے ہیں، ایک اور نہایت چھوٹی ڈائری ہے جس میں انھوں نے اپنے مخصوص روحانی تجربات واکتسابات اشاروں کی زبان میں لکھے ہیں۔

زیر نظر مضمون میں ان کی نظم نگاری کے حوالے سے گفتگو کی جارہی ہے۔

شعلہ ندا میں ان کی نظموں کی کل تعداد 29 ہے جس میں 5 شخصی نوعیت کی نظمیں ہیں جن میں شاعر نے ٹیپو سلطان، مہاتما گاندھی، نہرو اور مولانا آزاد سے متعلق اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے، ایک نظم 'گاندھی لنلتھ گو ملاقات' ہے جس میں عصری سیاست کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے، 4 نظمیں ذاتی نوعیت کی ہیں جس میں شاعر نے اپنی جذباتی کیفیات کا بیان نہایت پر سوز و دلگداز انداز میں کیا ہے۔ دو نظمیں 'ہلال عید' اور 'صبح بنارس' اس دور کی نظمیں ہیں جب شاعر کے دل کی دنیا آباد تھی، شوخی بیان اور شگفتگی احساس ان نظموں سے چھلکی پڑتی ہے، خصوصاً صبح بنارس وہ شاندار نظم ہے جس سے نہ صرف یہ کہ ان کی مذہبی کشادہ قلبی کا احساس ہوتا ہے، بلکہ شاعر کا فن اس نظم میں اپنے نقطہ عروج پر ہے، اس نے لفظوں میں ہندوستان کی روایتی تصویر کو زندہ محفوظ کر لیا ہے، ایک نظم 'سہرا' ہے جو چیف جسٹس (پٹنہ ہائی کورٹ) سرور علی کے عقد مسنون کے حوالے سے نظم کی گئی ہے، ان کے علاوہ کل 17 نظموں میں شاعر نے اپنی مخصوص فکر اور فلسفہ حیات کے حوالے سے گفتگو کی ہے، کہیں وہ بالعموم اولاد آدم کا درد بیان کرتا ہے اور کہیں بالخصوص امت مسلمہ سے دو بہ دو گفتگو کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان نظموں میں میٹافزکس، سائنسی رموز و نکات، انسانی نفسیات، فلسفہ مذہبیات، تشکیک وتلاش، اقرار و اعتراف اور رد و قبول نظریات کے تمام مراحل بیان ہوئے ہیں۔ نظموں کا یہ حصہ عوامی حصہ شاعری سے مختلف ہے، یہاں ان کے اسلوب کی دبازت قاری سے دقت نظر اور ژرف بینی کی متقاضی ہوتی ہے۔ بالخصوص غیاب و شہود سے متعلق موضوعات کی عارفانہ رمزیت ایک خاص سطح فکر کے حامل اذہان پر ہی منکشف ہوسکتی ہے، مخصوص حسی در کے تجربوں سے گزرے بغیر شاعر کے مخصوص اکتسابات روحانی ومحرکات وجدانی کی سریت و رمزیت تک قارئین کی رسائی ناممکن ہے، اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اجتبیٰ رضوی کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرنے والوں کے لیے بھی ان کی شاعری کے حوالے سے قلم اٹھانا مشکل رہا ہے، ان پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ لیکن جو کچھ لکھا گیا ہے وہ قابل قدر ہے، چنانچہ اختر اورینوی 'صبح بنارس' کو 'اردو شاعری کا تاج محل' کہتے ہیں جبکہ 1963 میں 'نگار' پاکستان میں فرمان فتح پوری نے نیاز فتح پوری کا قلمی چہرہ لکھتے ہوئے یہ بات کہی تھی کہ نیاز صاحب کو اردو کے جن شعراء کا کلام بے حد پسند تھا ان میں جمیل مظہری اور اجتبیٰ رضوی ہیں.... نیاز فتح پوری کے قول کے مطابق جمیل مظہری اور اجتبیٰ رضوی کے کلام میں جو چیز قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے وہ ''صاحب دلانہ طرز فکر'' ہے'

(ماخوذ از جمیل، پرویز اور اجتبیٰ: تقابلی مطالعہ ڈاکٹر محمد توقیر خاں، شعبہ اردو فارسی، ویر کنور سنگھ یونیورسٹی آرہ، ایضاً ص 53)

آغا عماد الدین احمد اجتبیٰ رضوی کو 'ماضی، حال اور مستقبل کے کشادہ پس منظر میں شاعری کرنے والا شاعر تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شعلہ ندا کے مفکر کے گرد و پیش صرف حال اور ماضی کا زمانہ ہی نہیں تھا، بلکہ مستقبل کا تا حد نظر پھیلا ہوا میدان بھی تھا۔'' (لوح وقلم (مجموعہ مضامین)

خود جمیل مظہری نے جا بجا اجتبیٰ رضوی کے کلام پر نثر و نظم میں تبصرہ کیا ہے ایک جگہ فرماتے ہیں 'پردے کے ادھر کی باتیں اجتبیٰ کے یہاں زیادہ ہیں' اپنے ایک اور مضمون میں لکھتے ہیں:

''اجتبیٰ رضوی نے مجھے فلسفے اور تصوف کی چاٹ دلائی اور مجھے دشت تحیر میں تنہا چھوڑ کر خود خانقاہ خودی یا بے خودی میں گوشہ نشین ہوگئے۔''

(غبار کارواں ماہنامہ 'آجکل' دہلی مئی 1970)

بے تکلف دوست ہونے کی وجہ سے انھوں نے جا بجا شعری پیکر میں بھی اجتبیٰ رضوی اور پرویز شاہدی کے حوالے سے دلچسپ طرز اظہار اختیار کیا ہے، اگر ایک طرف وہ اجتبیٰ رضوی کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہیں، تو دوسری طرف ان کی زمانے سے بیگانہ وشی پر مخلصانہ طنز بھی کرتے نظر آتے ہیں۔

زبور ہند کہیے مظہری رضوی کی غزلوں کو
حقائق کو جو لفظوں میں سمو کر معجزہ کر دے

اے رضوی دانا ہوش میں آ، سن مظہری ناداں کی صدا
تو سالک ہے مجذوب نہ بن، مجذوب پہ دنیا ہنستی ہے

جمیل مظہری کی مشہور نظم ہے۔

بقدر پیمانہ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

اسی غزل کے مقطع میں اپنے دوستوں کے ناموں کو یوں شریک کرتے ہیں۔

جمیل حیرت میں ہے زمانہ مرے تغزل کی مفلسی پر
نہ جذبہ اجتبائے رضوی، نہ کیف پرویز شاہدی کا

گفتگو کے آغاز میں ہی سید حسین احمد ایڈوکیٹ ناشر شعلہ ندا کے جس بیان سے استفادہ کیا گیا اس میں کہا گیا ہے:

''1932 سے رضوی کی شاعری غالب، اقبال اور شاد سے بہت واضح طور پر متاثر نظر آتی ہے۔''

یہ بیان جزوی طور پر درست ہے، شاد سے اثر پزیری کئی اعتبار سے فطری ہے اس حوالے سے ایک اہم پہلو عظیم آباد کی ادبی فضا بھی ہے جہاں اجتبیٰ رضوی کا ذوق شاعری بالیدہ ہوا، اجتبیٰ رضوی نے شاد کے ساتھ وابستگی کا اعتراف خود بھی کیا ہے، چنانچہ اس حوالے سے کسی بحث کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔

سرمہ بینش ہے، آنکھوں میں لگا خاک مزار
بزم میں اب کیا ہے رضوی قبر پر چل شاد کی

جہاں تک غالب کا تعلق ہے، اجتبیٰ رضوی کے یہاں تفکر و تفلسف کی موجودگی اس غلط فہمی کی وجہ ہوئی کہ ان کی شاعری پر غالب کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ ذرا سی توجہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مرزا غالب اور اجتبیٰ رضوی کا مزاج شاعری ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہے۔ غالب کی شاعری میں جذبات کا اظہار بھی تفکر بردوش ہے جبکہ اجتبیٰ رضوی کے یہاں تفکر میں بھی وارفتگی اظہار اور التہاب کی سیماب آسا کیفیات پائی جاتی ہیں، غالب کی فکر میں ٹھہراؤ ہے اجتبیٰ رضوی کے یہاں سیالیت ہے، ان کی فکر کسی بھی مقام پر تھمتی ہوئی نہیں نظر آتی ہمیشہ جس نقطے پر ہے اس سے آگے کی سمت جولاں محسوس ہوتی ہے، غالب موجود کے جواز کا متلاشی ہے، رضوی غیر موجود کے امکانات کے جویا نظر آتے ہیں، غالب کے یہاں بھی 'امکانات' کی موجودگی ہے لیکن وہ حتمیت کا منکر

اجتبیٰ رضوی نے تلا ش و جستجو کی کیفیات اور ادراک و اکتساب کی واردات کے حوالے سے زیادہ گفتگو کی ہے ,ایسی نظموں کی ایک الگ ہی کیفی جذبی فضا ہے جہاں شوق شوریدہ کی بیتابیاں اضطراب آرزو کی صورت رواں دواں محسوس ہوتی ہے. کہیں عالم ممکنات کی بے کراں وسعتیں خوابیدہ عزائم کو آواز دیتی ہیں, کہیں جلووں کی ارزانی نظروں کو خیرہ کرتی ہے تو کہیں وسائل ادراک کی کم مائیگی حسرت و تمنا بن کر روح میں اترتی چلی جاتی ہے. فریاد آدم, ترانۂ آدم اور تقدیر آدم ایسے ہی احساس کی حامل طویل نظمیں ہیں.

نہیں ہے، لیکن اجتبیٰ رضوی ذہنی، فکری، نظریاتی ہر سطح پر تجربی رویہ اختیار کرتے ہیں، وہ مشاہدات و موجودات کی سطح مادی کی بھی 'حتمیت' کے قائل نہیں ہیں، اور خود اپنے زاویہ فکر کو بدل بدل کر غور و فکر کی کاوش کرتے رہنے میں یقین رکھتے ہیں، وہ ذہنی حتمیت کو توڑنے اور عقائد و نظریات کی از سرِ نو تعمیر کی جانب متوجہ رہنے کو ہی نسل انسانی کے ارتقا کی ضمانت سمجھتے ہیں۔

اجتبیٰ رضوی نے تلاش و جستجو کی کیفیات اور ادراک و اکتساب کی واردات کے حوالے سے زیادہ گفتگو کی ہے، ایسی نظموں کی ایک الگ ہی کیفی جذبی فضا ہے جہاں شوق شوریدہ کی بیتابیاں اضطراب آرزو کی صورت رواں دواں محسوس ہوتی ہے، کہیں عالم ممکنات کی بے کراں وسعتیں خوابیدہ عزائم کو آواز دیتی ہیں، کہیں جلووں کی ارزانی نظروں کو خیرہ کرتی ہے تو کہیں وسائل ادراک کی کم مائیگی حسرت و تمنا بن کر روح میں اترتی چلی جاتی ہے۔ فریاد آدم، ترانۂ آدم اور تقدیر آدم ایسے ہی احساس کی حامل طویل نظمیں ہیں۔

ان کی نظم 'ترانۂ آدم' پیکر خاکی کے دل میں پلنے والے عزم و بغاوت کی داستان سے مرتب ہے، اپنی بے بضاعتی کے احساس شدید کے باوجود ابن آدم خود اپنے سوز جگر کی تابانی سے بیقرار ہے، فرسودہ عقائد کے بھرم توڑ ڈالنے کا عزم انگڑائیاں لے کر اس کے دل میں بیدار ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔

'تقدیر آدم' اسی فکری سلسلے کا نقطۂ عروج ہے، شاعر کی تلاش کا ماحصل شاید اب سامنے آ رہا ہے، کائنات کا انتظام بے پناہ، جہاں ہر قطرہ انا البحر کی ہوک رکھتا ہے، جہاں ہر ذرہ ایک دل مضطرب کی بیقراریاں سمیٹے صدا دے رہا ہے کہ آؤ اور میری بیکرانیوں کو تسخیر کرو، یہ کائنات کی وسعت بے پناہ ایک سرمستی میں ڈھلتی چلی جاتی ہے ایک رقص مسلسل کی کیفیت ہے، ذرہ ذرہ وجد میں ہے، وقت ایک بحر بیکراں ہے کہ آپ اپنی وسعتوں میں گم رواں دواں ہے، یہ سیل رواں ... یہ تیز دھارے ....جس کی زد پر انسان کا وجود خس و خاشاک کی طرح بہا جاتا ہے...اور تب ایک احساس ہوتا ہے کہ یہ وجود یہ احساس 'ہمی' کیسا پر فریب تھا کہ 'وجود' تو فقط فشار سینۂ تقدیر کا دھواں ہے، اور یہ 'جنون حیات دواں' بھی مرگ بدوش ہے، یہاں عدم بھی ایک فسوں اور وجود بھی ایک طلسم ہے، یہ کیسا سلسلہ ہے، کیسا مشغلہ ہے کہ جس کا مقصود بھی ذہن پر نہیں کھلتا۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تمام موجودات عالم فریب نظر ہیں اگر 'باقی' اور ازلی و ابدی کچھ ہے تو بس ایک حرکت و رفتار بے نہایت، جاری و ساری ہے ایک ذرہ کے جگر سے یہ رقص و وجد کی کیفیت گرداب در گرداب پھیلتی اور محیط بر کائنات ہوتی جاتی ہے، نہ تو آغاز نہ ہی نقطۂ انجام کا اندیشہ ہے، گویا سفر ہی سفر ہے گردش ہی گردش، قرار و سکون نہیں، منزل نہیں، حیات دراصل ایک بے خودی و وارفتگی کی کیفیت ہے، جو خود اپنے وجود کی نمود کے لیے کوشاں ہے، افسوس کہ حیات کے بے بہا خزانے نمود حیات کی کاوش بے جا میں صرف کر دیے جاتے ہیں۔

نمود کوششِ ناپختۂ مزاق حیات
حیات بے خود و وارفتۂ شراب نمود

اور اس خرابے میں 'آدم بد بخت' ایک سعی نامشکور کا اسیر ...مگر اس طرح کہ

جگر برشتہ و دل داغ و ریز ریز نہاد
حریف فطرت سفاک، خود نگر محسود
طلسم دیدۂ وگوشِ غریب۔ ہجر نصیب
فریب وعدۂ نا استوار دیدو شنید
بجھی نہ اس کی لگی، گو دیا کیے جبریل
نچوڑ کر اسے افشردۂ غیاب شہود
شہید قدرت پیچیدہ راہ کیا کہنا!
مسافرِ سفرِ بے پناہ کیا کہنا!

اجتبیٰ رضوی کا مذہبی شعور بے حد بالیدہ تھا، وہ ایک وسیع المشرب اور انسان دوست شخصیت کے مالک تھے، مذہب کے بنیادی فلسفے پر ان کی نظر گہری تھی قدیم ترین مذاہب مثلاً زرتشتی مائیتھولاجی، بدھ مت، بائبل اور بھگوت گیتا پر تصرف رکھتے تھے، کشف المحجوب ان کے زیر مطالعہ رہتی تھی، ان کے نزدیک مذہبی جذبات کے اظہار کی بہترین صورت انسانوں کے درمیان انس، محبت، بھائی چارے اور ہمدردی کے اظہار میں پوشیدہ ہے، نہ کہ انسانوں کو تقسیم کرنے اور ایک دوسرے سے دوری، سبقت اور عدم مساوات پیدا کرنے میں، وہ قوت کے اظہار کی جگہ محبت کے اظہار کو ضروری سمجھتے ہیں اور یہی بات ان کی شاعری کو اقبال کی شاعری سے الگ کرتی ہے اقبال کی شاعری پیغام کے نفاذ کی کوشش ہے مگر اجتبیٰ رضوی پیغام کے راسخ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مذہب کی اصل ایک بہتر معاشرے کی تشکیل ہے، تمام مذاہب قابل قدر اور تمام مذہبی پیشوا لائق احترام ہیں، انھوں نے بھگوت گیتا کے فلسفے سے بھی کافی اثر قبول کیا اور روحانی اکتسابات کی مختلف منزلوں میں مہاتما بدھ اور حضرت عیسیٰ کی تعلیمات سے بھی رہنمائی حاصل کی، یہ باتیں اگر چہ انھوں نے کبھی براہ راست کہی نہیں لیکن ان کا طریقۂ زندگی اور ان کی طرز فکر ہی نہیں بلکہ ان کی مکمل شخصیت اس کا بے ساختہ اظہار تھی جسے ان سے محض ایک ملاقات میں ہی محسوس کیا جاتا تھا۔ ناقدین نے ان کے اور ٹیگور کے درمیان بعض اقدار مشترکہ کے حوالے سے بھی گفتگو کی ہے، وہ ایک اچھے مصور بھی تھے پروفیسر منظر اعجاز نے گیتا اور بدھسٹ فلسفے پر ان کے تصرف کے بارے میں دو دلچسپ واقعات اسی مضمون میں پیش کیے ہیں جس کا حوالہ اوپر پیش کیا گیا ہے، یہاں اختصار کے سبب مکمل واقعہ پیش نہیں کیا جا سکتا مختصراً یہ کہ آچاریہ جانکی ولبھ شاستری کسی جلسے میں گیتا کے حوالے سے اجتبیٰ رضوی کی تقریر سے بہت متاثر ہوئے تھے اور ایک موقع پر اجتبیٰ رضوی نے بدھ کے فلسفے پر نہایت بلیغ تقریر کی تھی۔ وہ ایک اعلیٰ درجے کے خطیب بھی تھے، ان کی شخصیت میں ایک غیر معمولی جاذبیت محسوس کی جاتی تھی، ان کے حلقہ اثر میں آنے والوں میں اکثر کو ان کا معتقد پایا جاتا ہے۔ ان کی شخصیت کی یہ تمام کیفیات ان کی شاعری میں بھی عکس ریز ہوتی ہیں خصوصاً ان کا جذبہ حب الوطنی، ہندوستان کی روحانی فضا سے اثر پزیری اور مذہب کا وسیع تر نقطۂ نظر ان کی نظم 'صبح بنارس' میں ابھرتا ہے، بظاہر یہ ایک منظری نظم ہے جس میں بنارس کے دسا سمید ھ گھاٹ پر صبح کے اشنان کا روح پرور منظر پیش کیا گیا ہے، لیکن مکمل نظم ایک عرفانی فضا میں پروان چڑھتی ہے جہاں عبد و معبود کے مقدس رشتے کے احترام میں یہ ساری کائنات جھکی ہوئی محسوس ہوتی ہے، ذرہ ذرہ تقدیس اور بندگی کے ایک غیر مرئی رشتے سے بندھا ہوا

نظر آتا ہے، جہاں حسن و جمال ارضی بندگی کے جلال و تابندگی سے چشم نظارہ کو مرعوب رکھتا ہے۔

صبح بنارس

تماشا کی وہ ارزانی وہ گنگا وہ صنم خانہ
حرم والے ذرا کاشی کا منظر دیکھتے جائیں
بہے جاتے ہیں ٹکڑے چاند کے گنگا کے دھارے میں
صنم خانہ تو ان کا گھر ہے دیکھو عکس مسجد کو
ہے ٹیکا یا نشان بندگی ماتھے کی یا بندی
وہ آنکھیں جن کی بے پروا نگاہی درس خودداری
وہ آنکھیں اعتبار سادگیہائے نظر جن کو
بھلا معصوم آنکھیں اور گناہ کفر کی تہمت
'وفاداری بہ شرط استواری اصل ایماں ہے
بنارس کی سحر اشنان کی تقریب روزانہ
کبھی دیکھیں گے جنت اور ابھی دیکھیں صنم خانہ
کوئی پانی میں دیکھے عکس تقدیر صنم خانہ
خدا کا گھر جھکا آغوش کھولے بے قرارانہ
وفا داری کا تمغہ آفتاب صبح بت خانہ
وہ آنکھیں جو جلال حسن سے اٹھتی ہیں شیرانہ
وہ آنکھیں چار ہوتی ہیں جو آنکھوں سے دلیرانہ
لب رحمت پہ اک گہرا تبسم ہے حکیمانہ
خدا معلوم کب ہو جائے بت خانہ خدا خانہ

پروفیسر منظر اعجاز لکھتے ہیں۔

''صبح بنارس کافی طویل نظم ہے، لیکن حسن و جمال اور کیف واثر میں بے مثال ہے۔ اختر اورینوی نے اس نظم کو اردو شاعری کا تاج محل کہا ہے، جمنا کی سطح پر تاج محل کا عکس ہندوستان کی جس مشترکہ تہذیب کا معنوی تناظر فراہم کرتا ہے، اگر غور سے دیکھا جائے تو صبح بنارس گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہے۔ اس مایہ دار تہذیب کی بقا و سالمیت اور اس کے ارتقا کا امکان حرم و دیر کی ہم آغوشی اور ہم آہنگی میں پوشیدہ ہے۔'' (ایضاً ص14)

اجتبیٰ رضوی نے کچھ بے حد سادہ اور شدید اثر رکھنے والی نظمیں بھی کہی ہیں جس سے ان کی حساس طبعی اور دلگدازی کا احساس تو ہوتا ہی ہے، یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ سہل اور عام فہم لب ولہجہ انھیں پسند تھا، جہاں کہیں ان کی گفتگو عمیق نظر آتی ہے اس کا سبب ان کی مشکل پسندی نہیں موضوع کی غیر عموی سطح ہے۔

روح بیتاب تجھ کو ڈھونڈتی ہے
جیسے اندھی کوئی بھکارن ہو
بھیک دن بھر گلی گلی مانگے
اور سر شام بھیک کی گٹھری
اپنے ہاتھوں سے آپ گم کردے
رات بھیگے فقیر سب سوجائیں
اور وہ رستہ ٹٹولتی ہی پھرے
یوں ہی اے میرے گمشدہ محبوب
روح بیتاب تجھ کو ڈھونڈتی ہے

فکری تجربات جب قلبی واردات میں ڈھل کر صفحۂ قرطاس پر اترتے ہیں اس وقت نہ تو جولانی بیان نظر آتی ہے نہ ہی تفکر کی عمیق پہنائیاں اور نہ دشوار گزار راہیں، جن پر چلنا دشوار ہو، بلکہ اظہار ایک دھیمی دھیمی سی آنچ سی سلگتا ہوا محسوس ہوتا ہے، یہاں خطابت کے زور کی جگہ خود کلامی کی سی سرگوشی کا احساس ہوتا ہے:

'مرد فقیر' ان کی ایک ایسی ہی نظم ہے جہاں شاعر نے فرسودہ عقائد اور رائج طرز فکر کی گمراہ کن آسانیوں سے منہ موڑ کر نئے فکری زاویوں کی تلاش و جستجو میں رواں دواں ہونے کی ایک کیفیت بیان کی ہے، پوری نظم استعاراتی فضا میں پروان چڑھتی ہے، اور عالم جذب کی ایک بے نیازی سمیٹے نظر آتی ہے۔

مرد فقیر

ہم کو کل احباب نے آکر بازاروں کے حال سنائے
کچھ نیلامی مال کے تاجر راہ میں تھے اک بھیڑ لگائے
مال یہیں لو بڑھ نہ چلو ان لوگوں کا اصرار یہ تھا
خلقت تھی افلاس کی ماری اور ستا بازار یہ تھا
اتنے میں اس راہگذر پر آنکلا اک مرد فقیر
سوز کلیم و برق تجلی جس کے لب جنباں میں اسیر
دیس کی دھن میں پردیسی بیتاب تھا چلتا جاتا تھا
دور بہت جانا تھا اسے اور سورج ڈھلتا جاتا تھا
بھیڑ پکاری سب ٹھیرے ہیں تم بھی یہیں ٹھرو بابا
اس نے کہا چلنا ہے مجھے چلنے کا رستہ دو بابا

اجتبیٰ رضوی کی نظمیں تعداد میں اگرچہ کم ہیں لیکن زیادہ تر نظمیں طویل ہیں، انھوں نے طویل بحروں کے ساتھ ساتھ مختصر مترنم بحروں میں بھی نظمیں لکھی ہیں، لیکن طویل بحریں زیادہ استعمال کی ہیں، وہ موضوع کو طرز اظہار پر فوقیت دیتے ہیں، شاعرانہ صناعی کی ارادی کوشش ان کے یہاں نہیں نظر آتی، چونکہ ان کے ذوق سلیم کی پرورش میں فارسی شاعری کا دخل رہا لہذا ان کا اسلوب اور لفظیات، فارسی طرز اظہار سے متاثر نظر آتی ہیں، نظموں میں اکثر ایسے مصرعے جابجا ہیں جو جزوی یا کلی طور پر فارسی کے ہوتے ہیں، ان کا جذبۂ اظہار اس قدر قوی اور شدید ہے کہ ایک پر، زور دھارے کی صورت اپنا راستہ از خود بناتا جاتا ہے، غالباً یہی وجہ ہے کہ شعلہ ندا میں ایک نظم 'البیلے جلوے' اور ایک غزل ایسی بھی ہے جو مروجہ بحروں سے بالکل الگ ہے، چنانچہ ناشر شعلہ ندا نے بحر متدارک کی ایک جدید ترکیب وضع کرتے ہوئے ان کی تقطیع کی ہے۔ شعلہ ندا کی کاپیاں کہیں دستیاب نہیں البتہ آن لائن یہ کتاب موجود ہے۔ لہذا اس کی اشاعت ثانی کی بھی بے حد ضرورت ہے۔

اجتبیٰ رضوی کی نظم گوئی کے تمام پہلوؤں پر تفصیلی گفتگو اس مختصر مضمون میں ممکن نہیں، یہاں محض ایک تعارفی یا تمہیدی کاوش کی گئی ہے۔ اجتبیٰ شناسی کے حوالے سے 'ذکر اجتبیٰ رضوی' (مرتب محسن رضا رضوی، سنہ اشاعت 1993) کے بعد دوسری اہم ترین کاوش 'اجتبیٰ حسین رضوی شخصیت اور جہات' (مصنفہ شمیم فاطمہ اسریٰ رضوی، سنہ اشاعت 2019) ہے، اول الذکر کتاب میں اجتبیٰ رضوی سے متعلق مشاہیر ادب کے اہم مضامین یکجا کیے گئے ہیں، جبکہ موخر الذکر میں اجتبیٰ رضوی کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے نہایت مفصل گفتگو کی گئی ہے، یہ کتاب اگرچہ اجتبیٰ رضوی کی تفہیم میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن ابھی بھی شخصیت، شاعری اور نثر نگاری کے حوالے سے ایسے بہت سے پہلو تفسیر و تفہیم کے متقاضی رہ گئے ہیں، جن کو صرف اور صرف ایک تصنیف میں سمیٹا جانا ممکن نہ تھا۔ امید ہے کہ محققین اس پوشیدہ خزانے کی تلاش کریں گے اور مستقبل میں اس حوالے سے مزید تفصیلی گفتگو کی جائے گی۔

■

Dr. Farhat Nadir
E-246 /1 Upper Ground Floor
Alam Shibli Nomani Road Abul Fazal Enclave
Part 2 Shaheen Bagh
New Delhi- 110025
Mob.: 7903693295

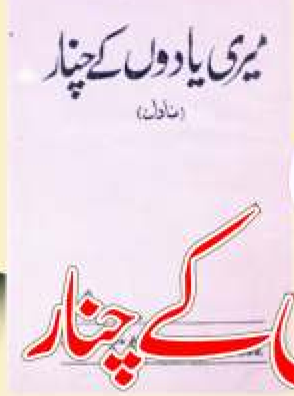

محمد محسن

کرشن چندر کا ناول میری یادوں کے چنار

کرشن چندر کی پیدائش بھرت پور راجستھان میں ہوئی مگر ان کا بچپن جموں وکشمیر کے ضلع پونچھ میں گزرا۔ وہیں انھوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔وہ بچپن سے لے کر 1929 تک پونچھ میں رہے۔کرشن چندر کے والد ملازمت کے سلسلے میں پونچھ میں رہے اوراس کے بعد دہلی آگئے۔اس طرح کرشن چندر کا ناطہ کشمیر سے ٹوٹ گیا۔مگر تاحیات وہ کشمیر کے گیت گاتے رہے۔ان کی ادبی زندگی کا آغاز بھی پونچھ میں ہوااور پہلی تین چار کہانیوں کا پس منظر بھی پونچھ ہی رہا۔کشمیر سے نکلنے کے بعد اگرچہ وہ اپنے کاموں میں مصروف ہوگئے مگراس کے باوجودان کی یادوں اورتحریروں میں کشمیر زندہ رہا۔انھوں نے ''کشمیر کی کہانیاں'' کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ'' میرے بچپن کی حسین ترین یادیں اور جوانی کے بیش قیمت لمحے کشمیر سے وابستہ ہیں''۔اردو نثر میں کرشن چندر کے اسلوب کو ہرکسی نے سراہا ہے اور ناقدین کا ماننا ہے کہ ان کا یہ شاعرانہ اسلوب کشمیر کی ہی دین ہے۔کشمیر کے حوالے سے انھوں نے کئی افسانے اورناول یادگار چھوڑے ہیں۔

کرشن چندر کا شمار اردو کے بڑے ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔انھوں نے کوئی تیس سے زائد ناول لکھے ہیں۔ان کے ناولوں میں شکست ،میری یادوں کے چنار اور'مٹی کے صنم' پونچھ کے حوالے سے کافی اہم ہیں۔ انھوں نے ناول نگاری کا آغاز' شکست' سے کیا۔ناول 'شکست' ترقی پسند نظریہ کا حامل ہے جبکہ'مٹی کے صنم' ایک سوانحی ناول ہے۔کرشن چندر نے افسانہ نگاری کے میدان میں بھی اپنا ایک منفرد مقام حاصل کیا اور آج بھی افسانہ نگاری کی تاریخ میں ان کا نام سرفہرست ہے۔ انھوں نے کشمیر کے متعلق کافی تعداد میں افسانے لکھے ہیں۔کشمیر کے حوالے سے جنت اور جہنم، بندوالی، کفارہ، سڑک کے کنارے، کشمیر کو سلام، جیل سے پہلے اور جیل کے بعد، لاہور سے بہرام گلہ تک، چاندی کی رات، گرجن کی ایک شام وغیرہ اہم افسانے ہیں۔

'میری یادوں کے چنار' کا براہ راست تعلق پونچھ سے ہے کیونکہ اس میں کرشن چندر نے وہی زندگی پیش کی ہے جو انھوں نے پونچھ میں گزاری ہے۔ ناول'' میری یادوں کے چنار'' ان کی ابتدائی زندگی پر مبنی ہے اوران کی ابتدائی زندگی پونچھ میں گزری ہے اس لیے وہاں کی تہذیب، سماج اور علاقائی منظر کشی فطری ہے۔ ناول 'میری یادوں کے چنار' 1962 میں شائع ہوا۔۔یہ ناول کرشن چندر کا سوانحی ناول ہے۔بیشک اس ناول میں تاریخی ربط نہیں پایا جاتا جو سوانح عمری میں ملتا ہے لیکن اس کے باوجود یہ ناول سوانحی خصوصیات کا حامل ہے۔یاد رہے کہ'مٹی کے صنم' اور' آدھے سفر کی پوری کہانی' بھی ان کے سوانحی ناول ہیں۔'میری یادوں کے چنار' میں کرشن چندر نے اپنے بچپن کے سوانحی کوائف کو افسانوی رنگ دے کر پیش کیا ہے۔اس ناول کے متعلق جگدیش چندر ودھاون لکھتے ہیں:

'میری یادوں کے چنار' کا کینوس بہت محدود ہے۔ زیادہ تر اس کا تعلق کرشن چندر کے لڑکپن اور ان کے والدین کی خانگی زندگی سے ہے۔ مختلف ابواب کے موضوعات کی نوعیت اس امر کو واضح کردے گی۔ ملاحظہ ہو: کرشن چندر کے والد کا مچھلی کے شکار کے لیے کرمان جانا اور وہاں کے ناخوشگوار واقعات کا کرشن چندر پر دائمی اثر... کرشن چندر کی اچھوت لڑکی تاراں سے دوستی اور ڈاب پر ننگا نہانا... پونچھ کے مختلف علاقوں میں امیر اور غریب لوگوں کی زندگی کا گھناؤنا تضاد''

(کرشن چندر شخصیت اورفن ،جگدیش چندر ودھاون، 2003، ص 634)

کرشن چندر نے اس ناول میں اپنے بچپن کے وہ ایام جو وادی کشمیر کے حسین ترین خطے میں گذارے تھے ان کو ہو بہو پیش کیا ہے۔ایک بچہ کس طرح اپنا بچپن وادی کے پہاڑی علاقوں میں گزارتا ہے اور کس طرح ان پہاڑی علاقوں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ان تمام حرکات وسکنات کو انھوں نے خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے اس حوالے سے ناول کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

'' اس پگڈنڈی کے راستہ میں دھان کے کھیت آتے تھے۔اور چھوٹے چھوٹے جنگلی مرغزار آتے تھے۔ اور نیچے نیچے ٹیلے آتے تھے۔اور لکڑی کے دو پل آتے تھے۔جن کے نیچے شور مچاتے ہوئے خطرناک نالے بہتے تھے۔ اور جن کے دونوں طرف چیل کے چھتنارے پھیلائے ہوئے درخت کھڑے تھے جن میں سے جب ہوا چلتی تھی تو درخت اس طرح شائیں شائیں کرتے جیسے دور کہیں بارش ہورہی ہے۔''

(کرشن چندر، میری یادوں کے چنار، ص 51)

یہ ناول پڑھتے وقت اختر الایمان کی نظم 'ایک لڑکا' کے تمام مناظر آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔جس طرح نظم 'ایک لڑکا' اختر الایمان کے ماضی کی یادوں کی عکاسی کرتی ہے اسی طرح 'میری یادوں کے چنار' کرشن چندر کے ماضی کا عکاس ہے۔کرشن چندر نے اپنے بچپن کے حالات وواقعات نہایت ہی حقیقی اور فطری طور پر پیش کیے ہیں اور ساتھ ہی اپنے والدین کا تعارف،ان کا مزاج،ان کے آپسی تعلقات ونظریات نیز اپنے گھر کے ماحول کواس ناول میں پیش کیا ہے۔کرشن چندر کی والدہ اپنے مذہبی نظریات میں شدت کی حامل تھیں۔وہ اونچ نیچ اور ذات پات کی پابند تھیں۔لیکن ان کے والد آریہ سماج کو ماننے والے تھے اور کھلے اشتراکی ذہن کے مالک تھے۔ وہ مہاتما گاندھی کے عقیدہ کے قائل تھے۔کرشن چندر نے خود ایک جگہ لکھا ہے کہ ان کے والد نے ان سے وعدہ لیا تھا کہ وہ کبھی اپنی ذات پر فخر نہیں کریں گے اور کبھی اپنے نام کے ساتھ ذات کا نام نہیں لکھیں گے۔کرشن چندر کی بچپن کی دوست ''تاراں'' ہے جو کہ ایک اچھوت کنبے سے تعلق رکھتی ہے۔کرشن چندر نے اس ناول میں تاراں کو یوں متعارف کروایا ہے:

'' لیکن تاراں مجھے پسند ہے۔ اس کا چہرہ بالکل گول ہے چاند کی طرح اور جب وہ اپنے چھوٹے چھوٹے لب کھول کر ہنستی ہے تو مجھے بہت پیاری لگتی ہے۔میں نے طے کرلیا کہ میں بڑا ہوکر تاراں سے شادی کرلوں گا۔مگر ابھی اس میں بہت عرصہ باقی ہے کیونکہ میری عمر آٹھ سال کی ہے۔اور تاراں چھ سال کی ہے۔اور ہم لوگوں کو اپنے ماں باپ کی طرح بڑے ہونے میں بہت سال لگ جائیں گے۔ نہ جانے یہ بڑی عمر کے لوگ ہم چھوٹے بچوں کو شادی کیوں نہیں کرنے دیتے۔''

(کرشن چندر، میری یادوں کے چنار، ص 7)

یہ وہ زمانہ تھا جہاں چھوت چھات عام اور ذات

پات کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ کرشن چندر کی والدہ کا تاراں کے تئیں نظریہ ملاحظہ ہوں:

''میری ماں نے تاراں کو پکڑ لیا تھا۔ اور اسے زور زور سے طمانچے اور مکے مار مار کر کہہ رہی تھی۔ کمبخت اچھوت کم ذات لڑکی۔ آج پورن ماشی کے شبھ دن بھی میرے بچے کے ساتھ کھیلتی ہے! ابھی تو وہ اچھا نہیں ہوتا! دیکھ تو سہی۔ آج میں تیری ہڈیاں توڑ کر رہوں گی۔۔ میرے پتا جی نے روتی ہوئی تاراں کو اپنی گود میں اٹھا لیا اور اسے باغیچے میں لے گئے۔ اور اس کی جھولی سرخ سرخ سیبوں سے بھر دی اور ان خوبصورت سیبوں کو دیکھ کر روتی ہوئی تاراں ساری مار بھول گئی۔ اور اپنے آنسوؤں میں مسکرانے لگی۔''

اس اقتباس سے کرشن چندر کے والدین کو بخوبی جانا جا سکتا ہے۔ دونوں مزاج کے اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد تھے۔ کرشن چندر نے ناول میں جگہ جگہ ذکر کیا ہے کہ ان کی ماں کے اندر چڑچڑاپن بہت تھا اور شکی مزاج تھیں جبکہ ان کے والد ایک سنجیدہ ذہن انسان پرست اور عاشق مزاج انسان تھے۔ یہی عاشق مزاجی انھوں نے اپنے بیٹے کرشن چندر کو بخشی تھی۔ کرشن چندر اپنے والد سے بہت متاثر تھے۔ انھوں نے اپنے والد کے کردار کو اس ناول میں بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ جہاں ایک طرف ان کی ماں کٹر اور تنگ ذہن رکھتی تھیں وہیں ان کے باپ آزاد طبیعت کے مالک تھے۔ ان کے والد نہایت ایماندار اور کھلا ذہن رکھنے والے انسان تھے۔ اور اس بات کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ وہ فجے کی موت پر افسوس کرتا ہے اور خانم کو آخری بار فجے کا چہرہ دیکھنے میں مدد کرتا ہے، وہ نیاز احمد کا اچھا دوست ہے اور جب نیاز احمد کے خلاف گرفتاری کا حکم جاری ہوتا ہے اور اس کو زندہ یا مردہ پکڑنے کے لیے انعام کا اعلان ہوتا ہے تب کرشن چندر کے والد اس کی مدد کے لیے آگے نکلتے ہیں اور اپنے گھر میں چھپائے رکھتے ہیں۔ اور آخر میں جب ایک مسلمان ہیڈ ماسٹر زخمی حالت میں اسپتال میں پڑا ہوا تھا اور راجہ کی طرف سے حکم ہوا تھا کہ وہ زندہ نہیں رہنا چاہیے۔ لیکن اس کے باوجود کرشن چندر کے والد نے اپنے انجام کی پرواہ کیے بغیر ایمانداری سے ہیڈ ماسٹر کا علاج کیا۔ اسی وجہ سے بعد میں انھیں ریاست بدر کیا گیا۔

اس کے علاوہ اس ناول میں کرشن چندر نے پونچھ کے مختلف علاقوں میں امیر اور غریب لوگوں کی زندگی کے رہن سہن کا بھی ذکر کیا ہے۔ خانم سے فیض محمد (فجے) کی محبت، فجے کی موت اور کرشن چندر کے والد کا کردار بھی اس ناول میں خوبی سے پیش کیا ہے۔ ریاست پونچھ جو آج جموں و کشمیر کا ایک ضلع ہے آج بھی ایک پچھڑا ہوا علاقہ مانا جاتا ہے۔ کرشن چندر نے اپنے ناول ''میری یادوں کے چنار'' کے ذریعے پونچھ کی تہذیبی، سیاسی اور معاشی زندگی کی بھی بڑی عمدہ عکاسی کی ہے۔ اس ناول میں انھوں نے فجے اور موسیٰ خان کے ذریعے وہاں کے نظام، غریب اور امیر طبقے کے درمیان مسائل اور پھر حکومت کے رویے کو بڑی سنجیدگی سے پیش کیا ہے۔ فجے ایک ڈاکو ہے جو غریب طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ غریبوں پر حکمران اور امیر طبقے کے مظالم برداشت نہیں کر پایا اس لیے ڈاکو بن گیا۔ ان دنوں ریاست پونچھ میں وہاں کے راجہ کی حکمرانی الگ ہوا کرتی تھی اور انگریزوں کی حکومت الگ۔ اور ان کا بے رحمانہ راج عوام پر تھا جو امیر اور غریب دو طبقے میں بٹی ہوئی تھی۔ اس سارے نظام کی پیداوار فجے ڈاکو تھا جس کے ساتھ پورے غریب طبقے کی ہمدردی تھی۔ یہاں تک کہ لڑکیاں اس کے نام کا گیت گایا کرتی تھیں۔ فجے موسیٰ خان کی بیٹی خانم سے پیار کرتا تھا۔ دوسری طرف حکومت نے فجے کے پکڑنے پر انعام رکھا ہوا تھا۔ موسیٰ خان خانم کی خالہ کے ذریعے فجے تک پہنچ جاتا ہے اور نہتے فجے کو گولیوں سے بھون ڈالتا ہے۔ اس پر راجہ اور امیر طبقہ چین کی سانس لیتا ہے جبکہ غریب طبقہ مزید دب جاتا ہے۔ اس طرح غریب طبقے کو اٹھنے نہیں دیا جاتا تھا اور جو کوئی سر اٹھاتا اس کا سر کچل دیا جاتا۔ وہاں ذات پات اور اونچ نیچ کا مسئلہ عام تھا اور اس حوالے سے اس ناول میں کرشن چندر ایک جگہ لکھتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''گو کسی طرح کا ایسا قانون نہ تھا اور کوئی تحریری ممانعت بھی نہ تھی۔ مگر بس ایک غیر تحریری سا معاہدہ تھا جس کی پابندی دونوں دنیاؤں میں ہوتی تھی۔ ہماری دنیا الگ تھی۔ ان کی دنیا الگ تھی۔ دونوں کے درمیان ایک اوپری قسم کی مفاہمت تھی۔ جس کی وجہ سے آفیسر لوگ مقامی باشندوں پر اعتماد نہ کر سکتے تھے۔ نہ مقامی باشندوں کو آفیسروں پر پورا بھروسہ تھا۔ یوں بھی نشیب و فراز میں تضاد تو ہو سکتا ہے۔ اعتماد کیسے ہو سکتا ہے۔ ایک حکم دیتا ہے۔ دوسرا اس حکم کو برداشت کرتا ہے۔ اس رشتہ میں محبت کہاں سے آئے گی۔؟''

(کرشن چندر، میری یادوں کے چنار، ص 69)

اس ناول کے ذریعے کرشن چندر نے پونچھ کے راجہ کی بد نظامی کو بھی ظاہر کیا ہے جو اپنے فائدے کے لیے کسی کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیتا تھا۔ اس ناول میں فجے اور تھانیدار نیاز احمد کا قتل راجہ کے حکم سے ہوا۔ اور راجہ نے ہیڈ ماسٹر کے قتل کا بھی حکم دے دیا تھا۔ جسے کرشن چندر کے والد نے ناکام بنا دیا۔ تھانیدار نیاز احمد ایک بہادر اور ایماندار سپاہی تھا۔ اور فوجی افسران میں کافی مشہور ہو چکا تھا۔ ایک دن اچانک راجہ اس کی گرفتاری کا حکم جاری کر دیتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ حکم بھی جاری کیا کہ جو کوئی نیاز احمد کو زندہ یا مردہ راجہ کے سامنے پیش کرے گا اسے راجہ کی طرف سے دس ہزار کا انعام دیا جائے گا۔ نیاز احمد کرشن چندر کے والد کا اچھا دوست تھا اس لیے ان کے گھر چھپ کے رہنے لگا۔ مگر ایک دن نیاز احمد وہاں سے بھی غائب ہو گیا اور بعد میں اس کی لاش کے چار ٹکڑے ملے۔

اس کے علاوہ کرشن چندر کے والد کے معاشقے شانو اور پیرن کے ساتھ اور ان کی والدہ کا شدید ردعمل کا مظاہرہ بھی اس ناول میں کرشن چندر نے بڑی بے باکی اور خوبی سے پیش کیا ہے۔ معاشقے کی ایک کہانی یہ ہے کہ شانو دق کا مرض لے کر اسپتال میں داخل ہوئی۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔ وہ بے سہارا اور بیوہ تھی جس کا شوہر منڈپ میں ہی مر گیا تھا۔ کرشن چندر کے والد گوری شنکر اسے دیکھتے ہی اس پر فدا ہو گئے۔ انھوں نے بڑے پیار اور احترام کے ساتھ اس کا علاج کیا۔ دن کو چار چار دفعہ اس کے پاس آتے اور گھنٹوں اس کے پاس بیٹھے رہتے۔ شانو جو بیوہ ہونے کے سبب گھر سے بے سہارا تھی، جس کی امیدیں مر چکی تھیں، گوری شنکر کی وجہ سے اس کی امیدیں پھر سے زندہ ہو گئیں۔ اس کی مرجھائی ہوئی زندگی پھر سے کھلنے لگ گئی۔ مگر یہ معاملہ زیادہ عرصہ نہ چل پایا۔ کرشن چندر کی ماں کو پتہ چل گیا اور شانو غائب ہو گئی۔ جیسا کہ ظاہر ہے کہ یہ ناول کرشن چندر کے گھریلو حالات پر مبنی ہے اس لیے مذکورہ بیرونی تمام واقعات کا تعلق کرشن چندر کے گھر سے ہے۔ کرشن چندر کے والد جب بیمار ہوتے ہیں تو ان کی بیماری کا ذکر کرشن چندر نے بڑی فنکاری سے کیا ہے، اسی طرح جب ان کی والدہ کو سانپ ڈس لیتا ہے اور اس کے بعد وہ جن حالات سے گزرتے ہیں ان کی منظر کشی کرشن چندر کا ہی کمال ہے۔

'میری یادوں کے چنار' ان کی اس زندگی کی عکاسی کرتا ہے جو انھوں نے پونچھ میں گزاری۔ مختصراً یہ کہ یہ ناول کرشن چندر کے لڑکپن اور ان کے والدین کی گھریلو زندگی کے ساتھ جڑا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس ناول میں کرشن چندر نے ہر واقعہ کو اسی طرح بیان کیا ہے کہ طبیعت کھل اٹھتی ہے۔ وہ خودنوشت تو نہیں لکھ پائے مگر 'مٹی کے صنم'، 'میری یادوں کے چنار' اور 'آدھے سفر کی پوری کہانی' کی صورت میں اپنی زندگی کا کچھ حصہ منظر عام پر لے ہی آئے۔

■

Dr. Mohd Mohsin
Karorimal College
University of Delhi
University Enclave
Delhi-110007

پروفیسر احمر لاری

غلام حسین

آزادی کے بعد جامعات کے جن اساطین اور اہم ترین اساتذۂ کرام نے اردو زبان و ادب کی آبیاری میں اہم کردار ادا کیا ہے ان میں پروفیسر احمر لاری صاحب کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ گورکھپور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں جب آپ کا تقرر عمل میں آیا تو اس وقت اردو کے دو ممتاز اساتذہ پروفیسر محمود الٰہی صاحب اور ڈاکٹر سلام سندیلوی صاحب شعبے میں فائق تھے۔ احمر لاری صاحب کے تقرر سے شعبے کے وزن و وقار میں اضافہ ہوا۔ تقریباً ایک دہے کے بعد دو اور اساتذۂ کرام ڈاکٹر اختر بستوی صاحب اور ڈاکٹر افغان اللہ صاحب کے ورود سے شعبہ توانا اور تونگر ہوا۔ طلبا کی تعداد میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہونے لگا۔ یہاں کے جن فارغ التحصیل اسکالروں نے قومی سطح پر اردو دنیا میں شعبے کا نام روشن کیا ہے ان میں پروفیسر ملک زادہ منظور احمد صاحب، پروفیسر عبدالحق صاحب، پروفیسر فضل امام صاحب، پروفیسر فیروز احمد صاحب، پروفیسر قاضی افضال حسین صاحب اور پروفیسر جمال حسین صاحب جیسے نامور صاحبان کی وابستگی اسی شعبے سے رہی ہے۔ احمر لاری صاحب بھی اس شعبے کے پروردہ اور پرداختہ ہیں۔ فطرتاً وہ کم گو تھے یا یوں کہیے کہ جن کہ آنکھ کھل گئی ان کی زبان بند ہے۔

''گویا کہ'' آپ کا تکیۂ کلام تھا۔ دوران تدریس وہ یوں گویا ہوتے جیسے دریائے علم میں طغیانی آگئی ہو اور ایسی سحر آفریں فضا طاری ہو جاتی کہ جیسے مہتاب کی کرن میں جان سی پڑ گئی ہو اور الفاظ جگنو بن کر دمکنے لگے ہوں۔ کلام غالب وہ خوب ڈوب کر پڑھاتے تھے اور اشعار بھی وہ بڑے ہی موثر انداز میں سمجھاتے۔ ایک موضوع پر کم سے کم دس شعرا کے حوالے دیتے اور تشریح و تعبیر بڑے دلنشیں انداز میں کرتے۔ پابندی سے تدریسی امور کی تکمیل میں وہ مستعد رہتے۔ سنجیدہ اور محنتی طلبا پر آپ کی خاص شفقت ہوتی۔ نادار طلبا کی وہ دستگیری بھی کرتے تھے۔ کچھ شوخ مزاج طلبا ایسے تھے جو آپ کا مذاق بھی اڑاتے تھے۔ ایسی حرکت کرنے والے دنیا میں رسوا ہوئے وہ تو اُستاد کی دنیا کے مرد قلندر تھے۔ ریاکاروں، کج رویوں، کج فہموں سے وہ ذرا فاصلہ بنا کر رہتے تھے۔ امتحانی امور میں وہ غیر جانبدارانہ اور منصفانہ رویہ اپناتے۔ اس لیے بددیانتی سے آپ کا دامن ہمیشہ پاک رہا۔ بڑے بڑے سورما کی سفارش اور دھمکی کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔ موجودہ دور میں آپ جیسے معلم تو عنقا ہیں۔ میں نے جس سال ایم اے میں داخلہ لیا تو ہمارے کچھ ہم جماعت گرگ باراں دیدہ اور جہاں چشیدہ حضرات تھے جو بڑے اثر و رسوخ والے ذہین اور فطین تھے۔ انھیں اردو دانی کا بڑا غرہ تھا۔ مگر جب نتیجہ آیا تو خاکسار کو سب سے زیادہ نمبرات حاصل ہوئے۔ اس سے ان حضرات کی تہہ دار خواہشیں تہ نشیں ہو گئیں۔ پھر کیا تھا وہ حضرات میری حرف گیری کی تاک میں رہتے اور پھبتی بھی کستے۔ ایک دن محترم لاری صاحب کے کلاس میں ایک طالب علم نے اشارتاً اور شرارتاً یہ شعر پڑھا۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

استادِ محترم نے پوچھا بھئی! یہ کس کا شعر ہے؟ حاضر جوابی کے زعم میں سرمست مخالف گروہ کے سرغنہ نے تپاک سے کہا کہ یہ تو شعر شبلی نعمانی کا ہے۔ میں نے فوراً جواب دیا نہیں، یہ تو معروف شاعر غالب کا ہے۔ اس وقت لاری صاحب نے کہا دیوان غالب کا مطالعہ کر کے کل بتائیے گا۔ دوسرے دن وہ حضرت منہ لٹکائے ہوئے کلاس میں آئے اور کہا کہ شبلی نے اپنے مضمون میں غالب کا یہ شعر کوٹ کیا ہے جو 'دواوین' میں ہے۔ پھر اس کے بعد میرے مخالفین کی ریشہ دوانیاں جاری رہیں اور ٹاپ کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگانے لگے مگر بفضل ربی فائنل میں میں نے سب سے زیادہ نمبر حاصل کیا اور گولڈ میڈل کا مستحق ہوا۔ ایم اے اردو ادب کے نصاب میں ایک پرچہ فارسی اور ہندی ادب کی تاریخ کا بھی تھا۔ شعبۂ اردو کے بنیاد گزار اساتذۂ کرام اس کلیے سے بخوبی واقف تھے کہ اردو کے لیے فارسی زبان ضروری ہے۔ ورنہ آگے چل کر اردو ادب کی قرأت میں دقت آئے گی۔ ہوا بھی یہی آزادی کے بعد ایسی نسلیں عالم وجود میں آئیں جس نے اعلیٰ تعلیم کی ڈگریاں حاصل تو کر لیں لیکن کلاسیکی ادب کی قرأت سے عاری رہیں۔ اس زمرے میں بندہ بھی شامل ہے۔ فی الوقت ہی نہیں ماضی میں بھی اعلیٰ تعلیم کی تدریس میں قابل توقیر وہی اساتذۂ کرام رہے

ہیں جن کی وابستگی کسی نہ کسی طور پر عربی اور فارسی زبان سے بھی رہی ہے۔قرین قیاس ہے کہ لاری صاحب نے بھی ابتدائی تعلیم کے دوران فارسی زبان کا درس ضرور لیا ہوگا۔وہ دور اندیش اور ذی علم استاذ تھے۔محنت سے جی چرانے والے طلبا اکثر ان کی کلاس سے غائب ہوجاتے تھے۔ان کی کوشش ہوتی کہ طلبا ابتدائی فارسی ضرور سیکھ لیں۔ اس غرض سے وہ فارسی کی پہلی اور دوسری کتاب خود خرید کر طلبا میں تقسیم کرتے۔ جب تک ان کی وابستگی شعبے سے رہی تب تک وہ فارسی بھی پڑھاتے رہے۔ان کے سبکدوش ہونے کے بعد شعبے میں کوئی صاحب ایسے نہیں تھے جو فارسی پڑھا سکیں۔لہٰذا کافی دنوں تک مہمان پروفیسر سے کام چلتا رہا اور اب ماشاءاللہ پروفیسر محمد رضی الرحمٰن صاحب اس اہم ذمے داری کو بحسن وخوبی انجام دے رہے ہیں۔

پروفیسر احمر لاری صاحب کلاس لینے کے بعد جب سائیکل اسٹینڈ تک جاتے تو کچھ طلبا ان کے ساتھ ہو لیتے۔ان میں سے کوئی ایک سائیکل باہر لاتا۔کبھی کبھی یہ سعادت مجھے بھی میسر ہوجاتی۔ان کی سائیکل اتنی اونچی تھی کہ دور سے پہچان لی جاتی۔کبھی تلاش کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔وہ اتنے لمبے تھے کہ چوبیس انچ کی سائیکل کو اونچی کر کے چھبیس انچ کا بنادیتے تھے۔مزید بر آں جب وہ گدی پر بیٹھتے تو ان کا پیر زمین پر ٹکا رہتا۔پیر لمبے ہونے کی وجہ سے انھیں سائیکل چلانے میں پریشانی ہوتی تھی۔اس لیے انھوں نے ایک موپڈ بھی خرید لی جس سے وہ یونیورسٹی آنے جانے لگے۔ وہ اپنے ساتھ ایک ہینڈ بیگ ضرور رکھتے تھے جس میں لکھنے پڑھنے اور شعبے کے دیگر ضروری کاغذات بڑے احتیاط سے رکھتے۔لباس، گفتار اور نشست و برخاست میں وہ اردو تہذیب کے آئینہ دار تھے۔سارے سراپا میں ان کے بال سب سے زیادہ صحت مند اور تابدار تھے۔اگر وہ انگلش ٹائپ کے بال نہ ترشواتے تو گیسو دراز ہوتے جو شاعروں اور دانشوروں کا شیوہ رہا ہے۔آپ کے پیر اتنے بڑے تھے کہ مشکل سے ان کے ناپ کا جوتا کسی دکان پر ملتا اور سینڈل کے لیے بھی انھیں دکاندار کو الگ سے ناپ دینا پڑتا تھا۔اکثر وہ سینڈل ہی استعمال کرتے اور اس پر سوتی موزہ پہنتے کیوں کہ ان کے پیر میں 'ایگزیما' کا عارضہ تھا۔لوگوں کا ایسا کہنا ہے کہ جن کو 'ایگزیما' ہوتا ہے وہ عمر دراز ہوتے ہیں۔واقعی لاری صاحب کی عمر 80 برس سے تجاوز کر گئی تھی۔فضول خرچی سے وہ اس قدر محترز تھے کہ کنجوسی کا گماں ہوتا۔فی الواقع وہ بڑے فراخ دل تھے۔مقرب،عزیز،دوست واحباب، شاگردوں کی وہ خاطر تواضع بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ کرتے۔شاگردوں کے ساتھ آپ کو جو حسن سلوک تھا وہ خال خال ہی کسی استاد میں ملتا ہے۔آپ کا حسن سلوک کے سبھی قائل تھے۔آپ کے ایک شاگرد رشید ڈاکٹر محمد ارشد خان آپ کے اخلاق و عادات کے عینی شاہد ہیں۔ چنانچہ لاری صاحب کی حین حیات میں انھوں نے ایک مضمون قلمبند کیا تھا جس میں انھوں نے اپنے تاثرات کا اظہار اس انداز میں کیا ہے:

''وہ بہت کم گو واقع ہوئے ہیں۔ بلا مقصد نہیں بولتے اور جب بولتے ہیں تو علم کے موتی ان کی زبان سے نکلتے ہیں، لہجہ بڑا دھیمہ، ٹھوس اور پر وقار نپے تلے الفاظ سوال کی مناسبت سے جواب دیں گے۔کسی بھی شاگرد کو چھیڑیں گے نہیں۔ بڑی متانت اور سنجیدگی کے ساتھ اس کے سوال کو سنیں گے اور بڑے صبر وتحمل سے اسے جواب دیں گے اور اس کی تسلی وتشفی کریں گے۔''

محترم احمر لاری صاحب نے تجرد کی زندگی بسر کی۔ شعبے کے دیگر اساتذہ ڈاکٹر اختر بستوی صاحب اور ڈاکٹر افغان اللہ صاحب نے بھی اس طرز زندگی کی اتباع کی۔ تینوں حضرات کی زندگی میں اس قدر طمانیت اور عافیت تھی کہ تاہل کی زندگی گزارنے والے افراد آپ لوگوں کی طرز زندگی پر رشک کرتے۔تینوں درویش صفت صاحبان نے اپنے بھائیوں اور ان کی اولاد کو اپنا لیا تھا اور اپنے حسن سلوک اور برتاؤ سے زندگی کو اس قدر پر بہار بنا لیا تھا جس میں کبھی خزاں آئی ہی نہیں۔ ازل سے ہی بھائیوں نے اپنے حقوق کے لیے صدائے احتجاج بلند کی ہے۔جلاوطنی اور قتل وغارت تک کی نوبت بھی آئی ہے۔ لوگوں کو اپنی اولاد سے بھی گزند پہنچتا ہے۔مگر قربان جائیے ان تینوں حضرات پر کہ جنھوں نے جبلتوں و روایتوں پر خاک ڈال کر حرص وآز سے مبرا بے مثال زندگی بسر کی۔ خاکسار کو کبھی یہ اندازہ ہی نہیں ہوا کہ ڈاکٹر پرویز لاری (بھتیجا) اور روما (بھتیجی) ان کی اولاد نہیں ہیں۔میں نے تو اولاد کو بھی اتنا فرمانبردار نہیں دیکھا۔وہ اپنے چھوٹے بھائیوں کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ایک روح دو قالب سنا تھا مگر تینوں بھائیوں کی الفت کو دیکھتے ہوئے اگر یہ کہا جائے کہ ایک روح تین قالب تو بے جا نہ ہوگا۔ایک صاحب قدرے معذور تھے ان کی وہ بھرپور کفالت کرتے تھے۔ڈاکٹر صاحب کے شاگردوں سے انھیں بڑی انسیت رہتی۔شاگرد بھی ان کی بڑی قدر کرتے تھے۔

آپ کا ادبی حلقہ بہت وسیع تھا۔مراسلت اور روابط ان کے بین الاقوامی سطح پر تھے۔وہ صوبۂ بہار میں انتہائی مقبول ومعروف تھے۔انھوں نے اعلیٰ تعلیم کی ڈگریاں وہیں سے حاصل کی تھی۔وہاں کے ادبا وشعرا سے صاحب سلامت تھی۔ وہاں کے امتحانات وغیرہ میں بھی مصروف کار رہتے تھے۔ان کے اہم دوستوں میں پروفیسر ملک زادہ منظور احمد صاحب، پروفیسر محمود الحسن رضوی صاحب، پروفیسر فضل امام رضوی صاحب، پروفیسر مختار احمد صاحب، پروفیسر اصغر عباس صاحب، ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی صاحب کے علاوہ ہندی اور اردو کے دیگر ادیبوں اور شاعروں سے گہرے مراسم تھے۔اس باب میں اگر ڈاکٹر غلام رسول مکرانی کا ذکر نہ کیا جائے تو ان کے احباب کی فہرست پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچے گی۔ دونوں حضرات کے تعلقات عرصۂ دراز سے قائم تھے۔ایک ساتھ تعلیم حاصل کی اور ریلوے میں ایک ساتھ ملازمت اختیار کی۔اعلیٰ تعلیم کی ملازمت میں بھی شانہ بشانہ چلے۔لاری صاحب یونیورسٹی میں تو مکرانی صاحب سینٹ اینڈریوز میں لکچرر ہوئے۔ دونوں حضرات وسیع المطالعہ تھے اور گورکھپور کی ادبی محفلوں اور مجلسوں کے روح رواں تھے۔مکرانی صاحب جب اپنے مخصوص انداز میں کسی پروگرام کی نظامت کرتے تو سامعین کو ان کی علمیت اور طلاقتِ زبان کا اندازہ ہوتا۔ دونوں حضرات کی سنجیدگی اور شائستگی کا اہل شہر معترف تھے۔ان کے تعلق خاطر کا آپ اس امر سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ لاری صاحب نے جب عالیشان 'ادبستان' کی تعمیر کروائی تو اس سے متصل مکرانی صاحب نے بھی اپنا آشیانہ بنوایا۔ دونوں حضرات کا انتقال ایک آدھ سال کے آگے پیچھے ہوا ہوگا۔مگر مشیت ایزدی دیکھیے کہ گورکھپور کے قدیمی قبرستان 'کچی باغ' میں مرحومین آسودۂ خاک ہیں۔

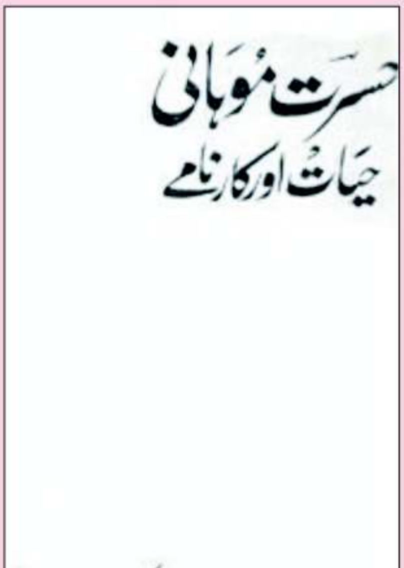

گورکھپور کی ادبی محفلوں اور نشست گاہوں کا جب بھی ذکر کیا جائے گا تو احمر لاری صاحب کا نام بڑے احترام کے ساتھ لیا جائے گا۔ ان کے بانیان اور رفیقان سے ان کی رفاقت تھی۔ دو تین اڈے (نشست گاہیں) تو ایسے تھے جہاں وہ اپنی سائیکل سے بلا ناغہ روز پہنچتے تھے۔ سب سے پہلے وہ حکیم ابوالکلام صاحب کے مطب پر پہنچتے۔ حکیم صاحب کو شعر و شاعری کا بڑا اچھا ذوق تھا وہ اردو زبان کے پرستار تھے۔ اکثر وہ ادبی محفلوں کی صدارت کرتے تھے۔ ان کی طرز زندگی ایسی تھی کہ انھیں دیکھ کر مولانا ابوالکلام آزاد کا بھرم ہوتا تھا۔ ان کے مطب کے معاون ڈاکٹر منظور احمد صاحب کا شمار پڑھے لکھے لوگوں میں ہوتا تھا۔ وہ اکثر ادبی محفلوں اور مباحثوں میں شریک ہوتے تھے۔ حکیم صاحب کے مطب سے تھوڑی ہی دور پر جوہر صاحب کی چھوٹی سی دکان تھی جہاں بڑی بڑی باتیں ہوتی تھیں۔ لوگ اس دکان کو جوہر صاحب کے تخت کے نام سے جانتے تھے۔ وہ استاذ شاعر تھے اور مرنجان مرنج قسم کے آدمی تھے۔ وہ سب سے بڑے تپاک سے ملتے۔ ان کی محفل سے جو بھی اٹھتا تھا اپنے آپ پر فخر محسوس کرتا تھا۔ لاری صاحب وہاں ضرور ٹھہرتے خیر و عافیت و ادبی امور پر باتیں کرکے آگے نکل جاتے۔ گھر واپس ہونے پر وہ بندوق کی دکان پر کچھ دیر کے لیے بیٹھتے تھے جہاں گولیاں کم بولیاں زیادہ چلتی تھیں۔ بین الاقوامی سطح پر ادبی مباحث ہوتے۔ وہاں بیٹھنے والے حضرات کا ادبی ذوق غیر معمولی تھا۔ ہفتے میں ایک آدھ بار ادب نواز محمد حامد صاحب رئیس 'گلفشاں حویلی' قاضی پور خورد کے یہاں عموماً ہندی گورکھپوری کے ساتھ تشریف لے جاتے۔ محترم حامد صاحب متواضع طبیعت کے مالک تھے کسی نہ کسی بہانے ادبی محفلوں اور ضیافتوں کا اہتمام کرتے رہتے تھے۔ اس روایت کو ابھی ان کے چھوٹے صاحبزادے محمد سعید حارث میاں برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ اب تو پورا منظر نامہ ہی بدل گیا ہے۔ اب ایم کوٹھیاوی راہی جیسی شخصیت کہاں؟ وہ ہفت روزہ 'اشتراک' کے مدیر تھے۔ انھوں نے ایک دفتر بھی قائم کر رکھا تھا۔ جہاں شعرا و ادبا کا مجمع لگتا تھا۔ راہی صاحب اردو زبان و ادب کے چلتے پھرتے اشتہار اور اردو کو ہی اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا۔ پان خوب کھاتے جیب میں رکھی ہوئی دستی سے بار بار منہ صاف کرتے رہتے تھے۔ کسی کو بولنے کا موقع نہیں دیتے تھے۔ ان کی تعلیمی استعداد بھلے ہی کم تھی مگر تھے وہ فطرتاً شاعر اور نثار بھی۔ راہی صاحب اور لاری صاحب کے درمیان خوشگوار تعلقات نہیں تھے پھر بھی وہ لوگ اردو تہذیب کے

> **گورکھپور کی ادبی محفلوں اور نشست گاهوں کا جب بهی ذکر کیا جائے گا تو احمر لاری صاحب کانام بڑے احترام کے ساتھ لیا جائے گا۔ ان کے بانیان اور رفیقان سے ان کی رفاقت تھی۔ دو تین اڈے (نشست گاهیں) تو ایسے تھے جہاں وہ اپنی سائیکل سے بلاناغہ روز پہنچتے تھے۔ سب سے پہلے وہ حکیم ابوالکلام صاحب کے مطب پر پہنچتے۔ حکیم صاحب کو شعر و شاعری کا بڑا اچھاذوق تھاوہ اردو زبان کے پرستار تھے۔**

تقاضے کی پاسداری کرتے تھے۔ پروفیسر محمود الٰہی صاحب اور ڈاکٹر سلام سندیلوی صاحب کی شخصیات شمع محفل کی سی تھی۔ جن سے اہل علم و ادب کسب فیض کرتے تھے۔ خیر پروفیسر محمود الٰہی صاحب آپ کے قابل قدر استاذ تھے جن کا وہ بڑا احترام کرتے تھے اور اہم علمی و ادبی مسائل پر مشاورت کرتے تھے۔ اس وقت مجھے ایسا محسوس ہوا کہ سلام صاحب اور لاری صاحب کے درمیان کچھ کبیدہ خاطری تھی۔ اردو زبان و ادب کو مشتہر اور مقبول عام بنانے میں ڈاکٹر عزیز احمد صاحب کے شفاخانے سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بھی گورکھپور میں یادگار اور ناقابل فراموش اردو زبان و ادب کا مسکن ہے۔ یوں تو اس دیار سے پروفیسر افغان اللہ صاحب اور راز اعظمی صاحب کی قربت جگ ظاہر تھی۔ مگر سچ پوچھیے تو ڈاکٹر صاحب نے نئی نسل میں ادبی ذوق اور اردو زبان سے انسیت پیدا کر کے سالار کارواں بن گئے۔ آپ کے کار دل پذیر سے کون سا ایسا محب اردو ہے جو متاثر نہیں ہے۔ آپ کو بے شمار اشعار ازبر ہیں۔ وہ ادبی محفلوں میں برمحل شعر متاثر کن انداز میں پڑھتے ہیں۔ یہ اردو شعر و ادب کے لگاؤ کا ثمرہ ہے کہ مشاہیر شعرا کے منتخب اشعار کا ایک بیاض مرتب کیا ہے جسے بڑی مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب ابھی اس کار خیر میں سرگرم عمل ہیں۔ لاری صاحب آپ کی متحرک سروری کو سراہتے تھے۔ وہ ہر محب اردو اور بہی خواہ رضاکارانہ اقدام کو نظر استحسان سے دیکھتے تھے۔

اپنے شاگردوں سے مطالعے کی ترغیبات آپ کی ترجیحات میں شامل تھیں۔ ایسے مخلص معلم اب کہاں ہیں! میں نے جب پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تو اظہار تشکر کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ وہ الفاظ سے دعائیں کم دیتے تھے بس چہرے کی متبسم بشاشت سے یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ آپ سراپا دعا گو ہیں۔ اس وقت آپ نے فرمایا کہ اب مطالعہ اپنی معمولات زندگی کا حصہ بنا لیجیے۔ میں حیرت میں تھا کیا میں نے اب تک مطالعہ کیے بغیر مقالہ لکھا ہے؟۔ پھر گویا ہوئے کہ ڈگری کے وقار کو برقرار رکھنے کے لیے مطالعہ لازمی ہے۔ خصوصاً دیوان غالب، کلیات اقبال اور غبار خاطر کو اپنا وظیفۂ حیات بنا لیجیے۔ مزید برآں آپ کا حکم صادر ہوا کہ سب سے پہلے بی اے کے نصاب کی کتابوں کا اس قدر بغور مطالعہ کیجیے کہ الفاظ کی تراکیب اور اضافت کے ساتھ اس کے لغوی، اصطلاحی اور مرادی معنی تک رسائی ہو سکے۔ مثلاً بزدل، خرگوش، خانہ بدوش جیسے الفاظ کے لغوی معنی سمجھیے پھر پوچھا کیا بز، خر، گوش، بدوش کا لغوی معنی بتا سکتے ہیں۔ ایک ڈاکٹریٹ ڈگری یافتہ خاموش بیٹھا تھا پھر آپ نے معنی بکری، گدھا، کان اور کندھا تو بتا دیا مگر یہ رائے دی کی فارسی کی ابتدائی معلومات ایک اردو کے معلم اور متعلم کے لیے ضروری ہے۔ چنانچہ آپ کے مشوروں پر میں نے عمل کیا۔ آپ نے بی اے کی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے لیے کہا تھا۔ میں نے اردو کی پہلی کتاب پڑھنا شروع کیا تو ایک جگہ ایک لفظ 'بوتام' پر اٹک گیا۔ لغت دیکھنے کی ضرورت پڑی تو معلوم ہوا کہ بوتام 'گھنڈی' کو کہتے ہیں یہ عربی لفظ انگریزی میں جا کر بٹن ہو گیا ہے۔ محترم نے صرف و نحو اور فارسی کی پہلی اور دوسری کتابیں عنایت کیں۔ اس طور کے مطالعے میں بڑی برکت ہوئی وہ صحت زبان اور معیاری تلفظات پر بڑا دھیان دیتے۔ وہ اعلیٰ تعلیم میں ادبی سطح پر 'غلط العوام فصیح' کے قائل نہیں تھے۔ آپ کی اصلاح کا ایک خاص طریقہ تھا۔ پڑھتے یا بولتے وقت غلط زبان استعمال کرنے پر وہ نہ ٹوکتے اور نہ ڈانٹتے۔ بس بڑے سلیقے سے لفظ کو دہرا دیتے اور سمجھنے والوں کے لیے یہ اشارہ کافی ہوتا تھا۔ روح و رواں اور زندہ و جاوید جیسے غلط الفاظ کو اس طرح صحیح کرتے روح رواں اور زندۂ جاوید ہے۔ اکثر لوگ گنتی کے غیر معیاری تلفظ ادا کرتے ہیں کیونکہ اس پر علاقائی بولیوں کا اثر ہوتا ہے۔ جب کوئی چھاچھٹ اور نبے کہتا تو اس کو بتلاتے کہ اس کا معیاری تلفظ چھیاسٹھ اور نوے ہے۔ غرضیکہ آپ کی صحبت میں اصلاح کا سلسلہ جاری رہتا اور کسی کو کچھ پتہ بھی نہیں چلتا... جب میں مقالے اور مراسلے لکھتا تو اسے دیکھ کر بہت خوش ہوتے اور حوصلہ افزائی کرتے۔ آپ کی تو خواہش یہ تھی کہ میں ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کروں۔ اس کے لیے 'قرۃ العین حیدر کی فکشن کا سماجیاتی مطالعہ' کے عنوان سے خاکہ بھی تیار ہو گیا تھا اور درخواست بھی یونیورسٹی کے دفتر تک پہنچ گئی تھی۔ مگر یہ کام آگے نہیں بڑھ سکا۔

میرے لیے شعبے سے متعلق کوئی نہ کوئی کام وہ ضرور نکال لیتے تھے۔ کچھ نہیں تو نصاب کا مسودہ خوشخط لکھواتے۔ پروفیسر محمود الٰہی صاحب کے سبکدوش ہونے کے بعد جب جزوقتی لیکچرر کی ضرورت پڑی تو انھوں نے مجھے اور ڈاکٹر فوزیہ بانو صاحبہ کو ترجیح دی۔ حالانکہ اس وقت بہت پہنچے ہوئے فقیروں کی کمی نہیں تھی۔ وہ حضرات چیں بجبیں بھی ہوئے مگر انھوں نے اس کی پرواہ نہیں کی۔ تقریباً سال بھر شعبے میں کام کیا اس کے بعد ایم پی ایس سی میں میرا اسلیکشن ہو گیا۔ لاری صاحب مجھے اپنے شعبے میں دیکھنا چاہتے تھے مگر حالات سازگار نہیں ہو سکے۔ حالانکہ دوران گفتگو آپ کہتے رہے کہ یہ تو بنواس ہے جو مختصری مدت میں ختم ہو جائے گی۔ گورکھپور کے شعبۂ اردو سے جب بھی کوئی جگہ مشتہر ہوتی تو وہ درخواست کا فارم ضرور بھجواتے۔ مگر کئی سالوں تک کوئی تقرر عمل میں نہیں آسکا بہت دنوں کے بعد ریڈر کی جگہ نکلی تو آپ نے فارم بھجوایا۔ میں نے درخواست بھی بھیجی مگر کچھ ناگزیر وجوہ کی بنا پر انٹرویو میں شامل نہیں ہو سکا۔ میری اس حرکت سے وہ بہت ناراض ہوئے مگر ڈاکٹر محمد رضی الرحمٰن صاحب جیسے لائق وفائق اسکالر کا جب انتخاب عمل میں آیا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ وہ ان کی فرض شناسی، علم نوازی اور سنجیدگی سے ازحد متاثر ہوئے اور ان سے شعبے کے روشن مستقبل کے متمنی ہوئے جو حق بجانب تھا۔

ڈاکٹر صاحب کا سلوک اپنے شاگردوں سے مساویانہ ہوتا تھا۔ وہ استاذ اور شاگرد کے مابین بہت زیادہ امتیازی خطوط نہیں کھینچتے اور سفر میں یہ رویہ دوستانہ ہو جاتا۔ مجھے بھی ڈاکٹر صاحب کے ساتھ سفر کرنے کا موقع ملا ہے۔ ایک بار پٹنہ کے سفر میں انھوں نے مجھے بھی ساتھ لے لیا۔ وہاں پہنچ کر سبزی باغ کے ایک ہوٹل میں مقیم ہوئے۔ ان دنوں بہار میں بتی گل ہونا عام بات تھی۔ حفظ ما تقدم کے تحت مسافر اپنے پاس موم بتی ضرور رکھتے۔ معلوم نہیں بجلی کب چلی جائے اور کب آئے؟ اس وقت بھی یہی ہوا خیر موم بتی جلائی گئی اور بہت دیر تک بجلی نہیں آئی اس کی عمر طبعی ختم ہونے لگی اور وہ تھرتھرانے لگی۔ اس وقت بے ساختہ یہ مصرعہ زبان پر آ گیا۔

ایک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

پہلا مصرعہ کافی کوشش کے بعد بھی ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔ بات کرتے کرتے نیند آ گئی مگر بجلی نہیں آئی۔ صبح اٹھتے ہی لاری صاحب نے نامکمل شعر کو اس طرح پورا کیا۔

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

ناشتے کے بعد ہم لوگ پروفیسر محمد حسنین صاحب کے ڈیرے پر گئے۔ یونیورسٹی کا کوئی مخفی معاملہ تھا جس پر دونوں صاحبان نے تبادلہ خیال کیا۔ پٹنہ میں رہائش گاہ کو 'ڈیرہ' کہا جاتا ہے لیکن ایک یوپی والے کی نظر میں وہ تو عالی شان محل تھا۔ اس سے بڑھ کر پروفیسر صاحب کی الماریاں جن میں کتابیں بڑے قرینے سے سجائی گئی تھیں جو قابل دید تھیں اور مہدی افادی نے تو کتابوں کو 'عروس حریری' بھی کہا ہے جسے پروفیسر صاحب نے حرمت بخشا تھا۔ انشائیہ پر آپ کا معرکہ آرا کام ہے۔ علاوہ ازیں آپ نے نفیس انشائیے بھی لکھے ہیں۔ انشائیہ کے متعلق آپ کا یہ قول بہت مشہور ہے 'انشائیہ نثر کی غزل ہے'۔ آپ کی زندگی انشائیوں کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ آپ کی طرز زندگی کے اثرات آپ کے شاگردوں پر بھی پڑے۔ ایک مثال پروفیسر ارتضیٰ کریم صاحب کی پیش کی جا سکتی ہے جو نمونہ انشائیہ ہیں۔

لاری صاحب تنقید وتحقیق کے مرد میداں تھے۔ ان امور سے زندگی بھر آپ کی وابستگی رہی۔ وہ اعلیٰ پایے کے مدون بھی تھے۔ شعبہ اردو میں لکھنے پڑھنے کا خوشگوار ماحول تھا۔ سبھی اساتذہ ریسرچ اسکالروں کی معاونت بغیر کسی قیل و قال کے کرتے تھے۔ میں تو پروفیسر محمود الٰہی صاحب کی نگرانی میں مقالہ لکھ رہا تھا مگر ضرورتاً لاری صاحب کے رہنمائی بھی حاصل ہو جاتی تھی۔ وہ مضمون کی اصلاح بطیب خاطر کرتے تھے۔ آپ کی تربیت کا طریقۂ کار بڑا نرالا تھا۔ میرے جیسے بہت سے اسکالر آپ سے مستفید ہوتے تھے۔ آپ کی نگرانی میں ایک درجن سے زائد مقالے لکھے گئے۔ بغیر کسی تقدیم وتاخیر کے اسمائے گرامی ہیں۔ ڈاکٹر مقیم صدیقی، ڈاکٹر کفایت اللہ انصاری، ڈاکٹر مشتاق خان، ڈاکٹر ابصار احمد، ڈاکٹر محمد شمیم، ڈاکٹر محمد نعمان، ڈاکٹر محمد ایمن انصاری، ڈاکٹر عبدالواحد، ڈاکٹر انور حسین، ڈاکٹر محمد ارشد خان، ڈاکٹر مس زبیدہ خاں، ڈاکٹر اکبر علی، ڈاکٹر پرویز لاری، ڈاکٹر ممتاز جہاں وغیرہ میری معلومات میں ہیں۔ مذکورہ ڈگری یافتگان میں محمد ایمن انصاری اور ارشد خان کے مقالات شائع ہوئے ہیں۔ ادب وصحافت کے میدان میں اس وقت ڈاکٹر اکبر علی محتاج تعارف نہیں۔ آپ لاری صاحب کے عزیز ومعتمد شاگرد ہیں۔ وہ لاری صاحب کے اس قدر قریب تھے کہ لوگ انھیں گھر کا فرد سمجھتے تھے۔ سفر ہو یا حضر وہ ہر جگہ نظر آتے تھے فی الحال صحافت کے میدان میں اپنے قلم کا جوہر دکھا رہے ہیں اور بڑی ہر دلعزیز شخصیت کے مالک ہیں۔ اہل اردو کو ان سے بڑی توقعات ہیں۔

آزادی سے تقریباً پندرہ سال قبل آپ ضلع دیوریا کے قصبہ لار کے ایک ذی علم خانوادے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محمد عین الحق لاری پرانے سائنس کے گریجویٹ تھے اور وہ بی ایس سی صاحب کے نام سے جانے جاتے تھے۔ انھیں اردو زبان وادب سے گہری دلچسپی تھی جس کے باعث انھوں نے اپنی ذاتی لائبریری قائم کر رکھی تھی۔ لاری صاحب نے اسکولی تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنی ذاتی لائبریری کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اس وقت اردو زبان کی پوزیشن بڑی مستحکم تھی۔ نظام تعلیم میں ذریعہ تعلیم اردو تھی۔ اس کے علاوہ فارسی زبان اختیاری مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی تھی۔ اس سے اردو کی بنیاد مضبوط ہو جاتی تھی۔ اردو کے ایسے خوشگوار ماحول میں آپ نے ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا اور جب یونیورسٹی کی ملازمت اختیار کی تو وہ تحقیق وتنقید کی طرف راغب ہوئے۔ مگر شاعری سے آخری دم تک رشتہ استوار رہا۔ وہ اپنے اصل نام پروفیسر عین الحق لاری سے زیادہ اپنے تخلص احمر لاری کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ کا کوئی شعری مجموعہ تو شائع نہیں ہوا مگر اس وقت کے رسائل اور نشریات میں اپنی جگہ بنائے ہوئے تھے۔ گورکھپور ریڈیو اسٹیشن کے اردو پروگرام میں شاعر کی حیثیت سے مدعو کیے جاتے تھے۔ آپ کے سامعین کی اچھی خاصی تعداد تھی۔ میں نے خود ہی لاری صاحب کے کلام کو ریڈیو پر سنا ہے۔ وہ شعر بڑے ہی لحن ودلنشیں انداز میں پڑھتے تھے۔ الفاظ کے زیروبم وصوت کی ہم آہنگی سے ایسی فضا قائم ہو جاتی کہ سامعین ان کے اشعار کو کان دھر کر سنتے ہی جاتے تھے۔

لاری صاحب تنقید وتحقیق کے مرد میداں تھے۔ان امور سے زندگی بھر آپ کی وابستگی رہی۔وہ اعلیٰ پایے کے مدون بھی تھے۔ شعبۂ اردو میں لکھنے پڑھنے کا خوشگوار ماحول تھا۔سبھی اساتذہ ریسرچ اسکالروں کی معاونت بغیر کسی قیل و قال کے کرتے تھے۔میں تو پروفسیر محمود الہیٰ صاحب کی نگرانی میں مقالہ لکھ رہا تھا مگر ضرورتاًلاری صاحب کے رہنمائی بھی حاصل ہو جاتی تھی۔وہ مضمون کی اصلاح بطیب خاطر کرتے تھے۔آپ کی تربیت کا طریقۂ کار بڑا نرالا تھا۔میرے جیسے بہت سے اسکالر آپ سے مستفید ہوتے تھے۔

اگر وہ مشاعرے میں شرکت کرتے تو انھیں بڑی کامیابی ملتی۔ مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر چند اشعار دیکھیے۔

اپنے ہی ہاتھوں خود اپنا گھر جلا لیتے ہیں ہم
یوں ہی اکثر جشن آزادی منا لیتے ہیں ہم
کہیں پر قتل آدم کا، کہیں پر ہے آدمیت
یہ کیسے راہبر ہیں، دارو وحشت جن کی منزل ہے
اجڑے ہوئے نگر کا سارا منظر ہے ہر طرف
کتنا اداس شہر تمنا دکھائی دے

لاری صاحب کی ادبی اور ذاتی زندگی روشن خیالی سے منور ہے۔ وہ ترقی پسندی کے حامی اور رجعت پسندی کے مخالف تھے۔ وہ زندگی بھر اردو ادب کی تنظیموں اور تحریکوں کے شریک و سہیم تھے۔ دم واپسیں تک آپ کا رشتہ شعبے سے استوار رہا۔ مارچ 2009 میں شعبۂ اردو نے ایک شاندار سمینار کا انعقاد کیا تھا۔ جس میں آپ بہ نفس نفیس شریک ہوئے۔ باوجود اضمحلال کے آخری وقت تک وہ تشریف فرما تھے۔ آپ کی نقاہت کو دیکھتے ہوئے لوگوں نے کہا کہ سر آپ آرام کیجیے تو سر نے جواب دیا یہ میرا فریضہ ہے جسے میں انجام دے رہا ہوں۔ زندگی کے آخری ایام میں وہ کافی نحیف ہو گئے تھے۔ آخر میں اردو کے اس شیدائی کا چراغ حیات فروری 2011 کو گل ہو گیا جس نے نصف صدی سے زیادہ عرصے تک اردو زبان و ادب کی یادگار خدمت کی۔

باب تحقیق میں آپ کی اہم کاوش 'حسرت موہانی حیات اور کارنامہ' ہے۔ اسی مقالے پر گورکھپور یونیورسٹی نے انھیں 1965 میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی جو 1973 میں اردو اکادمی اتر پردیش کے مالی تعاون سے شائع ہوئی۔ اس کا انتساب انھوں نے اپنے مشفق استاد پروفیسر محمود الٰہی صاحب کے نام اس شعر سے کیا ہے۔

نگہ بلند سخن دلنواز جاں پرسوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لیے

یہ آٹھ ابواب میں منقسم تقریباً چار سو پچاس صفحات پر مشتمل ضخیم مقالہ ہے جو آپ کی محنت شاقہ کی برومندی ہے۔ اس مستند کتاب میں حسرت کی حیات اور ادبی شخصیت کے ساتھ ساتھ سیاست اور صحافت کا بھرپور منظر نامہ ہے۔ بجا طور پر عہد حسرت کو ہندوستان کی تاریخ کا انقلابی دور قرار دیا ہے۔ حسرت کے کردار کی رومانیت شدت کے احساس اور وفور جذبات کی صدائے بازگشت انھیں سیاست، صحافت اور اردو ادب کے میدان میں صاف سنائی دیتی ہے۔ اکثر تذکرے کے باب میں حسرت کا ذکر نہیں کیا جاتا ہے مگر مقالہ نگار نے حسرت کی تذکرہ نگاری کو لائق

مشرقی اصول تنقید کا سہارا لیے بغیر اردوشاعری کی صحیح تنقید ممکن نہیں۔ جدید دور کے جن نقادوں نے اس نکتے کو فراموش کردیا اور مغربی اصول تنقید کی کسوٹی پر اردو شاعری کو کسنا چاہا انہیں بہرحال ناکامی ہوئی۔ اس سلسلے میں کلیم الدین احمد کی مثال سامنے ہے۔ان کی تصنیف 'اردو شاعری پر ایک نظر' اردو شاعری کی تنقیص ہو کر رہ گئی ہے۔ اردو کے نقاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ مشرقی اصول تنقید اور مغربی اصول تنقیددونوں پر ہی قدرت رکھتا ہو۔

اعتنا سمجھا ہے اور اس کے ادبی مقام کا تعین بڑے متوازن انداز میں اس طرح کیا ہے:

اردو تذکروں کے آسمان پر اسے مہ کامل کا درجہ بھلے ہی نہ حاصل ہو لیکن اسے روشن سیارے کا درجہ ضرور حاصل ہوگا۔ (ص نمبر 332)

تنقید کے باب میں آپ نے صداقت اور استدلال کو اپنا رہنما اصول بنا کر بڑی نکتہ آفرینی سے کام لیا ہے جو انتہائی عرفان و ادراک سے مزین ہے۔ وہ اردو ادب کو پرکھنے کے لیے مشرقی اصول تنقید کو کار آمد سمجھتے ہیں۔ وہ مغربی تنقید کی اندھی تقلید کے قائل نہیں ہیں۔ اردو تنقید کے سلسلے میں ان کی یہ متوازن رائے قابل قبول ہے:

''مشرقی اصول تنقید کا سہارا لیے بغیر اردو شاعری کی صحیح تنقید ممکن نہیں۔ جدید دور کے جن نقادوں نے اس نکتے کو فراموش کر دیا اور مغربی اصول تنقید کی کسوٹی پر اردو شاعری کو کسنا چاہا انھیں بہر حال ناکامی ہوئی۔ اس سلسلے میں کلیم الدین احمد کی مثال سامنے ہے۔ ان کی تصنیف 'اردو شاعری پر ایک نظر' اردو شاعری کی تنقیص ہو کر رہ گئی ہے۔ اردو کے نقاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ مشرقی اصول تنقید اور مغربی اصول تنقید دونوں پر ہی قدرت رکھتا ہو۔''

(ص نمبر 183)

لاری صاحب کی تنقید پر ایک کتاب 'اردو تنقید کا ارتقا 1835 تا 1936' منظر عام پر نہیں آسکی۔ اگر یہ کتاب شائع ہو جاتی تو ان کے تنقیدی اصول و نظریات کو سمجھنے میں آسانی ہوتی۔ آپ نے حسرت موہانی پر بھرپور مقالہ لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے حسرت کی نثر کو ان کی شاعری پر فوقیت دی ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔

''ان کے شعر پڑھتے ہی دل میں اتر سکیں یا نہ اتر سکیں، لیکن ان کی نثر دل میں گھر ضرور بنا لیتی ہے۔ المختصر حسرت ایک بلند پایہ نثر نگار تھے اور ان کے نثری کارنامے ہماری ادبی تاریخ کا درخشاں باب ہے۔'' (ص 480)

آپ کے نثری کارناموں میں تحقیق، تنقید، تدوین، مقدمے اور دیباچہ وغیرہ کی کاوشات شامل ہیں۔ جن میں ان کی نثر نگاری کے جوہر کھلتے ہیں۔ ان کی زبان سادہ سلیس اور شگفتہ جیسے اوصاف سے متصف ہے اور اظہار مافی الضمیر میں بلا کی روانی ہے۔ بطور نمونہ ایک پارۂ نثر ملاحظہ کیجیے:

''نشور کی غزلوں میں روایت کا تحفظ بھی ہے اور اس کی توسیع بھی۔ ان کی ابتدائی غزلوں میں اگر عارفانہ رنگ ہے تو، بعد کی غزلیں تغزل کی رنگینیوں، حسن و جمال کی کیفیات اور زندگی کی سنگلاخ حقیقتوں کی آئینہ دار ہے۔ ان کے اسلوب میں سادگی کے ساتھ پرکاری ہے، تشبیہوں اور استعاروں میں جدت و ندرت ہے اور آہنگ میں نغمگی ہے جو دلوں میں اتر جاتی ہے۔

(مقدمہ نشور واحدی شخصیت اور فن ص نمبر 12)

آپ متعدد کتب کے مصنف و مؤلف اور مدون ہیں۔ ان میں سے کئی کتابیں مقبول عام ہیں جن پر اتر پردیش اکادمی نے انعامات سے سرفراز کیا ہے۔ آل انڈیا میر اکادمی لکھنؤ نے امتیاز میر ایوارڈ اور یوپی اردو اکادمی نے 2002 میں مجموعی ادبی خدمات پر ایوارڈ سے نوازا ہے۔ آپ کی کئی کار آمد کتابیں شائع نہیں ہو سکی ہیں۔ آپ کے متعلقین اور لواحقین کا یہ فریضہ ہے کہ ان نادر نگارشات کو منظر عام پر لائیں۔

پروفیسر احمر لاری صاحب محض اردو کے ایک پروفیسر ہی نہیں تھے بلکہ تخلیقات، تحریکات اور دیگر کاوشات میں سرگرم عمل تھے۔ آزادی کے بعد اردو کے اس دور بخت خفتہ میں انھوں نے تدریس، تحریر، ترسیل، ترغیب جیسے اہم امور پر جس نہج پر خدمات انجام دی ہیں اور اس سمت میں انھوں نے جو مخلصانہ اور رضا کارانہ اقدام کیے ہیں وہ مستحسن ہے۔ ان کی وقیع ادبی خدمات اردو ادب کی تاریخ میں لائق تحفظ ہے۔ اردو زبان و ادب کی بقا و تحفظ میں جن یگانۂ روزگار محبان اردو نے جگر کاوی کی ہے ان میں آپ جیسی قابل فخر شخصیت پر یہ شعر صادق آتا ہے۔

یہ کلی بھی اس گلستان خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

■

Dr. Ghulam Husain
Head Dept. of Urdu
Govt Madhav College, Ujjain - 456006 (MP)
Mob.:9893853183
Email.: hussainghulam36@gmail.com

وہی چراغ بجھا جس کی لو قیامت تھی

آہ! ظفر احمد صدیقی

محمد اختر

ظفر احمد صدیقی کا شمار عہد حاضر کے اہم محققین اوردانش وروں میں ہوتا ہے۔ عربی، فارسی ادبیات اوراردو زبان وادب پر انھیں یکساں قدرت حاصل تھی۔عالم باعمل تھے، گفتگو کا انداز سلجھا ہوا، مدلل اور منطقی تھا۔دوران گفتگو انھیں بھٹکتے / اٹکتے ہوئے شاذ ہی کبھی دیکھا گیا ہو۔ان کی گفتگو دریا کی مانند رواں دواں ہوتی تھی۔حافظہ بلا کا تھا اورمطالعہ کافی وسیع یہی سبب ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی جیسے قدآور عالم بھی عربی وفارسی علوم سے متعلق معاملات میں ان سے صلاح ومشورہ کیا کرتے تھے۔فاروقی صاحب کو ظفر صاحب سے قلبی لگاؤ تھا۔محبت وشفقت سے اکثر انھیں 'مولوی' اور کبھی کبھی 'ظفر' کہہ کر پکارا کرتے تھے۔یہ بھی عجب اتفاق ہے کہ ان کی وفات کے صرف چار دن بعد، ظفر صاحب بھی اس دار فانی کو خیر باد کہہ گئے۔ایک ماہ سے تقریباً جواہر لال نہرو میڈیکل کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں ایڈمٹ تھے۔ 29 دسمبر 2020 کو دوپہر میں وہیں انتقال ہوا اور 30 دسمبر بروز بدھوار یونیورسٹی قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔

ظفر احمد صدیقی کا تعلق مشرقی یوپی کے ایک قصبہ گھوسی، مئو کے محلّہ ملک ٹولہ سے تھا۔یہیں پر 10 اگست 1955 میں پیدا ہوئے، ندوۃ العلما لکھنؤ اور مظاہر علوم سہارنپور سے مذہبی علوم اورمشرقی فنون کی تعلیم حاصل کی۔فراغت کے بعد اپنا مستقل مسکن بنارس شہر کو بنایا۔درس وتدریس اورمذہبی علوم سے ذہنی مناسبت تھی۔اس لیے جامعہ اسلامیہ، ریوڑی تالاب، بنارس سے منسلک ہوگئے اورقرآن وحدیث کے موضوعات پر درس دینے لگے، لیکن طلب علم کی پیاس ابھی تک بجھی نہ تھی۔اس لیے شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔بی۔ اے اورایم۔اے (اردو) امتیازی نمبرات سے پاس ہوئے۔اس کے بعد پی ایچ ڈی میں داخلہ لیا۔موضوع: ''شبلی کی علمی وادبی خدمات'' طے پایا اورحکم چند نیّر نگراں مقرر ہوئے، لیکن تحقیقی وتنقیدی مزاج حنیف احمد نقوی (مرحوم) سے میل کھاتا تھا۔اس لیے موضوع سے متعلق صلاح ومشورہ زیادہ تر وہ نقوی مرحوم سے ہی کیا کرتے تھے۔بعد میں یہ محبت عقیدت میں بدل گئی اورظفر احمد صاحب کا شمار نقوی مرحوم کے لائق شاگردوں میں ہونے لگا۔جلد بازی سے انھیں خداواسطے کا بیر تھا۔اس لیے اپنے شاگردوں کو بھی مطالعے کی ترغیب اورعجلت پسندی سے بچنے کا مشورہ دیا کرتے تھے۔

شبلی کے محقق اورناقد کی حیثیت سے علمی وادبی حلقوں میں ان کا پہلا تعارف تھا۔ ارباب دارالمصنفین نے ابتداًان کی تنقید کا برا مانا، لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد ان کی شرافت، سنجیدگی اورعلمی دیو قامتی کے وہ بھی مرید ہوگئے۔ظفر احمد صدیقی کے علمی اکتسابات پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر قاضی جمال حسین لکھتے ہیں کہ:

''پروفیسر ظفر احمد صدیقی کے علمی اکتسابات، سنجیدہ علمی حلقوں میں تعارف کے محتاج نہیں۔علامہ شبلی پر ان کا تحقیقی کام اورنظم طباطبائی کی شرح دیوان غالب پر ان کے عالمانہ حواشی، حوالے کی حیثیت رکھتے ہیں۔علمی دیانت اور اصابت رائے، ان کی تحریروں کی اہم خصوصیات ہیں۔عربی اورفارسی ادب کے براہ راست مطالعے کی وجہ سے زبان وبیان کے وسائل پر انھیں غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔''

(ظفر احمد صدیقی، قصیدہ: اصل، ہیئت اورحدود (تاثرات، از: قاضی جمال حسین) ص 7، شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ 2020)

'شبلی شناسی' کے علاوہ ظفر احمد صدیقی کا خاص میدان کلاسیکی متون ہیں، جن کی درس وتدریس میں انھیں ایک خاص ملکہ حاصل تھا۔قصیدہ، مثنوی، مرثیہ اورکلاسیکی غزلیات کے علاوہ غالب اوراقبال کے اردواورفارسی کلام کے وہ شناور تھے۔دوران تدریس ان کی گفتگو کا انداز ساحرانہ ہوتا تھا۔ان کی گفتگو بہت ہی مربوط، منظّم، سلیس اوررواں ہوتی تھی۔اشعار کی باریکیوں اورشعری محاسن کو ظفر صاحب اس طرح بیان فرماتے تھے کہ طلبا کے ذہن پر نقش ہوجاتا تھا۔بعض ذہین طلبا کو آج بھی ان کے پڑھائے ہوئے اسباق حرف بہ حرف یاد ہیں۔ظفر احمد صدیقی علامہ اقبال کے اس مصرعے کا عملی نمونہ تھے۔ع:

'نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو'

ظفر احمد صدیقی عربی وفارسی تہذیب کے پروردہ اوراس کی تہذیب اورتصورات سے کما حقہ واقف تھے۔نیز اس کا عکس بھی ان کی تحریروں میں بڑی حد تک نمایاں ہے۔دوسری طرف استقامت اورریاضت ان کی سرشت میں شامل تھی۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جس موضوع پر قلم اٹھایا، اس کا حق ادا کردیا۔تحقیق وتنقید جیسے خارزار میدان میں بھی، ان کے قلم کی جولانی قابل دید ہے۔ان کا انداز بیان، مدلل، جامع اورعارفانہ ہے۔استدلالی اسلوب، سلاست اورروانی ان کی نثر کے خاص جوہر ہیں۔دقیق سے دقیق مسائل کو بھی وہ دلائل اورشگفتہ بیانی سے آسان فہم بنادیا کرتے تھے۔ان کی علمی وادبی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے شمس الرحمٰن فاروقی رقم طراز ہیں کہ:

''عربی فارسی پڑھ لینا آسان ہے، لیکن عربی فارسی تہذیب اورتصورات کو ذہن میں جذب کرلینا اوران کو اردو تنقید میں استعمال کرنا کہ اُنمل اوربے جوڑ نہ معلوم ہواوراس عظیم تسلسل کا احساس واضح ہوجو مشرقی ادبیات کا سرمایہ ہے۔یہ ہرایک کے بس کی بات نہیں...ظفر احمد صدیقی کی تحریریں عربی فارسی تہذیب سے پوری طرح بہرہ ور ہیں، لیکن انھوں نے ان علوم کو تنگ نظری کی کوٹھری میں نہیں، بلکہ تاریخی تسلسل کی خوش گوار روشنی میں حاصل کیا ہے۔اسی طرح ان کا طریقۂ کار بھی ادعائی نہیں، بلکہ تجزیاتی ہے۔''

ظفر احمد صدیقی، تنقیدی معروضات (سرنوشت، از: شمس الرحمٰن فاروقی) ص 4، اسرار کریمی پریس، الہ آباد، دسمبر 1983

سودا، نصرتی، ذوق، غالب، مومن، محسن کاکوروی کے قصائد ہوں یا غزلیات یا کوئی اوردوسری صنف/موضوع، ظفر احمد صدیقی ہمیشہ سنجیدہ اورعلمی انداز میں رواں گفتگو کرتے تھے۔نکتہ سنجی اورسخن فہمی میں وہ کامل تھے۔

ظفر احمد صدیقی کا ایک بڑا اور اہم علمی کارنامہ 'شرح دیوان اردوے غالب' از: سید علی حیدر نظم طباطبائی کی از سرِ نو ترتیب و تدوین ہے۔ یہ شرح پہلی مرتبہ مطبع مفید الاسلام، حیدر آباد سے سنہ 1900 میں شائع ہوئی تھی۔ نیز غالب کے پورے کلام/متداول دیوان کی مکمل شرح ہے۔

نظم طباطبائی عربی و فارسی کے متبحر عالم تھے۔ علم بیان و بدیع پر ان کی گرفت مضبوط تھی۔ مذہبی علوم میں بھی انھیں درک حاصل تھا۔ شعری روایت اور اشعار کی باریکیوں پر گہری نظر رکھتے تھے۔ غالب اور کلام غالب سے انھیں بڑی انسیت تھی۔ لہٰذا انھوں نے غالب کے متداول دیوان کی شرح لکھنے کا ارادہ کیا اور کامران رہے۔ اس میدان میں نظم طباطبائی کو کئی اعتبار سے اولیت حاصل ہے، جس کا تفصیل سے ظفر احمد صاحب نے اس کتاب کے مقدمہ میں ذکر کیا ہے۔

ظفر احمد صدیقی نے اس شرح کا بالاستیعاب مطالعہ کیا اور دوسرے شارحین کی شرحوں کو سامنے رکھتے ہوئے تسامحات کی نشان دہی کے علاوہ گراں قدر حواشی کا اضافہ کیا۔ طباطبائی کی اولیت، نکتہ سنجی اور سخن فہمی پر روشنی ڈالتے ہوئے ظفر احمد صدیقی لکھتے ہیں کہ:

''طباطبائی پہلے شخص ہیں، جنھوں نے غالب کے متداول دیوان کی مکمل شرح لکھی ہے۔ اس اولیت کے علاوہ کئی اور پہلوؤں کے لحاظ سے بھی یہ شرح اہمیت کی حامل ہے۔ ان میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس کے مصنف عربی و فارسی کے متبحر عالم اور ان دونوں زبانوں کی شعری روایت اور اصول نقد سے پوری طرح واقف تھے۔ اس کے ساتھ ہی نکتہ سنجی و سخن فہمی سے بھی انھیں بہرۂ وافر ملا تھا۔ اس لیے انھوں نے مشرقی شعریات کو ذہن میں رکھ کر یہ شرح تصنیف کی ہے۔ نیز مختلف اشعار کی شرح کے دوران سخن فہمی کے عمدہ نمونے پیش کیے ہیں۔ یہاں یہ وضاحت بے محل نہ ہوگی کہ مشرقی شعریات سے واقفیت اور اس کے اطلاق و انطباق میں وہ بسا اوقات حالی و شبلی سے آگے نکل گئے ہیں۔''

(ظفر احمد صدیقی (ترتیب و تدوین) شرح دیوان اردوے غالب، از: نظم طباطبائی، ص 33، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 2012)

پروفیسر خالد محمود صاحب کے الفاظ مستعار لیے جائیں تو کہا جا سکتا ہے کہ ظفر احمد صدیقی نے نظم طباطبائی کے جن امتیازات کا اوپر ذکر کیا ہے۔ وہ تمام بدرجۂ احسن موصوف کے اندر موجود تھیں، تو مبالغہ نہ ہوگا! یہی وجہ ہے کہ انھوں نے یہ بڑا کارنامہ انجام دیا اور 'شرح دیوان اردوے غالب'، از: نظم طباطبائی کی ترتیب و تدوین کا بیڑا اٹھایا۔

ظفر احمد صدیقی نے تقریباً پچاس صفحات پر مشتمل ایک طویل مقدمہ تحریر فرمایا ہے، جس میں اس شرح کی خوبیوں اور خامیوں پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ نظم طباطبائی کی ذہانت، علمیت، شعر فہمی، معنی شناسی اور شرح نگاری کے طریقۂ کار اور جہاں جہاں اختلاف کیا ہے، اس کی وجوہات اور اپنے نظریے کی وضاحت بھی مقدمہ میں کر دی ہے، تا کہ کسی طرح کا اشکال باقی نہ رہے۔

املا میں مرتب نے غالب کی ترجیحات کو مقدم رکھا ہے اور جدید روش املا/کتابت کی پیروی کی ہے۔ نیز املائے غالب کے بارے میں رشید حسن خاں کی تحریروں کو قابل اعتبار سمجھا ہے۔ 'شرح دیوان اردوے غالب' از: نظم طباطبائی کے پہلے ایڈیشن میں عبارتوں میں پیراگراف کا خیال نہیں رکھا گیا تھا۔ ظفر احمد صاحب نے عبارتوں کو مضمون کے اعتبار سے تقسیم کیا اور کئی کئی صفحات پر مشتمل عبارت کو بھی ٹکڑوں میں بانٹا، تا کہ جدید اصول و ضوابط کے مطابق عبارت کی ترتیب ہو جائے۔ اس حوالے سے ظفر احمد صدیقی لکھتے ہیں کہ:

''شرح طباطبائی میں اشعار کی طرح نثری اقتباسات بھی جا بہ جا نقل ہوئے ہیں، لیکن اس زمانے کے دستور کے مطابق پوری کتاب میں کہیں بھی جلد و صفحہ، فصل و باب یا موضوع کا حوالہ مذکور نہیں۔ اصول تدوین کے مطابق ان تمام اقتباسات کا اصل ماخذ میں سراغ لگا کر مکمل حوالہ درج کر دیا گیا ہے۔ اگر اقتباس اور اصل ماخذ میں تفصیل و اختصار یا کسی اور طرح کا فرق ہے تو اس کی نشان دہی کر دی گئی ہے۔

شرح طباطبائی میں مختلف مناسبتوں سے آیات قرآنی اور احادیث نبوی اور روایات سیرت و تاریخ کے اقتباسات بھی نقل ہوئے ہیں۔ ان سب کی باقاعدہ تخریج کر دی گئی ہے۔ بعض اقوال جو حدیث کے طور پر منقول ہیں، لیکن حدیث نہیں ہیں، ان کی حیثیت بھی متعین کر دی گئی ہے۔''

(ظفر احمد صدیقی (ترتیب و تدوین) شرح دیوان اردوے غالب، از: نظم طباطبائی، ص 64-65)

اشعار، اقتباسات، قرآنی آیات، احادیث اور سیر و تواریخ کے حوالوں کی تخریج، اصل ماخذ کی نشان دہی اور حواشی میں ان کی وضاحت جس باریکی سے ظفر احمد صدیقی نے کی ہے۔ یہ ان ہی کا حصہ تھا۔ نیز حسب ضرورت دیوان غالب کی دوسری مختلف شرحوں کو بھی سامنے رکھا، تا کہ تجزیہ و تقابل کے ذریعے درست نتائج برآمد ہو سکیں۔ ان کا یہ کارنامہ عظیم ہے۔

ظفر احمد صدیقی تقریباً چالیس برس تک درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ رہے ہیں، لیکن کبھی اس کی حرمت پر آنچ نہ آنے دی۔ اقبال، غالب وغیرہ کے علاوہ قصیدے کی تدریس سے انھیں خاص شغف تھا۔ ویسے 'قصیدہ: اصل، ہیئت اور حدود' کے عنوان سے ان کا ایک مضمون نیا دور، لکھنؤ (اگست 1979) میں شائع ہوا تھا۔ علمی اور ادبی حلقوں میں اس مضمون کی خاطر خواہ پذیرائی بھی ہوئی تھی۔ اس کے بعد ظفر احمد صاحب اس موضوع اور اس کے متعلقات پر مسلسل غور و فکر کرتے اور لکھتے رہے، جس کی شہادت ''قصیدہ: اصل، ہیئت اور حدود'' نامی کتاب ہے۔ یہ کتاب شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کی نگرانی میں 2020 میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کی عمدگی پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر قاضی جمال حسین لکھتے ہیں کہ:

''قصیدے کے موضوع پر ظفر احمد صدیقی کی پیش نظر کتاب زبان و بیان کی صحت کے ساتھ ہی معیاری تحقیق کی عمدہ کاوش بھی ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے قصیدہ کے بنیادی مآخذ سے بحث کی ہے اور اس صنف کی روایت کا عالمانہ اسلوب میں تحقیقی جائزہ لیا ہے۔ قصیدے کی صنفی خصوصیات......اردو کے منتخب قصائد کی تشریح و تعبیر نے کتاب کی افادیت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔''

(ظفر احمد صدیقی، قصیدہ: اصل، ہیئت اور حدود (تاثرات، از: قاضی جمال حسین) ص 7)

ظفر احمد صدیقی کی یہ کتاب اساتذہ اور طلبا کے لیے کئی اعتبار سے مفید ہے۔ انھوں نے نہ صرف قصیدے کی تعریف، تاریخ اور بنیادی مآخذ پر تحقیقی گفتگو کی ہے، بلکہ بعض منتخب قصائد کے متون کی تشریح و تعبیر بھی کی ہے۔ نیز بعض قصیدہ شناسوں کے علمی کارنامے کا بیان بھی اس کتاب میں موجود ہے۔ اشاعت ثانی میں سودا کے 'قصیدہ لامیہ' کی شرح کے اضافے کا ارادہ بھی رکھتے تھے، لیکن مرگ ناگہانی نے موقع نہ دیا۔ اردو قصائد سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب گراں قدر اور ظفر احمد صاحب کا آخری تحفہ ہے!

ظفر احمد صدیقی کی شخصیت معاصرین میں کئی اعتبار سے ممتاز ہے۔ وہ عالم بے بدل، متین و حلیم اور نفاست پسند تھے۔ تحقیق و تنقید کے دوران تغافل اور تساہلی کو ناقابل معافی جرم سمجھتے تھے۔ ان کے علمی و ادبی اکتسابات کے اعتراف کے لیے کئی کتابیں درکار ہیں۔ ان کا اس طرح اچانک رخصت ہو جانا، اردو زبان و ادب کا بڑا خسارہ ہے۔ فارسی و عربی ادبیات کے ایسے غواص اب خال ہی خال نظر آتے ہیں۔ ع: خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را!

■

Dr. Mohd Akhtar
Dept of Urdu, Vasanta College for Women, Rajghat
Varanasi - 221001 (UP)
Email.: akhtarvcr@gmail.com
Mob.: 9793857521

محمد اسلام خان

حنیف ترین

تیری یاد کی ہنستی رم جھم ہر سو گونجتی رہتی ہے

ڈاکٹر حنیف ترین سے میرے تعلقات دس برسوں پر محیط ہیں۔ان سے میری پہلی ملاقات غالباً 2010 میں اس وقت ہوئی تھی، جب وہ اپنے شعری مجموعہ 'لالہ صحرائی' کی اشاعت میں مصروف تھے۔ ان کے والہانہ انداز اور خلوص کی وجہ سے میں پہلی ملاقات میں ہی اُن کا گرویدہ ہوگیا۔ان کی شخصیت اور ان کے اخلاق و کردار کا عکس میرے دل و دماغ پر نقش ہوگیا۔ رفتہ رفتہ میرے تعلقات بڑھتے گئے اور اس طرح مجھے ان کی ذاتی زندگی کو بھی بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔اسی ربط خاص کی وجہ سے میں نے ان پر لکھے گئے مضامین کو یکجا کرنے کا ارادہ کیا، جو ابھی حال ہی میں 'تنقید بھی، تحسین بھی' کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ یہ کام ان کی زندگی میں شروع ہوا تھا اور زیادہ تر مواد موصوف کی زندگی میں ہی جمع بھی کر لیے گئے تھے کہ اسی دوران وہ علیل ہوکر کشمیر چلے گئے۔ ٹیلی فون پر ان سے باتیں ہوتی رہیں، خیر خیریت ملتی رہی۔ مگر ان کی ناگہانی وفات کے بعد بہ عجلت تمام کتاب کی اشاعت کو یقینی بنانے کی سعی کی گئی۔کاش یہ کتاب ان کی زندگی میں آجاتی تو انھیں بے انتہا مسرت ہوتی!

ڈاکٹر حنیف ترین مجھ سے بھائی کی طرح محبت کرتے تھے لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی ان کے مزاج کی گرمی اور میرے دماغ کی تندی جب یکجا ہوجاتی تو سماں ہی کچھ اور ہوتا۔ وہ ناراض ہوتے تو میں بھی بگڑ جاتا۔ کبھی کبھی تلخی اس قدر بڑھ جاتی کہ بیچ بچاؤ کے لیے ان کے بیٹے کو آنا پڑتا۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد جب ان کا غصہ زائل ہوتا تو وہ پھر پہلے ہی کی طرح شفقت سے پیش آتے اور محبت و اپنائیت کا اظہار کرتے، جو ان کے مزاج کا حصہ تھی۔ اب اس بات کو یاد کرتا ہوں تو مجھے اپنے اس عمل پر ندامت ہوتی ہے کہ ٹوٹ کر چاہنے والے ایک انسان پر میں اس قدر کیسے برہم ہوسکتا تھا! جب کہ ان کی خفگی میں بھی ایک اپنائیت ہوتی تھی اور میں غصے کی شدت کی وجہ سے ان کی محبت کی تپش کو محسوس نہیں کر پاتا تھا۔ اب جبکہ وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں تو ان کی محبت و شفقت کا مجھے شدید احساس ہوتا ہے۔ مجھ میں اور ڈاکٹر حنیف ترین میں مزاج کے اعتبار سے بڑی حد تک یکسانیت اور مماثلت تھی۔ وہ بھی لاگ لپٹ کے عادی نہیں تھے اور میں بھی دوٹوک انداز میں بات کرنا پسند کرتا ہوں۔ وہ بہت خوددار انسان تھے اور عزت نفس کو کوئی للکارے مجھے بھی قطعی برداشت نہیں۔ ایک بار ان کے کسی دوست نے مجھے فون کیا اور سخت لہجے میں بات کی، جواباً میں نے بھی ان کو سخت سست کہا۔ جب میری ملاقات ڈاکٹر حنیف ترین سے ہوئی تو وہ میرے اس عمل پر بجائے ناراض

ڈاکٹر حنیف ترین کو بہت قریب سے مجھے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ ان کے دل میں انسانیت کے لیے بہت جگہ تھی، وہ لوگوں کے درد پر تڑپ اٹھتے اور اس کے ازالے کی ہر ممکن کوشش کرتے۔ ان کی یہی دردمندی اور خلوص ان کی شاعری میں بھی ہے۔ ڈاکٹر حنیف ترین مجھے اپنے چھوٹے بھائی کی طرح عزیز رکھتے اور میری چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کا خیال رکھتے۔ ان کی محبتیں اور شفقتیں مجھے ہمیشہ حاصل رہیں۔اس لیے ان کی 'لوح تربت' پر محبت اور عقیدت کے پھول نچھاور کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔

ڈاکٹر حنیف ترین ایک سال سے زیادہ عرصے سے کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا تھے، مگر شعروسخن سے تعلق خاطر اور خوداعتادی کے سبب ایسا محسوس ہوتا کہ وہ اس کو مات دے دیں گے اور صحت یاب ہوکر جلدی ہی دہلی لوٹ آئیں گے۔ آپریشن کے بعد تبدیلِ آب و ہوا کی غرض سے وہ کشمیر چلے گئے تھے۔لیکن وہ وہاں بھی مجھے نہیں بھولے۔ مرض کی شدت کی وجہ سے بات چیت ضرور کم ہوگئی تھی لیکن جب بھی وہ آرام محسوس کرتے، فون کرتے اور مجھے یہ احساس دلاتے کہ وہ ٹھیک ہوجائیں گے ۔لیکن جب مرض شدت اختیار کر جاتا تو ان کی حالت دیدنی ہوتی۔مگر اس کے باوجود بھی وہ اپنوں کو نہیں بھولتے۔ ایک دن تو انھوں نے اسپتال سے ہی مجھے فون کیا لیکن شدید نقاہت کی وجہ سے صرف 'کیسے ہو' کہہ کر فون رکھ دیا۔ ان کی تکلیف کی شدت کو محسوس کر کے میرا دل ملول ہوگیا اور اس کیفیت سے نکلنے میں مجھے بہت وقت لگا۔

کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہونے کی وجہ سے مجھے ہمیشہ یہ خدشہ لاحق رہتا کہ ڈاکٹر حنیف ترین سے متعلق کوئی منحوس خبر نہ آجائے، مگر ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ 3 دسمبر کو بیماری نے ان پر جان لیوا حملہ کیا اور پھر اس کے بعد وہ جاں بر نہ ہو سکے۔ عینی شاہدین کے مطابق جسم سے جان کا رشتہ منقطع ہونے کے باوجود ان کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ رقصاں تھی اور ان کا پیکر خاکی خاموش تھا اور اس طرح سماجی انصاف اور فلاح و بہبود کے لیے ہمیشہ کوشاں رہنے والے ڈاکٹر حنیف ترین کی روح کو قرار آ گیا۔

3 دسمبر کو علی الصباح ان کے بیٹے یاسر خان نے ڈاکٹر حنیف ترین کی موت کی اطلاع دی تو اس روح فرسا خبر سے میری ذات میں ایک اندھیرا سا چھا گیا اور مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ میرا وجود منجمد ہوگیا ہے۔ میں اس کیفیت سے بہت دیر تک دوچار رہا۔ حنیف ترین کی شفقت سے محرومی اور جدائی کے احساس نے مجھے نڈھال کر دیا اور دل میں بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ کاش کوئی اس منحوس خبر کی تردید کردے۔ میر تقی میر کا یہ شعر اس کیفیت کا صحیح ترجمان معلوم ہوتا ہے۔

قافلہ قافلہ جاتے ہیں چلے کیا کیا لوگ
میر غفلت زدہ حیران سے کیا بیٹھے ہیں

دہلی جیسے بھاگم بھاگ اور مصروف ترین شہر میں حنیف ترین کی شخصیت میرے لیے ایک شجر سایہ دار کی حیثیت رکھتی تھی، لیکن موت نے میرے سر سے ان کا سایہ چھین لیا۔ مفاد پرستی اور حرص و ہوس کے اس ماحول میں ڈاکٹر حنیف ترین جیسی بے غرض اور بے لوث شخصیت کا ملنا بہت مشکل ہے۔ ڈاکٹر حنیف ترین کی موت سے حلقہ احباب میں ایک خاموشی ہے۔ مگر جب حالات بدلیں گے اور محفلیں دوبارہ آراستہ ہوں گی، کیا ڈاکٹر حنیف ترین کی وہ کھنک دار شعری آواز ہمیں سننے کو ملے گی!

ہونے کے، خوشی کا اظہار کیا اور مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ 'مجھے ایسا ہی آدمی پسند ہے، تم نے ٹھیک کیا۔ ان کی ہمت کیسے ہوئی تمھیں سخت سست کہنے کی۔'

ڈاکٹر حنیف ترین کا مجھ سے بے حد لگاؤ تھا مگر یہ معاملہ کوئی میرے ساتھ ہی خاص نہیں تھا، وہ ٹوٹ کر چاہنے والے اور محبت کرنے والے انسان تھے، جس سے بھی ان کی رسم و راہ ہو جاتی، اس کے لیے وہ دل نکال کر رکھ دیتے۔ بغض و کینہ ان کی شخصیت سے کوسوں دور تھے۔ اگر وقتی طور پر وہ کسی سے ناراض بھی ہو جاتے تو بہت جلد اس کو بھلا کر دوست بھی بن جاتے۔ میری اس بات کی تائید ان سے قریب رہنے والے لوگ کریں گے۔

حنیف ترین ایک علمی و ادبی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں۔ شروع سے ہی ادب کی طرف ان کا میلان تھا اور اسی وجہ سے غیر ادبی اور غیر تخلیقی شعبے سے وابستگی کے باوجود ادب سے ان کا بہت گہرا اور مضبوط رشتہ رہا، اس رشتے میں کسی طرح کی منفعت اور نہ ہی کسی طرح کا مفاد ان کے پیش نظر تھا۔ وہ اپنے مصروف ترین پیشے سے وابستہ ہوتے ہوئے بھی شعر و ادب کے لیے خاصا وقت نکال لیتے تھے بلکہ یوں کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ اکثر اپنے تخلیقی عمل میں اپنے پروفیشن تک کو بھی فراموش کر جاتے تھے۔ انہوں نے اپنے پیشے کی وجہ سے بہت سے ملکوں کا سفر بھی کیا اور بہت سے علاقوں سے ان کا ذہنی اور جذباتی رشتہ رہا اور ان علاقوں کی تہذیب و ثقافت، زبان و ادب سے بھی ان کی آشنائی رہی۔ وہاں کے شب و روز میں وہ شامل رہے۔ مختلف علاقوں کے لوگوں کے جذبات و احساسات کو انھوں نے قریب سے محسوس کیا۔ اس طرح وہ زندگی کے مختلف تجربات و مشاہدات سے گزرے اور یہی تجربات و مشاہدات ان کی شاعری کی اساس بنے۔

حنیف ترین نے نظمیہ اور غزلیہ دونوں طرح کی شاعری کی ہے اور دونوں میں دور جدید کے مسائل اور متعلقات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور اس میں انہوں نے اپنے قاری کو مکمل ذہنی اور جذباتی طور پر شریک کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔

حنیف ترین کی بیشتر نظمیں احتجاج کے ساتھ انسان دوستی کی بہترین مثال ہیں، کیونکہ بنیادی طور پر وہ امن پسند اور انسانیت پرست ہیں، اسی لیے انسانیت کے خلاف جہاں بھی بربریت کا ننگا ناچ ہوتا ہے، ان کی شعری زبان خاموش نہیں رہتی بلکہ بلند آواز میں احتجاج کرنے لگتی ہے۔

حنیف ترین نے غزلیں بھی کہی ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام 'رباب صحرا' غزلوں پر ہی مشتمل تھا اور اس میں انہوں نے غزلیہ شاعری کے عمدہ نمونے پیش کیے ہیں مگر وہ صرف روایتی غزلیہ شاعری میں ہی محصور نہیں رہے بلکہ انھوں نے 'کشت غزل نما' کے ذریعے 'غزل نما' کا بھی تجربہ کیا۔ یہاں بھی انھوں نے اپنی جدت طبع کے جوہر دکھائے ہیں۔

حنیف ترین نے صحرائے عرب کی تمازتوں میں بھی اپنی زندگی کے شب و روز گزارے ہیں اور ان تمازتوں نے ان کے جذبات میں شدت پیدا کی ہے اور ان کے ایمانی جذبے کو بھی متحرک اور رواں کیا ہے۔ اسی لیے ان کی شاعری میں اسلامی تلمیحات اور عربی استعارات کثرت سے ملتے ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ 'میں نے زلزال کو لفظوں میں اُتر کر دیکھا' اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔

ڈاکٹر حنیف ترین نے جس عہد اور ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں وہ یقیناً ادبی ماحول تھا اور انھیں بچپن ہی سے ادب سے لگاؤ تھا۔ ان کے حلقہ احباب میں زیادہ تر ادب نواز تھے اور ان کے خانوادے میں بھی علم و ادب سے جڑی ہوئی اہم شخصیات تھیں۔ یہ تمام عوامل شعر و ادب سے لگاؤ اور تخلیقی عمل کا محرک بنے۔

ڈاکٹر حنیف ترین کی پیدائش اتر پردیش کے مردم خیز خطہ سنبھل میں ہوئی۔ ان کی بنیادی تعلیم جماعت اسلامی ہند کے معروف ادارہ 'درس گاہ اسلامی، رام پور' سے ہوئی۔ پھر علی گڑھ منٹو سرکل اسکول سے انھوں نے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور پھر مزید اعلیٰ تعلیم کے لیے انھوں نے کشمیر کا رخ کیا اور یہاں سے میڈیکل کی اعلیٰ ترین ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد علی گڑھ سے ایم ڈی کیا۔ 1983 میں ملازمت کے لیے سعودی عرب چلے گئے اور تقریباً تین دہائی کے بعد وہیں کے شمال سرحدی علاقہ 'عرعر' کے 'پرائمری ہیلتھ کیئر' میں بطور ڈائریکٹر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔

ڈاکٹر حنیف ترین کے ادبی سفر کی کہانی بہت دلچسپ ہے۔ وہ کشمیر میں اپنے زمانۂ طالب علمی میں ہی 'آل انڈیا ریڈیو' کے پروگراموں میں شرکت کرنے لگے تھے۔ اپنے کلام سے وہ سامعین کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں نہ صرف کامیاب ہوئے بلکہ ان سے داد و تحسین بھی حاصل کی۔ سامعین کے پیار نے انھیں حوصلہ بخشا اور پھر باقاعدہ شاعری کی طرف متوجہ ہو گئے۔ سعودی عرب کے قیام کے دوران پاکستان کے معیاری اور مؤقر رسائل و جرائد میں ان کی تخلیقات اہتمام کے ساتھ شائع ہونے لگیں، جس کی وجہ سے بہت سے لوگ ان کو پاکستانی سمجھتے رہے لیکن ان کی تخلیقات کی اشاعت کا سلسلہ صرف پاکستان اور ہندوستان نہیں بلکہ پوری دنیا کے اردو رسائل و جرائد میں جاری رہا اور کثرت اشاعت اور کلام کی خوبی نے ایک بڑے حلقے کو ان کا گرویدہ بنا دیا۔

حنیف ترین اردو زبان کے شیدائی تھے۔ اردو کی ترقی و ترویج کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہے۔ سعودی میں قیام کے دوران وہ ہفتہ وار اور ماہانہ نشستوں کا اہتمام کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے 'عرعر' میں اردو کی کوچنگ بھی شروع کر رکھی تھی، جس کے لیے وہ اپنے ذاتی اخراجات پر اردو کتابوں اور اسٹیشنری کا انتظام کرتے اور اردو سے نابلد لوگوں کو اردو زبان سکھانے اور پڑھانے کے لیے استاد مقرر کر رکھے تھے اور انھیں معقول اعزازیہ بھی دیتے رہے۔ سعودی عرب سے ہندوستان منتقل ہونے کے بعد بھی اردو سے محبت کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ انھوں نے دہلی میں اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے بہت سی محفلیں اور مشاعرے منعقد کیے۔

حنیف ترین نے کئی تصنیفات بطور یادگار چھوڑی ہیں جن میں رباب صحرا (1992)، کتاب صحرا (1995)، کشت غزل نما (1999)، زمین لاپتہ رہی (2001)، ابابیلیں نہیں آئیں (2004)، میں نے زلزال کو لفظوں میں اُتر کر دیکھا (2006)، روئے شمیم سے نزہت عشق کی بہتی ہے (2011)، لالۂ صحرائی (2014)، پس منظر میں منظر بھیگا کرتے ہیں (2016)، دلت کویتا جاگ اٹھی (2018)، ستیہ میو جیتے (2018)، دلت آکروش (2019)، بعید عن الوطن (2012)، لم تنزل ابابیل (2013)، دی ٹرتھ آف ٹیررزم (2006) کافی اہم ہیں۔ اس کے علاوہ کئی کتابیں طباعت کے مرحلے میں ہیں۔

ڈاکٹر حنیف ترین کو میں نے اوروں سے بہت مختلف اور منفرد پایا۔ جب ہم حنیف ترین کی تحریروں کو ان کی شخصیت سے جوڑ کر دیکھتے ہیں تو ان میں کوئی تضاد نظر نہیں آتا، حالانکہ زیادہ تر ادیبوں کی زندگیاں تضادات کا مجموعہ ہوتی ہیں۔ مگر ڈاکٹر حنیف ترین کی شخصیت اس تضاد سے پاک ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ حنیف ترین کے تخلیقی اور شعری محاسن اپنی جگہ، وہ انسان دوستی، انصاف پسندی اور کردار کی بلندی کے لیے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

جانے والے کبھی نہیں آتے
جانے والوں کی یاد آتی ہے

■

Mohd Islam Khan
D-64, 3rd Floor, Near Firdaus Masjid,
Behid Taj ApartmentShaheen Bagh,
Jamia Nagar, New Delhi - 110025
Mohb.: 9910100445, islamk22@gmail.com

محمد سمیع الدین

بیجاپور کا شعر و ادب آزادی کے بعد

بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد دکن میں خود مختار پانچ حکومتیں قائم ہوئیں۔ چنانچہ بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت کے بانی یوسف عادل شاہ نے 1490 میں اپنی خودمختاری کا اعلان کردیا۔ یوسف عادل شاہ کا تعلق سلاطین عثمانیہ سے تھا اور وہ علما اور اہل فن کا بڑا قدرداں تھا وہ شعر و شاعری کا ذوق بچپن سے رکھتا تھا اور خود بھی شاعری میں کمال دکھایا۔ جب خود بادشاہ بنا تو شاعری کی آبیاری کے لیے عرب روم اور دور دراز کے مقامات سے اہل ہنر اور ذی علم حضرات کو بلاکران کی قدرافزائی کی۔

عادل شاہی سلطنت کے بانی یوسف عادل شاہ سے لے کر ابراہیم عادل شاہ، علی عادل شاہ، ابراہیم عادل شاہ ثانی، سلطان محمد عادل شاہ، علی عادل شاہ ثانی، شاہی سب کے سب شعر و ادب کے بے حد قدرداں تھے جس کی وجہ سے عادل شاہی سلطنت کا پایۂ تخت بیجاپور علم و ادب کا گہوارہ و مرکز بن گیا تھا۔ اسی وجہ سے عادل شاہی خاندان کو دکن کی سماجی اور ادبی تاریخ میں ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ دکنی زبان و ادب کی ترویج و ترقی میں فنِ تعمیر، موسیقی اور مشترکہ تہذیب کی نشو و نما میں اس خاندان نے نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ عادل شاہیوں نے تقریباً دو سو سال بیجاپور کی سرزمین پر حکومت کی اور سبھی سلاطین نے شعر و ادب کی سرپرستی فرمائی اور وہ خود بھی صاحب علم اور بڑے صاحب ذوق تھے۔ بیشتر سلاطین خود شاعر تھے اور موسیقی سے کافی شغف رکھتے تھے۔ انھوں نے شعرا و علما ادبا کی ایسی سرپرستی کی کہ عراق، عجم تک ان کی تحسین و تعریف کے چرچے ہونے لگے۔ ان ہی کی بدولت نہ صرف ادب پروان چڑھا بلکہ شاعری میں کمال رکھنے والے شعرا کو اپنے دربار سے وابستہ کرلیا کیونکہ یہ لوگ شاعری کی اہمیت وافادیت سے اچھی طرح واقف تھے۔

خصوصی طور پر ابراہیم عادل شاہ کو کئی لحاظ سے عادل شاہی حکمرانوں میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ وہ بیجاپور کا پہلا حکمران ہے جس نے دکنی زبان کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا جس کی وجہ سے دکنی زبان کو غیر معمولی ترقی عطا ہوئی اور ابراہیم عادل شاہ ثانی کو جگت گرو کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جس نے اپنے عہد حکومت میں علم و ادب کی ترقی کے لیے کوئی کسر نہ چھوڑی یہ وہی دور ہے جب قطب شاہی سلطنت پر محمد قلی قطب شاہ اور مغلیہ سلطنت پر اکبر اعظم حکمران تھے۔ اور سارے ملک میں علم و ادب کے کافی چرچے تھے۔ ابراہیم عادل شاہ نے فن موسیقی پر کتاب 'نورس' لکھ کر علم موسیقی کی خصوصیت کو اجاگر کرنے کی بہترین کوشش کی ہے۔ بیجاپور میں اس وقت دکنی کی ترقی و ترویج میں صوفیا کی سرپرستی نے اہم رول ادا کیا اس کے علاوہ اس عہد کے ابتدائی درمیانی اور آخری دور کے شعرا و ادبا نے قابل قدر خدمات انجام دیں ہیں جن میں میراں جی شمس العشاق، شاہ برہان الدین جانم، ابراہیم عادل شاہ ثانی، عبدل، مقیمی، صنعتی، ملک خوشنود، رستمی، حسن شوقی، سلطان علی عادل شاہ ثانی شاہی، ملا نصرتی، امین الدین اعلیٰ، شاہ معظم، مرزا، ہاشمی بیجاپوری، بحری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ شعر و ادب کی آبیاری کے لیے خدمت کرنے والی حکومت عادل شاہی کا آغاز 1490 سے ہوتا ہے۔ سلطنت عادل شاہی میں جملہ نو بادشاہ تخت و تاج کے مالک بنے جنھوں نے دل کھول کر ادب کی سرپرستی کی اور بالآخر 1686 میں اورنگ زیب نے بیجاپور کو فتح کیا اس کے بعد عادل شاہی حکومت کا خاتمہ ہوا لیکن اس کے باوجود شعر و ادب کی ترقی میں رکاوٹیں پیدا نہیں ہوئیں۔ آج بھی ادبی لحاظ سے بیجاپور کی سرزمین زرخیز ہے۔ بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت اُردو زبان و ادب کی ترقی، اصلاح معاشرت، احیاء علوم وفنون کی سرپرستی و معارف کے لحاظ سے عادل شاہی حکمرانوں کا دور دکن میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ آج ان ہی کی بدولت آزادی کے بعد بھی متعدد انشاپرداز اُردو زبان و ادب کی خدمت پر مامور ہیں اور اپنے خونِ جگر سے اُردو شعر و ادب کو پروان چڑھا رہے ہیں۔ ظاہری بات ہے کہ شہر بیجاپور علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے اور اس عادل شاہی

روایت کی پاسداری کرتے ہوئے بیجاپور کی عوام آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد بھی اُردو کی ترقی و ترویج کے لیے ہمہ وقت کوشاں ہیں یہ اور بات ہے کہ آزادی کے بعد یہاں بہت کم قلمکاروں نے قومی و عالمی سطح پر شناخت بنائی ہے۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد جن شعرا و ادبا نے اپنے قلم کے جوہر دکھائے ان کا اختصار کے ساتھ ذکر کر رہا ہوں۔

سید برہان الدین عرف اقبال ہاشمی ولد سید مصطفےٰ حسینی بیجاپور کی عظیم ہستی ہیں جنھوں نے نظم و نثر میں اپنی فکر کو بیان کیا۔ اقبال ہاشمی کو طالب علمی کے زمانے سے ہی شاعری کا ذوق رہا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ ایک بہترین شاعر و ادیب ثابت ہوئے۔

اقبال ہاشمی معروف استاد ہونے کے علاوہ معروف شاعر بھی ہیں جو اقبال تخلص اختیار کرتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں فکری عنصر پایا جاتا ہے ان کی غزلوں کے چند شعر۔

سوچ رہا ہوں شہر میں اپنے باقی ہیں کیا اچھے لوگ
راہ سے گزرو، بزم میں بیٹھو ملتے ہیں سب میلے لوگ
حرص چھپی ہے آنکھوں میں تو زہر ملا ہے باتوں میں
یاد ہے تم کو کتنے اچھے پیارے تھے وہ اگلے لوگ

بیجاپور کے ایک اہم شاعر خلش رفاعی ہیں جن کا پورا نام عبدالکریم ابن محمد عثمان ہے۔ اور سلسلۂ رفاعیہ سے وابستہ ہیں۔ شعر گوئی کا شوق اس قدر تھا کہ آپ کئی مشاعروں کے انعقاد میں سرگرم رہے۔ یہاں تک کہ آپ انجمن ترقی اردو ہند شاخ بیجاپور کے 15 سال تک سکریٹری رہے۔ ان کا ایک مجموعہ کلام 'گلدستۂ خلش' کے نام سے 1975 میں شائع ہوا ہے۔

خلش رفاعی کے کلام میں مذہبی رنگ زیادہ پایا جاتا ہے اور ان کی غزلیں ان کے لب و لہجے کی نشاندہی کرتی

ہیں۔ ان کی غزل کے چند اشعار دیکھیے جس سے ان کے شعری مزاج کا اندازہ ہوتا ہے۔

سفینہ نذرِ طوفان تھا مرا اور دور ساحل تھا
مصائب جھیلنے کے واسطے تنہا مرا دل تھا
خلش کب ساتھ دیتا ہر کوئی دردِ محبت میں
ازل سے جو ابد تک کام آیا وہ میرا دل تھا

زیتون بی ضیا شہر بیجاپور سے 30 کلومیٹر دور ایک چھوٹے سے گاؤں شیوگی میں 1926 میں پیدا ہوئیں آپ کی ابتدائی تعلیم گورنمنٹ پرائمری اسکول نمبر 1 میں ہوئی، یہ وہ دور تھا کہ لڑکیوں کو پڑھانا معیوب سمجھا جاتا تھا لیکن ان کے متعلقین نے فراخدلی کا ثبوت پیش کیا اور یہ بتانے کی کوشش کی کہ لڑکیوں کی تعلیم کتنی اہم ہے لہٰذا زیتون بی نے اپنی قابلیت و لیاقت کا ثبوت پیش کر کے آنے والی نسل کے لیے ایک زندہ مثال قائم کی۔ زیتون بی ضیا رفاعی بہترین افسانہ نگار و شاعرہ گزری ہیں اور روزنامہ انقلاب میں ان کے افسانے اکثر شائع ہوتے تھے۔ ان کے کلام میں صنعتوں کا استعمال بھی جابجا استعمال ہوا ہے ان کے کلام کے چند اشعار دیکھیے۔

حسن کی فطرت اگر مغرور ہے
عشق کو ہر امتحان منظور ہے
ہم ہیں پھر جلوہ گاہ طور ہے
دیکھیے اب ان کو کیا منظور ہے

تاج عادل بیجاپور کے کہنہ مشق شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔

آپ ادب کے نئے رجحانات کو قبول کرتے ہوئے نئی جہتوں سے روشناس کرانے میں کوشاں ہیں۔ ان کے شعروں میں انفرادی احساسات و تاثرات کا اظہار بڑی خوبی سے ہوا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

چھو کے دیکھا تو وہ پتھر کا تراشا نکلا
مجھ کو اک شخص پہ انساں کا گماں تھا کتنا
احساس ہے نہ درد نہ جذبہ نہ کوئی غم
کچھ لوگ تیرے شہر میں پتھر لگے مجھے

نثار شیر کوٹی آزادی کے بعد ابھرنے والے اہم شاعر ہیں۔ شاعری کا ذوق اتنا تھا کہ آپ کم عمری سے شعر کہنے لگے حالانکہ وہ زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھے مگر اللہ تعالی نے انھیں خداداد صلاحیت سے سرفراز کیا تھا۔ بیجاپور کے تقریباً شعرا نے ان سے اپنی شاعری کی اصلاح لی حالانکہ ان کی زندگی مصائب و آلام و عسرت میں گذاری مگر وہ اپنے چہرے پر ایک شکن تک ظاہر ہونے نہیں دیا۔ اشعار دیکھیے۔

رگِ احساس گرما کر عزائم دل میں پیدا کر
بدل دے رخ ہواؤں کے اگر کوئی بلا اٹھے

یاد آتی ہے جب نثار ان کی
دل میں اک اضطراب ہوتا ہے

جاوید رفاعی ولد عبد الکریم خلش رفاعی نے کرناٹک یونیورسٹی دھارواڑ سے ایم اے اُردو کی ڈگری حاصل کی اور بعد میں آپ نے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری شیواجی یونیورسٹی کولہاپور سے حاصل کی آپ کی پی ایچ ڈی کا تحقیقی موضوع 'دکن میں اُردو مثنوی کا ارتقا' تھا۔ ان کی تخلیقات ماہنامہ شاعر، بیسویں صدی، کہکشاں، روزنامہ سالار، برگ آوارہ، روزنامہ انقلاب، اور ہندوستان میں شائع ہوتی رہیں۔ ان کا نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

کبھی خوشی تو کبھی غم کا راج کیسا ہے
تیرے مزاج کا یہ امتزاج کیسا ہے
یہاں تو اہلِ وفا کے لیے ہیں دار و رسن
تمھارے شہر کا یارو رواج کیسا ہے

ڈاکٹر بیگم رضیہ سلطانہ کو ادبی ذوق ورثہ میں ملا ان کے بھائی ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی و ریاض فاروقی جنھوں نے ادب میں اپنی منفرد پہچان بنائی۔ ڈاکٹر بیگم رضیہ سلطانہ نے تعلیم کے زینے طے کرتے ہوئے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ آپ نے نہ صرف ادب کو پروان چڑھانے کی کوشش کی بلکہ امور خانہ داری میں بھی برابر شریک رہیں۔ آپ کی ایک کتاب بعنوان 'اردو ناول سماجی پس منظر میں ایک تنقیدی مطالعہ' 2018 میں شائع ہوئی ہے۔

سلیمان خمار کا شمار نہ صرف ہندوستان بلکہ برصغیر کے مشہور و معروف شعرا میں ہوتا ہے۔ موصوف نے شعبۂ تعلیمات میں Administrative Service کی اور وہیں سے وظیفہ حسن خدمت سے سبکدوش ہوئے۔

سلیمان خمار کی جملہ دو کتابیں منظر عام پر آئی ہیں۔ (1) تیسرا سفر (غزلیں نظمیں) 1981 (2) سمندر جاگتا ہے (غزلیں نظمیں) 2009 اس کے علاوہ دو کتابیں (1) پیکر نور (حمد و نعت) (2) دشتِ جنوں (غزلیں نظمیں) اشاعت کے مراحل میں ہیں۔ سلیمان خمار بیجاپور کے اساتذۂ سخن میں شمار کیے جاتے ہیں۔ شعر گوئی کے تحت جو انھوں نے شہرت حاصل کی ہے شاید ہی بیجاپور کے کسی شاعر کو نصیب ہوئی ہو۔ ان کی شاعری میں شگفتگی ندرت، وطن کی محبت، مناظر فطرت، قلبی واردات و احساسات ان کی خصوصیاتِ شاعری ہیں اور اس کے علاوہ جذبۂ عقیدت سے سرشار ہو کر منقبت و نعت گوئی میں بھی اپنے فنی کمالات کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔

غزلوں کے منتخب اشعار ملاحظہ ہوں جس سے ان کی فکر کی گہرائی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

خمار شہر میں کس کو سناؤں تازہ غزل
نظر تو آئے کوئی صاحب نظر کی طرح
لطف دنیا نظر کا دھوکہ ہے
اس کھلونے سے میں بہلتا نہیں

1964 میں کمال دکنی کا تقرر محکمہ پولیس میں بحیثیت کانسٹیبل ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے کرناٹک یونیورسٹی دھارواڑ سے بی اے کیا اور ایم اے اُردو میں بھی داخلہ لیا مگر سال اول میں تو کامیابی حاصل کی مگر محکمہ پولیس کی مصروفیت کی بنا پر ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے سے قاصر رہے۔

کمال دکنی نے نظم 'اُردو زبان' میں اُردو کے متعلق کیا کہتے ہیں دیکھیے۔

اُردو زبان تو کتی پیاری ہے
تو غریب کے گھر کی نہاری ہے
تو جان بھی سو بھیج ہماری ہے
تجھ پو قربان دنیا ساری ہے
اے اردو زبان تو کتی پیاری ہے

کمال دکنی نے دکنی شاعری میں وہ کمال دکھایا کہ دورِ جدید میں دکنی زبان کو یقیناً وسعت بخشی۔ عنقریب ان کا دکنی شعری مجموعہ 'گوکھرو کے کانٹے' کے نام سے منظر عام پر آنے والا ہے۔

محمود قاضی عزم اپنے کلام کی اصلاح نثار شیر کوٹی سے لیا کرتے تھے۔ ان کی غزل کے دو شعر دیکھیے جس سے ان کی غزل کے فن کا اندازہ ہوگا۔

تڑپتا رہ گیا رہزن کو دیکھ کر وہ فقیر
کسی امیر نے لوٹی ہیں جھولیاں یارو
ہماری عزم مصمم کسی کو کیا معلوم
جلدا دیں ہم نے کنارے پہ کشتیاں یارو

عارف احمد کی ادبی زندگی کا آغاز 1982 سے ہوتا ہے اور اس وقت وہ افسانے لکھ رہے تھے۔ احمد عارف نہ صرف نثر میں بلکہ شاعری میں بھی یکساں عبور رکھتے ہیں۔ ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ 'ہوا سے کہو' 2015 میں شائع ہوا جو ادبی دنیا میں کافی مقبول ہوا۔ احمد عارف نے اس شعری مجموعے میں موجودہ دور کی بہترین نمائندگی کی ہے۔ دیکھیے ان کی ایک نظم 'دعائے خیر'

ہم/غریبوں کو/اتنی بھی/دولت/نہ دے/خدا
کہ مصرف/اس کا/مشکل ہو جائے

ان کا ایک افسانوی مجموعہ 'ایک کمرے والا مکان' 2018 میں شائع ہوا ہے۔ جس میں 2005 سے 2017 کے درمیان لکھے گئے افسانے ہیں۔ ان میں اکثر افسانے جنس پر لکھے گئے ہیں۔

سید حفیظ اللہ کا دینی مزاج اور شاعرانہ طبیعت ان کی شخصیت کے نمایاں پہلو ہیں۔ ان کا کلام پڑھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے صرف اور صرف قرآن وحدیث کی روشنی میں اپنے کلام کو تخلیق کیا ہے۔

غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

خدمت خلق کے جذبے سے ہوا دل معدوم
آدمی خود کا پرستار نہیں تھا کہ جو ہے
چاہے جیسے بھی ہو دنیا میں ترقی کر لو
کامیابی کا یہ معیار نہیں تھا کہ جو ہے

بشیر احمد ناگٹھان درس وتدریس کے میدان میں کامیاب معلم ثابت ہوئے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور خاص کر اقبالیات پر ان کی گہری گرفت تھی۔ موصوف ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ اکتالیس سال پیشہ تدریس سے وابستہ رہے اور 1989 میں وظیفہ یاب ہوئے۔ ان کے مضامین مختلف اخبارات میں شائع ہو کر قارئین ادب کے لیے کارآمد ثابت ہوئے ادبی دنیا کا بہترین مضمون نگار بشیر احمد ناگٹھان 26 اگست 2015 کو ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے۔

اقبال آصف کو ادبی ماحول ورثے میں ملا جس کی وجہ سے ان کا رجحان شعر وادب کی طرف مائل ہوا۔ آج وہ بڑے سلیقے کے ساتھ شعر کہتے ہیں۔ ان کے کلام میں موضوع وخیالات، منظر نگاری، تشبیہات واستعارات کا عمدہ استعمال ان کی شاعری کو انفرادی حیثیت دیتا ہے۔ عصری میلانات، نئی تازگی، والہانہ پن، سلاست وروانی الفاظ کا دروبست اسلوب کی تازہ کاری وغیرہ ان کی شاعری کا خاص وصف ہے۔ دیکھیے ان کے غزلوں کے چند اشعار

زوال فکر وفن تھا اور میں تھا
عجب کہتے سخن تھا اور میں تھا
عجب روداد تھی میرے سفر کی
لباس بے شکن تھا اور میں تھا

عشرت جہاں زیب نے نہ صرف شاعری میں بلکہ اردو نثر میں بھی اپنے تخلیقی جوہر دکھائے ہیں۔ ان کی شخصیت خواتین کے لیے ایک مثال ہے۔ کیونکہ خواتین بھی معاشرہ کے لیے فعال ومتحرک ثابت ہوئی ہیں۔ وہ سماج کی اصلاح چاہتی ہیں اور وہ چاہتی ہیں کہ خواتین بھی مرد کے شانہ بہ شانہ چلیں لیکن مذہبی ودینی حدود میں رہ کر اپنی خدمات انجام دیں۔ ان کا یہ شعر دعوت فکر دیتا ہے۔

علم و ہنر کی شمع جلاؤ تو بات ہے
تاریکیوں کے نقش مٹاؤ تو بات ہے

موصوفہ کے مضامین، نظمیں، غزلیں اکثر روزنامہ سالار بنگلور ہفت روزہ سالار بنگلور وغیرہ میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ عنقریب ان کا شعری مجموعہ بعنوان 'کلام زیب' شائع ہونے والا ہے۔

ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی بیجاپور کے معروف تعلیمی ادارہ انجمن آرٹس سائنس وکامرس کالج بیجاپور میں صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے طویل عرصہ تک خدمات انجام دیں۔ اس کے علاوہ کرناٹک یونیورسٹی دھارواڑ میں شعبہ اردو و فارسی کے پی ایچ ڈی گائیڈ کے فرائض انجام دیے۔ تقریباً بیس سال قبل ریاست ہائے متحدہ امریکہ منتقل ہوئے اور نیویارک کو اپنا وطن ثانی بنالیا۔

موصوف نے اپنے نوک قلم سے تقریباً گیارہ کتابیں تحریر کی ہیں۔ (1) اردو شاعری اور تصوف (2) امریکہ میں گلزار اردو ادب (3) امریکہ میں انوار اردو (4) اعجاز (5) مضامین فاروقی (6) گوہر ادب (7) اور خون جلتا رہا (8) مامون ایمن فن اور شخصیت (9) کینیڈا (Canada) متحدہ ریاست امریکہ (USA) میں خواتین کی اردو خدمات (10) عالمی اردو ادب میں رشیدہ عیاں کی شاعرانہ عظمت (11) مینار ادب، آج ان کی کتابیں اردو دنیا میں خاصا اہمیت رکھتی ہیں۔

رؤف خوشتر کا شمار برصغیر کے مشہور ومعروف طنز ومزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ عہد جدید میں اردو نثر میں رؤف خوشتر بہت جلد اردو کے ادبی افق پر چھاگئے۔ ان کی تحریریں طنز ومزاح کے نہایت اعلیٰ اور قابل قدر امتزاج میں ڈوبی ہوئی ہیں ان کے یہاں نکھرا ہوا ذوقِ مزاح ہے اور اسلوب سے ناممکن کو ممکن بنانے پر قدرت

رکھتے ہیں۔ رؤف خوشتر طنز ومزاح کے فن سے پوری طرح واقف تھے۔ جس کی وجہ سے ایسے مرقع پیش کرتے ہیں جیسے سب کچھ ہماری آنکھوں کے سامنے ہورہا ہو۔ وہ پورے مضمون میں قاری کو مسکرانے پر مجبور کردیتے ہیں اور جب اس نثر کی گہرائی میں قاری ڈوب جاتا ہے تو وہ رونے پر بھی مجبور ہوجاتا ہے۔ ان کی تحریروں سے قاری محظوظ ہوئے بغیر رہ نہیں سکتا۔ رؤف خوشتر کی جملہ چار کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ (1) غبار حاضر 1982 (2) آنکھ بیتی 2009 (3) صرف درباں 2011 اور 'رنگ تحریر' 2019۔

یہ اردو ادب کا ممتاز مزاح نگار 8 ستمبر 2018 کو اپنے مالک حقیقی سے جاملا لیکن ان کی تخلیقات رہتی دنیا تک ان کو زندہ وقائم ودائم رکھیں گی۔

ڈاکٹر ریاض فاروقی نہ صرف بیجاپور بلکہ پورے ہندوستان میں ماہر تعلیم وسماجی کارکن کی حیثیت سے مقبول ہیں۔ آپ ایک دھڑکتا ہوا دل رکھتے ہیں اور عصری حالات سے بخوبی واقف ہیں جس کا اظہار ان کے مضامین میں پایا جاتا ہے۔

ڈاکٹر سید منظور احمد پورے فنی لوازمات کے ساتھ غزلیں اور نعتیہ کلام پیش کرنے میں بڑی قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی غزل کے دو شعر ملاحظہ ہو جس سے ان کی فنکارانہ صلاحیت کا اندازہ ہوگا۔

زندگانی سنوار لی میں نے
ان کے صدقے اتارلی میں نے
یاد جب بھی وہ آگئے منظور
بے خودی میں گذارلی میں نے

ان کے کلام سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ نہایت زود گو اور قادرالکلام شاعر ہیں۔

ان کا شمار بیجاپور کے کہنہ مشق شاعروں میں کیا جاتا ہے۔ دکنی اور اردو شاعر کی حیثیت سے انھوں نے مقبولیت حاصل کی ہے۔

غزلیات کے علاوہ نظمیں اور نعت گوئی میں کافی دسترس رکھتے ہیں چھوٹی اور سلیس بحروں میں شعر کہنے میں خطا شیوگی بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ آپ غزل گوئی میں ہمیشہ شعور عصر کی ترجمانی کو ترجیح دیتے ہیں۔ آپ کا مخصوص استادانہ رنگ غزل کوئی آب وتاب دینے میں کامیاب رہا ہے گرچہ آپ کو نظم اور نعت میں یکساں عبور حاصل ہے۔

سید دستگیر پاشاہ دولت کوٹھی اردو کے اچھے استاد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے تخلیق کار بھی ہیں۔ ان کے نثری مضامین وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کا پہلا مضمون روزنامہ سالار بنگلور میں بعنوان 'خواجہ بندہ نواز گیسودراز کی ادبی خدمات' پر 1987 میں شائع ہوا۔ ان کے مضامین مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ انھوں نے یو جی سی کا مائنر ریسرچ پروجیکٹ بھی بعنوان 'ابراہیم عادل شاہ ثانی ہندوستانی تہذیب کا مدح' مکمل کیا ہے۔ ادب کی مقامیت کو اہمیت دینے کا ان کا جو رویہ ہے وہ اپنی جڑوں میں اترتا جارہا ہے۔

حیات روزیندار نہ صرف اردو میں شاعری کرتے ہیں بلکہ ہندی اور کنڑا زبان میں شاعری کی ابتدا کی ہے۔ ان کے کلام میں حب الوطنی کا جوش وخروش بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا ایک قطعہ دیکھیے۔

یوں وطن کو سجائیں گے چلو
فرض اپنا نبھائیں گے چلو
آدمی کو ہر ایک آج حیات
پھر سے انسان بنائیں گے چلو

ان کی شاعری میں وطن پرستی کے علاوہ تصوف، عشق، انسان دوستی اور سماجی اصلاحی افکار بھی پائے جاتے ہیں۔

حیات روزیندار کا شعری مجموعہ 'گل حیات' کرناٹک اردو اکادمی، بنگلور سے شائع ہوچکا ہے۔

ڈاکٹر ہاجرہ پروین نے گلبرگہ یونیورسٹی سے ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ایم اے اردو میں موصوفہ کو خواجہ بندہ نواز گولڈ میڈل حاصل ہوا۔ آپ کے ایم فل کا موضوع 'مظہر الزماں کی شخصیت اور افسانوی فن' تھا اور ڈاکٹر آف فلاسفی کا تحقیقی موضوع 'آزادی کے بعد جنوبی ہند کے اردو افسانے کا تنقیدی مطالعہ' تھا جو گلبرگہ یونیورسٹی نے یہ ڈگری ان کو 2004 میں تفویض کی۔ وہ تقریباً بارہ سال سے صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دے رہی ہیں۔ آپ عہد جدید کی اُبھرتی ہوئی افسانہ نگار و بہترین مضمون نگار ہیں اور اس کے علاوہ طنز ومزاح پر بھی لکھ رہی ہیں۔ ان کی تخلیقات مختلف رسائل و جرائد اور اخبارات میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ جن میں روزنامہ سیاست حیدرآباد، روزنامہ منصف حیدرآباد، ایقان گلبرگہ، ماہنامہ عالمی شمع گلبرگہ، ماہنامہ شگوفہ حیدآباد وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ان کی ایک کتاب 'جدید فکشن کا امام مظہر الزماں خاں' منظر عام پر آچکی ہے جس کو قارئین ادب کی بھرپور داد ملی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے یو جی سی کا مائنر ریسرچ پروجیکٹ بعنوان 'شہر بیجاپور کے اردو میڈیم ہائر ہائی اسکول پرائمری اسکولوں کی صورتحال' پر مکمل کیا ہے۔

ڈاکٹر سید علیم اللہ حسینی کا تحقیقی موضوع 'کرناٹک میں اُردو نظم 1956 کے بعد ایک جائزہ' تھا۔ آپ کے مضامین مختلف اخبارات، رسائل و جرائد کی زینت بن چکے ہیں۔ جن میں جہان اردو، دربھنگہ، گیسوئے اردو دکنی ادب، گلبرگہ، قرطاس ناگپور، اذکار، کرناٹک اردو اکادمی بنگلور، نیادور، لکھنؤ، شاعر، ممبئی، روزنامہ سالار، روزنامہ انقلاب دکن وغیرہ ہیں۔ ان کی ایک کتاب 'مرقع ادب' کرناٹک اردو اکادمی سے 2014 میں شائع ہوئی جس میں ادبی مضامین ہیں۔

ڈاکٹر سید علیم اللہ حسینی کا اسلوب نگارش بہت عمدہ ہے۔ انھوں نے یو جی سی کا مائنر ریسرچ پروجیکٹ بعنوان 'عادل شاہی دور کی علمی وادبی خدمات' مکمل کیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ قومی بین الاقوامی سیمنار میں اپنے مقالات پیش کرتے رہتے ہیں۔

انتخاب کتابیات

1. واقعاتِ مملکت بیجاپور جلد اول، بشیرالدین احمد دہلوی، کرناٹک اردو اکادمی بنگلور، جنوری 2003
2. واقعاتِ مملکت بیجاپور جلد دوم، بشیرالدین احمد دہلوی، کرناٹک اردو اکادمی بنگلور، فروری 2004
3. بساتین السلاطین، حضرت ابراہیم زبیری، اردو ترجمہ مولانا محبوب الرحمن عمری مدنی، حیدرآباد 2015
4. گلدستہ خلش، خلش رفائی 1975
5. صرف درباں، رؤف خوشتر، شولاپور 2011
6. عبدالرؤف خوشتر، فن اور شخصیت، انور کمیشنر، شولاپور 2018
7. تیسرا سفر، سلیمان خمار، نئی دہلی 1981
8. سمندر جاگتا ہے، سلیمان خمار، کرناٹک اردو اکادمی بنگلور 2009
9. ہوا سے کہو، احمد عارف، حیدرآباد 2015
10. ایک کمرے والا مکان، احمد عارف، دہلی 2018
11. مضامین فاروقی، ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی، بک ویر، بنگلور نومبر 2006
12. ہندوستان ہمارا ہے، ریاض فاروقی، کرناٹک اردو اکادمی بنگلور 2019
13. اردو ناول کا سماجی پس منظر میں ایک تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر بیگم رضیہ سلطانہ، بک ویر بنگلور 2018
14. مرقع ادب، ڈاکٹر سید علیم اللہ حسینی، کرناٹک اردو اکادمی بنگلور 2015
15. جدید فکشن کا امام مظہر الزماں خاں، ڈاکٹر ہاجرہ پروین، نئی دہلی 2016
16. گل حیات، حیات روزیندار، کرناٹک اردو اکادمی بنگلور 2019
17. ادب شناسی، ڈاکٹر ہاجرہ پروین، ڈاکٹر محمد سمیع الدین، ڈاکٹر سید علیم اللہ حسینی، نئی دہلی 2019

■

Dr. Md. Samiuddin
Assistant Professor of Urdu,
SECAB ARS Inamdar Arts Science & Commerce.
College for Women, Jalanagar Bijapur.
Karnataka. Pin 586109.
Cell No. 09341044679.
Email I.D: samibagdal@gmail.com

بلال احمد وار

جموں و کشمیر کے دیہی علاقوں کی

معاشی و سماجی ترقی میں ماحولیاتی سیاحت (ایکوٹورزم) کا کردار

جموں و کشمیر کے دیہی علاقوں کی معاشی و سماجی ترقی میں ماحولیاتی سیاحت (ایکوٹوریزم) کا کردار

سیاحت دنیا کے بڑے معاشی شعبوں میں سے ایک اہم شعبہ ہے۔ اس شعبے کے ساتھ بہت ساری چھوٹی اور بڑی صنعتیں وابستہ ہیں جو سیاحوں کو درکار مصنوعات اور دیگر خدمات پیدا کر کے روزگار کے مواقع پیدا کرتا ہے۔ ورلڈ ٹریول اینڈ ٹورزم کونسل کے مطابق 2018 میں سیاحتی شعبے کا عالمی معیشت میں 10.4 فیصد تعاون تھا اور اس سے 319 ملین روزگار پیدا ہوئے، جو دنیا بھر میں مجموعی روزگار کا دس فیصد حصہ تھا۔ ماہرین کا ماننا ہے کہ سیاحت کا عالمی معیشت میں اصل تعاون برعکس اس کے براہ راست تعاون سے تین گناہ زیادہ ہے۔ معاشی فوائد نے سیاحت کو ایک عالمی طاقت بنا دیا ہے، جو تعمیر و ترقی میں فروغ اور بہتر روزگار پیدا کر کے دنیا بھر میں کروڑوں لوگوں کی زندگیوں کو بہتر بنانے میں مدد کرتا ہے۔ عالمی سیاحت کے معاشی فائدے کا پچاس فیصد فائدہ دس ممالک حاصل کرتے ہیں۔ ان میں فرانس اور امریکہ سرفہرست ہیں۔ اگرچہ ہندوستان دنیا کے پہلے دس سیاحتی مقامات میں شامل نہیں ہے، لیکن ایشیائی خطے میں ہندوستان سیاحتی طور پر سب سے زیادہ تیزی سے فروغ پانے والا ملک ہے، جو ایشیائی خطے کے دس فیصد سیاحت کے معاشی فائدے میں سے 6.6 فیصد معاشی فائدہ حاصل کرتا ہے۔ ہندوستان کی سیاحت میں جموں و کشمیر کو اہم مقام حاصل ہے کیونکہ جموں و کشمیر میں سیاحت کے بے پناہ قدرتی وسائل موجود ہیں۔ البتہ یہ وسائل ماحولیاتی طور پر بہت ہی حساس ہیں۔ ان کو سیاحت کے بطور فروغ دے کر نہ صرف ہندوستان میں بین الاقوامی سیاحت کو فروغ ملے گا، بلکہ یہ جموں و کشمیر کی تعمیر و ترقی، معاشی و سماجی خوشحالی اور امن و شانتی میں بھی اہم کردار ادا کرسکتا ہے۔

ماحولیاتی سیاحت: ایک تعارف

دنیا بھر میں ہر سال کروڑوں سیاح ملکی و بین الاقوامی سیر کرتے ہیں جس کے بہت سارے معاشی، سماجی اور ماحولیاتی اثرات رونما ہوتے ہیں۔ متعدد تحقیقوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سیاحت دونوں، منفی اور مثبت اثرات مرتب کرتی ہے۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ سیاحت کے منفی اثرات کو کم کر کے اس کے مثبت اثرات کو فروغ دیا جائے۔ نیز سیاحتی وسائل کو معقول انداز میں استعمال کیا جائے اور یہ یقینی بنایا جائے کہ موجودہ نسل کے ساتھ ساتھ آئندہ آنے والی نسلیں بھی سیاحتی وسائل سے لطف اندوز ہوسکیں۔ اس ضمن میں اقوام متحدہ اپنے رکن ممالک پر زور دیتا ہے کہ ماحولیاتی سیاحت (ایکوٹوریزم) کو فروغ دینے والی پالیسیاں اپنائیں اور ماحولیاتی سیاحت کا ماحول، معیشت، سماج و ثقافت کے تحفظ میں مثبت کردار کو اجاگر کیا جائے۔ ماحولیاتی سیاحت، کی ایک ایسی قسم ہے جس میں حساس مقامات کو سیاحت کے طور پر فروغ دیتے ہوئے معاشی، سماجی، ثقافتی اور ماحولیاتی ورثے کے تحفظ کو یقینی بنایا جاتا ہے۔ اس قسم کی سیاحت میں سیاحوں کو سیاحتی مقامات کے ماحول اور وہاں پر مقیم لوگوں کی ثقافتوں، روایات اور رسومات سے روشناس کرایا جاتا ہے تاکہ ان کا خیال رکھ کے تحفظ اور فروغ کو آسان بنایا جائے۔ نیز اس سے مقامی آبادی کے لیے روزگار کے وسائل پیدا کر کے ان کی سماجی و معاشی بہتری کو بھی یقینی بنایا جائے۔ ماحولیاتی سیاحت پائیدار روزگار کی تخلیق کر کے نہ صرف مقامی لوگوں کی معیشت کو بہتر بناتی ہے بلکہ ملک کے ترقیاتی منصوبوں کے لیے بھی وسائل پیدا کرتی ہے۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے سال 2012 میں ماحولیاتی سیاحت سے وابستہ ایک قرارداد زیر نمبر 232/67 منظور کی۔ اس قرارداد میں ماحولیاتی، سماجی و معاشی تحفظ نیز غربت کے خاتمے اور لوگوں کے رہائشی حالات کو بہتر بنانے کے لیے ماحولیاتی سیاحت کو فروغ دینے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ پائیدار سماجی و معاشی ترقی کے اہداف کے حصول کے لیے ماحولیاتی سیاحت کی حکمت عملی اور منصوبہ بندی اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

جموں و کشمیر کی معیشت کا مجموعی جائزہ

جموں و کشمیر کی معیشت تین شعبوں پر مشتمل ہے۔ زراعت، صنعت اور خدمات۔ زرعی شعبہ باغبانی، مویشی پالن، مچھلی پالن اور ریشم کاری پر مشتمل ہے۔ صنعتی شعبے میں بہت سارے چھوٹے اور بڑے صنعتی کارخانے شامل ہیں۔ جب کہ خدمت شعبے میں مختلف خدمات بشمول سیاحت اور اس سے منسلک ہوٹل، ٹرانسپورٹ وغیرہ شامل ہیں۔ 2018-19 کے معاشی سروے کے مطابق جموں و کشمیر کی معیشت میں خدمات شعبے کا 55.92 فیصد تعاون ہے۔ جب کہ صنعتی شعبے کا 27.90 اور زرعی شعبے کا 16.18 فیصد ہے۔ درج ذیل گراف جموں و کشمیر کے مختلف معاشی شعبے اور ان کا معیشت میں تعاون کو ظاہر کرتا ہے۔

جموں وکشمیر معاشی و سماجی ترقی پر گامزن ہے۔ اگر چہ اس کو اطمینان بخش نہیں کہا جاسکتا ہے لیکن تسلی بخش ضرور ہے۔ اس صورت حال کا اندازہ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ یہ تمام اعداد و شمار جموں وکشمیر کی اکنامک سروے سے لی گئی ہیں۔

جموں وکشمیر معاشی و سماجی ترقی پر گامزن ہے۔ اگر چہ اس کو اطمینان بخش نہیں کہا جاسکتا ہے لیکن تسلی بخش ضرور ہے۔ اس صورت حال کا اندازہ مندرجہ ذیل جدول کے اعداد و شمار اور گراف سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ یہ تمام اعداد و شمار جموں وکشمیر کے معاشی سروے اور ڈائریکٹوریٹ برائے معاشیات شماریات سے لی گئی ہیں۔

سال	خدمات	صنعتیں	زراعت	کل
1980-81	39.7	12.90	47.40	100
1990-91	44.70	16.81	38.49	100
2000-01	47.20	20.23	32.57	100
2010-11	51.79	24.14	24.07	100
2018-19	55.92	27.90	16.16	100

(ڈائریکٹریٹ برائے شماریات و معاشیات (اعداد و شمار برائے سال 2013-14) اور معاشی سروے جموں وکشمیر برائے سال 2018 اور 2019 حکومت جموں وکشمیر)

ان اعداد و شمار کے احاطہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جموں وکشمیر کی معیشت میں پہلے زرعی شعبہ غالب تھا جس کا معیشت میں پچاس فیصد سے زیادہ تعاون تھا۔ لیکن اس کا شرح تعاون بتدریج کم ہوتا جارہا ہے۔ پچھلے چالیس سالوں میں زرعی شعبے کا تعاون 47 فیصد سے گر کر 2019 میں 16.8 فیصد تک کم ہوگیا ہے۔ دوسری طرف خدمات شعبے کا تعاون مسلسل بڑھ گیا ہیں اور اس میں سیاحت بالخصوص سب سے زیادہ ترقی کی راہ پر گامزن ہے جس کی طرف جموں وکشمیر کے دیہی علاقوں میں خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

جموں وکشمیر کے دیہی علاقوں کی سماجی و معاشی صورت حال

دو ہزار گیارہ (2011) کی مردم شماری کے مطابق جموں وکشمیر کی 73 فیصد آبادی دور دراز دیہی اور سرحدی علاقوں میں مقیم ہے۔ دیہی علاقوں کی معیشت بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر زراعت اور اس سے منسلک شعبوں پر منحصر ہے جس میں زراعت، باغبانی، مویشی پالن، ریشم کاری، دستکاری، مچھلی پالن وغیرہ شامل ہیں۔ باغبانی کا جموں و کشمیر کی کل آمدنی میں 7 سے 8 فیصد تعاون ہے۔ اس کے ساتھ 33 لاکھ خاندان منسلک ہیں۔ دیہی علاقوں کے 30000 ایسے خاندان جو معاشی طور پر پسماندہ ہیں اور جن کے پاس زمین و جائداد نہیں ہے، ریشم کاری کے ساتھ وابستہ ہیں۔ مویشی پالن جموں وکشمیر میں آغاز سے ہی طرز زندگی رہا ہے، دیہی علاقوں کے لوگ اکثر مویشی پالتے ہیں۔ 2018 کے معاشی سروے کے مطابق مویشی پالن کا دیہی آبادی کی معیشت میں 34 فیصد اور جموں وکشمیر کی مجموعی معیشت میں 5.53 فیصد حصہ ہیں۔ یہ اضافی آمدنی کے علاوہ دیہی آبادی کو درکار کھاد، ایندھن، گوشت، دودھ، اون وغیرہ فراہم کرتا ہے۔ جموں وکشمیر کی دستکاری دنیا بھر میں مشہور ہے۔ دیہی علاقوں کے معاشی طور پسماندہ طبقے خاص طور پر عورتیں اس پیشے کے ساتھ وابستہ ہیں۔ درج ذیل جدول اور گراف جموں وکشمیر کی دیہی معیشت میں زراعت اور اس منسلک شعبوں کے تعاون کو ظاہر کرتا ہے۔

جموں وکشمیر کی معیشت میں زراعت اور اس سے منسلک لوگوں کا تعاون

نمبر شمار	شعبہ	کل تعاون معیشت	تعاون زراعت/ دیہی معیشت (فیصد)
1	فصل و باغبانی (Crops)	8.16	51
2	مویشی پالن (Livestock)	5.53	34
3	جنگلات (Forests)	1.45	9
4	کان کنی (Mining)	0.64	4
5	مچھلی پالن (Fisheries)	.033	2
6	کل تعاون	16.18	100

معاشی سروے برائے سال 2018-19 حکومت جموں وکشمیر

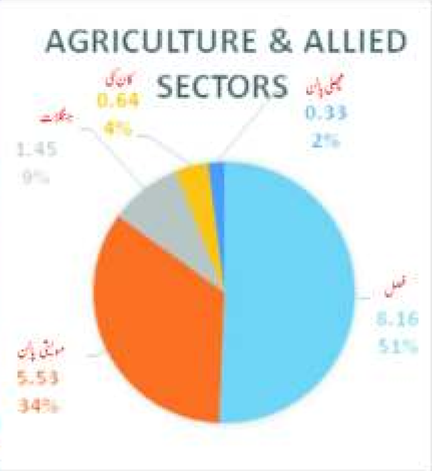

اس طرح سے جموں وکشمیر کی کل آبادی کا 73 فیصدی حصہ جو بالخصوص دیہی علاقوں میں مقیم ہے، زرعی شعبے کے ساتھ وابستہ ہے جو جموں وکشمیر کی کل معیشت میں صرف 16.8 فیصد تعاون کرتا ہے، جب کہ باقی 27 فیصد شہری آبادی صنعتوں اور سروس سیکٹر کے ساتھ وابستہ ہے جس کا جموں وکشمیر کی کل معیشت میں 83 فیصد تعاون ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ دیہی علاقے بے روزگاری معاشی و سماجی پس ماندگی کے شکار ہیں جس سے ان علاقوں میں تعمیر و ترقی اور معیار زندگی متاثر ہوتی ہے۔ اگر چہ جموں وکشمیر کے دیہی علاقوں میں معیشت زوال پذیر ہونے کی بہت ساری وجوہات ہیں لیکن 2017 کے معاشی سروے کے مطابق اس میں زرعی زمین کی تقسیم، تعمیرات کے لیے استعمال، کاشت کاری میں جدید سائنسی علوم اور ٹیکنالوجی کا کم استعمال کے علاوہ چراگاہوں میں کمی، قرض اور سب سیڈی کی قلت، پیداوار کی فروخت کے لیے مارکیٹ اور منڈیوں کا فقدان شامل ہیں۔

جموں وکشمیر کے دیہی علاقوں کی معاشی و سماجی ترقی میں ماحولیاتی سیاحت

زیادہ تر قدرتی اور خوبصورت مقامات دور دراز دیہی اور سرحدی علاقوں میں واقع ہوتے ہیں۔ جموں وکشمیر کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ یہاں خوبصورت اور سیاحوں کو اپنی طرف راغب کرنے والے مقامات دور دراز دیہی اور سرحدی علاقوں میں واقع ہیں۔ جیسے وکس (اننت ناگ)، لولاب اور وادی بنگس (کپواڑہ)، توش میدان (بڑگام) اور گریز (بانڈی پورہ)۔ یہ مقامات اپنی خوبصورتی اور

دلکش آب و ہوا کی بدولت گلمرگ، پہلگام اور مغل باغات جیسے مشہور سیاحتی مقامات سے زیادہ سیاحتی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جموں وکشمیر کے پانچ سرحدی اضلاع ہیں جن میں پونچھ، راجوری، بارہمولہ، بانڈی پورہ اور کپواڑہ شامل ہیں۔ یہ سرحدی اضلاع اپنی تاریخی یادگاروں، پہاڑی چوٹیوں، قدرتی خوبصورتی، مقامی روایات اور مشہور ثقافتوں سے مالا مال ہیں جو سیاحت کے فروغ اور سیاحوں کی دلچسپی کے لیے ایک نایاب سامان ثابت ہو سکتے ہیں۔ البتہ یہ علاقے سماجی ومعاشی طور پر پسماندہ ہیں اور یہاں پر مقیم آبادی کا معیار زندگی کم ہے اور روزگار کے مواقع بھی کم ہیں۔ ان اضلاع کی پسماندگی کی وجہ تعمیری ڈھانچے اور رسائی کی کمی ہے۔ جموں وکشمیر کے دیہی اور سرحدی علاقوں میں سیاحت کے بے پناہ وسائل موجود ہیں۔ یہاں بہت سے قدیم مندر، خانقاہیں، قلعے، روایات اور رسومات، کھانا، لباس وغیرہ ہیں جو انتہائی متاثر کن اور فروغ دینے کے قابل ہیں۔ ان علاقوں کی قدرتی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ سرسبز وشاداب جنگلات، برف پوش پہاڑ، تیز بہاؤ والے ندی نالے اور دریا، وائلڈ لائف وغیرہ، ان سب مقامات کی قدر ومنزلت اور ان کی رعنائیوں میں بے حد اضافہ کرتے ہیں۔

سیاحت کو دور دراز دیہی اور سرحدی مقامات کی ترقی کے لیے سب سے نمایاں اور آسان آلہ ہیں اور سیاحتی سرگرمیاں ان علاقوں میں لوگوں کے سماجی اور اقتصادی حالات کو تبدیل کرنے کی کافی صلاحیت ہے۔ سیاحت کے فروغ سے ان دیہی اور سرحدی علاقوں میں بنیادی تعمیری ڈھانچہ جیسے سڑکوں اور پلوں کی تعمیر، پانی اور بجلی کی فراہمی، بینک اور دیگر اداروں کی سہولت، رہائش اور کھان پان کے لیے ہوٹل وغیرہ کی تعمیر ہوگی۔ دیہی علاقوں کی معاشی بدحالی اور بیروزگاری سے نمٹنے کے لیے دیہی علاقوں میں سیاحت سے سرمایہ کاری، روزگار، ماحولیاتی تحفظ اور ثقافت اور روایات کو فروغ ملے گا۔ خاص طور پر روایتی صنعتوں کی۔ جیسے کارپینٹری، دستکاری مقامی فن کاری وغیرہ جس سے دیہی علاقوں میں مقیم آبادی کی معاشی وسماجی حالت بہتر ہوسکتی ہیں سیاحت مزید معاشی سرگرمیوں کے لیے بھی راہ فراہم کرے گی۔

سیاحت کی صلاحیت اور فروغ کو دیہی ترقی کی حکمت عملی کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ سیاحت موثر بنیادی تعمیری ڈھانچہ فراہم کر کے حائل رکاوٹوں کو دور کرکے نجی شعبے میں سرمایہ کاری کو بڑھا سکتی ہے۔ کمیونٹی کی سطح پر سیاحت جموں وکشمیر کے دیہی علاقوں میں غربت کے خاتمے میں مددگار ثابت ہوگی۔ جو متبادل آمدنی کا ذریعہ فراہم کر کے مقامی آبادی کو سیاحت کے منصوبوں کے مرتب اور نگرانی میں شامل کر کے تجارت، سرمایہ کاری اور روزگار کے مواقع پیدا کرنے کے لیے نئے دروازے کھول دے گا۔ دیہی علاقوں میں سیاحت کا فروغ قدرتی وسائل تک رسائی متبادل آمدنی اور ذریعہ معاش فراہم کرے گا۔ جموں وکشمیر کے دیہی علاقوں میں معیشت میں گراوٹ اور شہری زندگی اور خدمت شعبوں کی طرف بڑھتی ہوئی کشش دیکھی جارہی ہیں۔ کیونکہ دیہی معیشت جو زراعت پر مبنی ہے، کا مستقبل غیر یقینی اور زوال پذیر ہے۔ اس لیے دیہی علاقوں کے معیشت کو برقرار رکھنے اور روزگار کی تخلیق اس میں تنوع کے لیے دیہی سیاحت ایک اہم ہتھیار اور ذریعہ ثابت ہوگی۔ سیاحت دیہی فنون و دستکاری اور بنیادی تعمیری ڈھانچے کی ترقی کے لیے ایک ترغیب فراہم کرے گی، جو دیہی علاقوں میں دیگر معاشی سرگرمیوں میں اضافے میں معاون و مددگار ثابت ہوگا۔ دیہی علاقوں میں سیاحت کی ترقی کا ایک خاص فائدہ یہ ہوگا کہ اس سے دیہی اور سرحدی علاقے کی آبادی کے سماجی رابطے بڑھیں گے جو اکثر الگ تھلگ زندگی گزارتے ہیں۔

جموں وکشمیر کے دیہی علاقوں میں سیاحت کے فروغ کے لیے اٹھائے گئے چند اقدامات

جموں وکشمیر میں 47 فیصد قابلِ استعمال زمین پر جنگلات ہیں۔ یہ جنگلات دور دراز دیہی اور سرحدی علاقوں میں ہیں۔ جنگلاتی پالیسی 2011، جنگلات کے تحفظ اور ان سے معاشی فوائد حاصل کرنے کے لیے جنگلات کو ماحولیاتی سیاحت کے بطور فروغ دینے کی وکالت کرتی ہے۔ 2011 جنگلاتی پالیسی کو لاگو کرتے ہوئے محکمہ جنگلات نے 2017 میں ماحول دوست سیاحتی پالیسی مرتب کی۔ اس سے جنگلات، چراگاہوں، قومی پارکوں اور وائلڈ لائف سنچریوں میں سیاحت کو فروغ دینے کی راہیں ہموار کی گئیں نیز جنگلات پر منحصر دیہی اور سرحدی علاقوں کے لوگوں کو سیاحت ایک متبادل ذریعہ معاش اپنانے پر بھی زور دیا گیا۔ 2016 سیاحتی پالیسی کے تحت جموں وکشمیر کے روایتی سیاحتی مقامات جیسے گلمرگ، پہلگام، ڈل جھیل وغیرہ سیاحوں کی کثیر آمد رفت سے ماحولیاتی طور پر آلودہ ہو چکی ہیں۔ اس لیے دور دراز اور سرحدی علاقوں میں واقع دوسری سیاحتی مقامات جن میں بنگس، لولاب، دودھ پتھری، توشہ میدان وغیرہ کو فروغ دینے پر زور دیا گیا کہ روایتی سیاحتی مقامات پر سیاحوں کے دباؤ کو کم کیا جاسکے۔ جموں وکشمیر میں دور دراز دیہی

سیاحت کی صلاحیت اور فروغ کو دیہی ترقی کی حکمت عملی کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ سیاحت موثر بنیادی تعمیری ڈھانچہ فراہم کر کے حائل رکاوٹوں کو دور کرکے نجی شعبے میں سرمایہ کاری کو بڑھا سکتی ہے۔ کمیونٹی کی سطح پر سیاحت جموں و کشمیر کے دیہی علاقوں میں غربت کے خاتمے میں مددگار ثابت ہوگی۔

اور سرحدی علاقوں میں سیاحت کو فروغ دینے کے لیے دیہی سیاحتی اسکیم کے تحت جموں وکشمیر کے 30 دیہاتوں میں سیاحت کو درکار بنیادی ڈھانچہ تعمیر کرنے کا منصوبہ رکھا گیا ہے۔ البتہ معاشی قلت کی وجہ سے ان سیاحتی منصوبوں کو مکمل کرنے میں دقت کا سامنا ہے۔ اس لیے ان علاقوں میں سرکار کی طرف سے پہلے ہی سے چلائے جارہے دیہی ترقیاتی پروگرام کو سیاحت کے ساتھ جوڑ کر سیاحتی منصوبوں کو لاگو کرنے کے لیے مالی قلت کو دور کیا جا سکتا ہے اور علاقوں میں تعمیر وترقی اور سماجی ومعاشی خوشحالی کو بھی یقینی بنایا جا سکتا ہے۔ سرکار کے بہت سارے منصوبے اور اسکیمیں ایسی ہیں جو دیہی علاقوں کے لوگوں کی معاشی خوش حالی اور فلاح و بہبود کے لیے دستیاب ہیں۔ ان اسکیموں میں پردھان منتری گرام سڑک یوجنا، رولر واٹر سپلائی اسکیم، منریگا، دیہی بجلی اسکیمیں، کھادی اینڈ ولیج انڈسٹریز، نبارڈ، اور دیگر کئی ایسی اسکیمیں ہیں جو محض دہی علاقوں ہی کے لیے دستیاب ہیں۔ لیکن ان اسکیموں سے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہورہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان اسکیموں کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ دیہی علاقوں کے لوگ معاشی وسماجی طور سے مضبوط ہوں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جو اسکیمیں دستیاب ہیں، ان کو مزید موثر اور بہتر انداز میں استعمال کیا جائے۔ ایسا ممکن ہے اگر ان اسکیموں کو دیہی علاقوں میں سیاحت کے ساتھ جوڑ کر مزید مفید بنایا جاسکتا ہے۔ جس سے دیہی علاقوں میں تعمیر وترقی اور خوشحالی کے نئے ترقیاتی منصوبے پیدا کیے جاسکتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس کے ذریعے سے نوجوانوں میں بہترین روزگار کے مواقع بھی پیدا ہوں گے۔ اس طرح سے سیاحت جموں وکشمیر کی ترقی اور امن وسلامتی کے قیام میں معاون ثابت ہوگی۔

■

Hilal Ahmad War
Research Scholar, Dept of Social Work
MANUU, Gachibowli
Hyderabad - 500032 (Telangana)

کمال الدین کمال عظیم آبادی

شخصیت اور شاعری

شاذیہ کمال

کمال الدین کمال عظیم آبادی، سرزمین عظیم آباد کی ایک ناقابل فراموش ادبی شخصیت ہیں۔ ان کی شاعری ہمارے معاشرے، سماج وسیاست، مذہب واخلاق اور وطن وملت کی منھ بولتی تصویر ہے جسے باشعور قارئین ہدیۂ نذرانہ پیش کرنے سے گریز نہیں کریں گے۔ کچھ تحریریں ایسی ہوتی ہیں جنھیں سمجھنے کے لیے قاری کے لیے انہاک درکار ہے اور بعض تحریریں بہت جلد اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں اور قاری کی دلچسپی وتجسس کو بڑھا دیتی ہیں۔ موصوف کی شاعری بھی اسی نوعیت کی ہے جس میں قاری تھوڑی دیر میں ڈوبتا ہوا نظر آتا ہے۔

موصوف کی شخصیت اورفن کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی زندگی سمندر میں طغیانی کی مانند رہی۔ ان کی شاعری سمندر میں چھپے ہیروں کو تلاش کرنے کی مہم کا ایک حصہ ہے۔ اس سے پہلے کہ موصوف کی شاعرانہ حسیت کا جائزہ لیا جائے ایک نظر ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر ڈال لینا ضروری ہے۔

موصوف کی پیدائش 16 جون 1939 (میٹرک کی سرٹی فکیٹ کے مطابق) کو اپنے آبائی گاؤں مہدانواں (منیر شریف) کے ایک باعزت اور سادات گھرانے میں ہوئی۔ مہدانواں ایک قدیم اور مردم خیز بستی رہی ہے جو تقسیم ہند کے باعث متاثر ہوئی اور مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد پاکستان ہجرت کرگئی۔ یہ بستی علمائے صادق پور کی اولین آماجگاہ رہی ہے۔ موصوف اسی بستی کی ایک جیتی جاگتی مثال تھے۔ ان کے والد کا نام سید محمد صلاح الدین تھا اور وہ نہال تخلص کرتے تھے۔ اردو وفارسی کے وہ ماہر تھے اور انگریزی زبان سے بھی خاصے واقف تھے مگر کسی ملازمت سے وابستہ نہیں تھے۔ کئی پشتوں سے چلا آرہا زمینداری کا سلسلہ قائم تھا اور وہی ذریعۂ معاش تھا۔ شاعری سے انھیں شغف تھا اور وہ اردو میں شاعری کیا کرتے تھے۔ بطور مثال۔

میں سوچتا ہوں یارو! خوشیاں مناؤں کیونکر
خوش ہے بھی یا نہیں ہے ہم سے وہ رب اکبر
میری خوشی سے میرا رونا ہزار بہتر
اللہ ہی جانتا ہے، ہے عید عید کس کی

کمال الدین کمال عظیم آبادی، سرزمین عظیم آباد کی ایک ناقابل فراموش ادبی شخصیت ھیں۔ ان کی شاعری ھمارے معاشرے، سماج وسیاست، مذھب واخلاق اور وطن وملت کی منھ بولتی تصویر ھے جسے باشعور قارئین ھدیۂ نذرانہ پیش کرنے سے گریز نھیں کریں گے۔ کچھ تحریریں ایسی ھوتی ھیں جنھیں سمجھنے کے لیے قاری کے لیے انھماک درکار ھے اور بعض تحریریں بھت جلد اپنی گرفت میں لے لیتی ھیں اور قاری کی دلچسپی وتجسس کو بڑھا دیتی ھیں۔ موصوف کی شاعری بھی اسی نوعیت کی ھے جس میں قاری تھوڑی دیر میں ڈوبتا ھوا نظر آتا ھے۔

موصوف پر ان کے خاندانی پس منظر اور ان کے والد گرامی کے شعری ذوق کے گہرے اثرات تھے۔ وہ اپنے والدین کی چوتھی اولاد تھے۔ ان کا بچپن ان کے آبائی گاؤں مہدانواں میں بیتا اور ان کی ابتدائی زندگی شان وشوکت سے گزری۔ موصوف جب محض چھ سال کے تھے تو ان کے والد (42 سال کی عمر میں) اللہ کو پیارے ہوگئے۔ شفقتِ پدری سے محرومی اور پیدا شدہ نئے مسائل نے ان کے دل ودماغ کو بہت متاثر کیا مگر شفیق والدہ کی تربیت اور پیار ومحبت نے موصوف کو کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دی۔ خود موصوف کی زبانی۔

میری ماں نے دیا ہے پیار مجھ کو ایسی الفت سے
کہ زندہ رہ رہا ہوں آج بھی میں اس کی برکت سے
مجھے پالا ہے میری ماں نے اپنے پاس عشرت سے
کبھی دیکھا نہیں مجھ کو حقارت یا کہ نفرت سے

موصوف کی ابتدائی تعلیم اپنے گھر پر والد محترم کی زیرِ نگرانی انجام پائی۔ پھر اُن کا داخلہ پٹنہ مسلم اسکول میں درجہ دوم میں ہوا۔ وہاں سے درجہ چہارم تک کی تعلیم حاصل کی۔ پھر اپنے گاؤں مہدانواں چلے آئے اور یہاں ان کا داخلہ درجہ ششم میں ہوا۔ درجہ ششم میں زیرِ تعلیم ہی تھے کہ ان کے مزاج میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہوئی اور ان کے ذہن نے ایک خوبصورت حمد کی تخلیق کی۔ اس وقت اسکول کے ہیڈ مولوی (صاحب دیوان) حضرت سید شاہ مراد اللہ فردوسی برادر خرد سجادہ نشین خانقاہ منیر شریف حضرت سید شاہ عنایت اللہ فردوسی کی نظر سے گزری تو اصلاح کی حاجت محسوس کیے بغیر اسکول ہذا کی سالانہ میگزین میں شامل کرتے ہوئے اردو حصے کے سرورق پر جگہ دی۔ منیر ہائی اسکول سے ہی انھوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور پھر رام موہن رائے سمیزی، پٹنہ سے آئی کام کی ڈگری حاصل کی۔ موصوف فٹ بال کے اچھے کھلاڑی تھے اور ضلع سطح پر منعقد ہونے والے مقابلوں میں حصہ لیا کرتے تھے۔ دورانِ تعلیم ہی ان کی نوکری بہار سرکار میں بطور کوآپریٹیو انسپکٹر ہوگئی تھی۔ یہ 1960 کے بعد کی بات ہے۔ مگر جلد ہی اپنی غیر محکومانہ فطرت کے سبب اپنی سروس کو الوداع کیا۔ دو تین نجی اداروں میں مینجمنٹ اور اکاؤنٹس کے شعبے سے وابستہ رہے لیکن ان نوکریوں کو بھی جلد ہی چھوڑ دیا۔ دل میں ملی اور قومی جذبہ بدرجہ اتم موجود تھا۔ وہ 1982 کے آس پاس اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے امارت شرعیہ کے مرکزی دفتر پھلواری شریف میں مامور ہوئے۔ تب سے لے کر 2011 تک (جب تک ان

کمال الدین کمال عظیم آبادی نے نظم اور غزل دونوں اصناف پر خوب طبع آزمائی کی۔ ان کے علاوہ قطعات ورباعیات اور طنز ومزاح بھی ان کے تخلیقی سفر میں ساتھ ساتھ رہے۔ سہرا لکھنے پر بھی انہیں قدرت حاصل تھی۔ کئی خوبصورت اور دلپزیر سہرے تخلیق کیے۔ موصوف نے زندگی کے مشاھدوں، تجربوں اور اس کے نشیب وفراز یعنی کامرانیاں وناکامیاں جو زندگی کے مراحل میں بار بار آتی ھیں اپنی شاعری میں پیش کیا ھے۔ ان کی شاعری کسی جمشید کا ساغر نہیں ھے بلکہ ان کے مشاھدے اور ان کی اپنی زندگی میں حاصل شدہ تجربات کا گھرا ساگر ھے

کی صحت نے ساتھ دیا) امارتِ شرعیہ کے کاموں کو بخوبی انجام دیتے رہے۔ اکاؤنٹس کے علاوہ موصوف کی اردو وفارسی پر دسترس تو تھی ہی انگریزی کی بھی اچھی صلاحیت تھی۔ امارت شرعیہ کا اعلیٰ حکام اور سرکاری اداروں سے خط وکتابت کا جو سلسلہ تھا سب موصوف ہی انجام دیا کرتے تھے۔

ادب کو برائے روزی نہیں بلکہ اسے خوراکِ حیات ماننے والی شخصیت سے اگر مجھے واسطہ پڑا ہے تو وہ شخصیت موصوف کی تھی۔ لالچ وطمع سے لاپرواہ، کچھ حاصل کر لینے کی جستجو سے کوسوں دور بلکہ ایسے مواقع سے دوریاں بنالینا ان کی ذات وصفات کا حصہ رہا ہے۔ شغف اور حرص وطمع تھی تو صرف یہ کہ ادب میں ڈوبنا اور ادب کے لیے مرنا۔

''میں اردو کے لیے زندہ ہوں اور اسی پر مرتا ہوں''

موصوف کی شخصیت بھی سراپا شاعرانہ تھی۔ وہ کم گو اور ریز رو شخصیت کے مالک تھے۔ اپنے اندازِ گفتگو اور شخصیت سے پہچان لیے جاتے تھے کہ ایک شاعر باکمال آپ کے ذہن ودماغ میں اور صورت وسیرت میں زندگی گزارتا ہے۔ ان کی زندگی جہاں آلام سے بھری ہوئی تھی وہیں زندگی کے ٹیڑھے میڑھے رستوں کا وہ خندہ پیشانی سے استقبال بھی کرتے تھے۔

موصوف نے نظم اور غزل دونوں اصناف پر خوب طبع آزمائی کی۔ ان کے علاوہ قطعات ورباعیات اور طنز ومزاح بھی ان کے تخلیقی سفر میں ساتھ ساتھ رہے۔ سہرا لکھنے پر بھی انھیں قدرت حاصل تھی۔ کئی خوبصورت اور دلپزیر سہرے تخلیق کیے۔ موصوف نے زندگی کے مشاہدوں، تجربوں اور اس کے نشیب وفراز یعنی کامرانیاں وناکامیاں جو زندگی کے مراحل میں بار بار آتی ہیں اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ ان کی شاعری کسی جمشید کا ساغر نہیں ہے بلکہ ان کے مشاہدے اور ان کی اپنی زندگی میں حاصل شدہ تجربات کا گہرا ساگر ہے۔ موصوف کی شعری خصوصیات کا جائزہ لیتے ہوئے ایڈیٹر نقیب ہفتہ وار (امارت شرعیہ) عبدالرافع صاحب نے اپنے خیالات کا یوں اظہار کیا ہے:

''گرچہ وہ ایک ذی علم گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں اور ممکن ہے کہ ورثہ میں انھیں شعر گوئی اور شعر فہمی ملی ہو مگر ان کی غزلیں، نظمیں، قطعات وغیرہ پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ وہ کسی جمشید کا ساغر نہیں ہیں۔ ان کے اشعار میں ان کی انفرادیت صاف نمایاں ہے جو قاری کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ وہ ایک حساس شاعر ہیں اور اپنے احساسات کو لفظوں میں ڈھال دیتے ہیں اور وہ بھی نہایت خوبی اور خوبصورتی کے ساتھ۔ وہ شعر کہتے ہیں معموں کے اشارے نہیں لکھتے کہ ان کو سمجھنے کے لیے قاری کو اتنی سرمغزنی کرنی پڑے کہ سر دکھنے کو آجائے۔ خیالات سادہ، زبان سادہ اور اس کے ساتھ عام فہم بھی۔''

موصوف ادب کو مفاہیم سے وابستہ کرنا جانتے ہیں مگر ادب کو تحریک کے غول میں بند کرنا پسند نہیں کرتے۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ انسان اور ادب کا رشتہ بہت مضبوط ہونا چاہیے۔ ادب کو زندگی کا ایک ضروری حصہ تسلیم کرتے ہیں مگر اسے خانوں میں تقسیم ہوتے نہیں دیکھنا چاہتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی طویل ادبی زندگی میں کسی بھی ادبی نظریہ یا تحریک سے وابستہ نہیں رہے۔

ایڈیٹر نقیب عبدالرافع ایک جگہ اور رقم طراز ہیں۔

''ان کے اشعار پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نام نہاد ادبی تحریکوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی کوئی ادبی گروہ سے ان کی کوئی فکری یا عملی وابستگی نظر آتی ہے۔ اب اگر کوئی نقاد ان کو کسی ادبی گروپ یا ادبی نظریہ سے وابستہ کردے تو یہ اس کی ذہنی اختراع ہوگی۔ مگر میرے خیال میں کمال صاحب کے فن سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔''

ان کی شاعری کی خصوصیات یہ ہیں کہ انھوں نے شعری تخلیقات کے صرف انبار نہیں لگائے بلکہ فکری سطح پر جو زمین مہیا کی ہے وہ قوم وملت کے لیے بڑا سرمایہ ہے اور اردو ادب کا ایک ناقابل فراموش حصہ ہے۔ انھوں نے شاعری میں معیار کو برقرار رکھا ہے۔ ان کی شاعری Quantity based نہیں ہے بلکہ quality based ہے۔

موصوف کی شاعری میں ایک جانب عظمت انسان کے نشان موجود ہیں وہیں زندگی کا کرب اور تلخیاں بھی ہیں۔ مصیبت زدوں، حادثہ زدوں اور حالات زدوں کا دکھ درد اور ان کے کہے الفاظ کو انھوں نے اپنی شاعری میں زندہ کیا ہے اور انھیں بے باکی اور جسارت عطا کی ہے۔ ان کی شاعری میں فنکاری بھی موجود ہے اور حقیقت بھی۔ ان کی شعری تخلیقات کا جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر محمود نہسوی (سابق وائس چیئرمین، بہار اردو اکیڈمی) رقم طراز ہیں۔

''میں سمجھتا ہوں کہ اردو شاعری کو جہت اور آواز عطا کرنے والوں نے بڑی جسارت کے ساتھ تخلیقی عمل کی راہوں کو طے کیا ہے اور انھیں فنکاروں میں ایک نام کمال الدین کمال کا ہے جو شہرت سے پرے تخلیقی عمل کی راہوں کو طے کرتے آج زندگی کے نام ایک پیغام دے رہے ہیں۔ ان کے اندر ذوق سلیم بھی ہے، فطری میلان بھی ہے اور عرفان وآگہی بھی ہے۔ یہ اس خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں جہاں علم وادب کے چراغ سے چراغ

کمال الدین کمال کی شاعری کی خصوصیات یہ ھیں کہ انھوں نے شعری تخلیقات کے صرف انبار نھیں لگانے بلکہ فکری سطح پر جو زمین مہیا کی ھے وہ قوم وملت کے لیے بڑا سرمایہ ھے اور اردو ادب کا ایک ناقابل فراموش حصہ ھے۔

جلتے رہے ہیں اور جہاں تک کمال الدین کمال کے افکار وتخلیقی سفر کی بات ہے تو ان کے یہاں زندگی کا کرب بھی ہے اور زندگی کی تلخیاں بھی ہیں اور یہی وہ سبب ہے جس نے عظمت زندگی کا درس دیا۔ دکھ درد کے مارے انسانوں کا درد بانٹنے والا بنایا اور ان کی شاعری کو استحکام عطا کیا۔ کمال الدین کمال نے گونگے الفاظ کو بے باکی اور جسارت عطا کی ہے اس لیے ان کی سادگی بھی پرکشش نظر آتی ہے۔

موصوف کی شاعری نے بہتوں کو اپنا گرویدہ بنایا ہے۔ ان کی شاعری میں وہ خصوصیت موجود ہے کہ وہ کسی انسان کی نظر سے گزرے تو وہ انسان متاثر ہوئے بغیر اور اثر قبول کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ڈاکٹر محمد صابر علی (صدر

شعبہ علم الادویہ، فارمالوجی، گورنمنٹ طبی کالج، پٹنہ) ان کی شاعری سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں:

"آپ کا مرتب شدہ شعری مجموعہ 'مجموعہ کمالات' اس وقت ہمارے سامنے ہے جس کا مطالعہ نہایت دلچسپی کے ساتھ دو بار کر چکا ہوں پھر بھی پیاس نہیں بجھی اور جی چاہتا ہے بس پڑھتا ہی رہوں اور اس ادبی سرمایہ سے محظوظ ہوتا رہوں۔"

شعری خصوصیات : کمال الدین کمال عظیم آبادی کے شعری مجموعے 'مجموعہ کمالات' کی خصوصیات یہ ہیں کہ اس میں انھوں نے زندگی کے تمام شعبوں پر غور کیا ہے۔ چاہے وہ دینیات ہو یا فلکیات، اخلاقیات، اقتصادیات، سیاسیات غرض زندگی کا کوئی بھی شعبہ ان کی فکری پہنچ سے محروم نہیں رہا اور اپنے افکار کے اظہار کے لیے وہ کبھی غزل کا سہارا لیتے ہیں تو کبھی نظم کا دامن تھامتے ہیں۔ کبھی انھیں طنز و مزاح کی مدد لینی پڑتی ہے تو کبھی وہ رباعی وقطعہ کے ذریعے اپنے خیالات کو پیش کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ موصوف کی نظم کا کینوس بڑا ہے۔ ان کی نظموں میں جہاں ملت کا درد ہے وہیں حب الوطنی بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ خدا کے وجود اور اس کی وحدانیت، دنیا وفطرت کے مختلف موضوعات ومسائل موصوف کی نظموں میں سمٹ آئے ہیں۔ 'حمد' کے اشعار ملاحظہ کریں۔

یا خدا تو خود سے ہے، تجھ سے کہیں کوئی نہیں
تو جہاں حاضر نہ ہو ایسی زمیں کوئی نہیں
تیرے لیے تعریف سب، تیرے لیے تسبیح سب
بے جان ہے تمثیل سب، بے سود ہے تشبیہ سب
ابن آدم کی زباں قاصر تری تعریف سے
تیری عظمت کے لیے بے معنی ہے تشریح سب

نعت بھی اچھوتی ہے۔ ملاحظہ کریں۔

نہیں کوئی تصور اب کہ کوئی اور آئے گا
تیرے جیسا خدا کا پھر کوئی پیغام لائے گا
خدا نے تجھ کو بچپن سے ہی کچھ ایسا بنایا تھا
کہ جس نے بعد میں جبرئیل سے قرآن پایا تھا

حب الوطنی اور اپنی زمین سے والہانہ محبت کا اظہار بھی ان کی نظموں سے نمایاں ہے۔

پرچم جمہور کو قومی ترانوں کا سلام
صبح آزادی تجھے ہم جاں نثاروں کا سلام
کہا کرتے ہیں بے شک لوگ سنتا ہو غزل جب بھی
سفر لمبا بھی ہو پھر بھی عظیم آباد کو جائیں

موصوف فطری طور سے ترقی پسند، حقیقت پسند شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں برائیوں اور ناانصافیوں کے خلاف بہت پائیدار اور مضبوط آواز سنائی دیتی ہے۔ فطرت کے مختلف موضوعات پر نظمیں تحریر کی ہیں۔ ان کی نظم نگاری کا بڑا حصہ شخصیات پر مبنی ہے۔ مختلف علمی وادبی، روحانی و مذہبی، سماجی وسیاسی شخصیات پر ان کے شایانِ شان نظمیں تخلیق کی ہیں۔

مرحوم قاضی مجاہد الاسلامؒ کی وفات پر لکھی نظم 'ایک تارا' میں انھوں نے قاضی صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

سب سے حسین تھا وہ تاروں کی انجمن میں
تھا لاجواب سب میں وہ اپنے بانکپن میں
تاروں کی انجمن سے جب آ گیا چمن میں
رہتا تھا ہر گھڑی وہ جذبات کے گگن میں

بہار کے مشہور ومعروف اخبار روزنامہ قومی تنظیم کے بانی ومدیر سید عمر فرید کو انھوں نے اس طرح یاد کیا ہے۔

زندہ و پائندہ ہے نقشِ شرافت آپ کی
چھائی ہوئی ہے ہر طرف بوئے نفاست آپ کی
آپ ہی کا علم ہے، آپ ہی کا ہے کمال
کر رہی ہے روشنی اردو صحافت آپ کی

موصوف کے یہاں سوانحی طرز بیان بھی ہے۔ نظم 'اپنی کہانی اپنی زبانی' میں موصوف نے اپنی داستانِ زندگی درج کی ہے اور اس کے نشیب وفراز کو بیان کیا ہے۔ نظم میں طوالت کے باوجود اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی اور مطالعے کی روانی برقرار رہتی ہے۔ جس طرح موصوف کی نظموں میں موضوعاتی سطح پر رنگارنگی ملتی ہے اسی طرح ان کی غزلوں میں بھی زندگی کے مختلف حالات وکیفیات مثلاً خوشی وشادمانی، رنج والم، احساسِ خودی، پیغام برائے ملت، بے ثباتی عالم، مادیت کی حقیقت جیسے حساس اور اہم موضوعات پر اشعار ملتے ہیں۔ موصوف نے غزل کی کلاسکیت سے فیض اٹھایا ہے مگر موضوعاتی سطح پر کوئی سمجھوتہ نہیں کیا ہے۔ مزید یہ کہ منفرد اندازِ بیان نے ان کی غزل میں سحر انگیزی کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ ملاحظہ کریں یہ اشعار۔

موصوف نے اپنی شاعری کے ذریعے قلب مسلم کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے اور انہیں حالات حاضرہ سے آگاہ کیا ہے۔ موصوف کی فکر علامہ اقبال سے جاملتی ہے۔ شاعر کی نظر میں خودی انسان کے لیے بہت ضروری ہے۔ انہوں نے زندگی کے مختلف حالات وکیفیات کو شعری پیکر میں ڈھال دیا ہے جہاں حقیقت نگاری بھی ہے اور فنکاری بھی۔

ہو جس میں خودی کا مقالہ نہیں
میرے ذوق کا وہ رسالہ نہیں
کتابِ خودی اس کے بس کی نہیں
نگاہوں میں جس کی اجالا نہیں
کس نے بڑھا دیا ہے وہاں حسنِ کہکشاں
تارا ہے اس زمیں کا گیا ہے جو آسماں پر
نشانے لے چکے کتنے مری پرواز فطرت کے
وہ چاہیں آزمانا تو انھیں بھی آزمانے دو
نہیں بیکار ہیں ہرگز میرے قلب ودست وپا
ابھی کچھ ہوش باقی ہے ذرا کچھ جوش آنے دو
بہے ہیں خون کتنی بار یونہی بے سبب یارو
کبھی راہِ خدا میں بھی لہو اپنا بہانے دو
تقاضے دن کے سمجھو اور ہوا کے رخ کو پہچانو
دلِ مسلم میں گرمی آئے کچھ ایسے ترانے دو

موصوف نے اپنی شاعری کے ذریعے قلب مسلم کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے اور انھیں حالاتِ حاضرہ سے آگاہ کیا ہے۔ موصوف کی فکر علامہ اقبال سے جاملتی ہے۔ شاعر کی نظر میں خودی انسان کے لیے بہت ضروری ہے۔ انھوں نے زندگی کے مختلف حالات وکیفیات کو شعری پیکر میں ڈھال دیا ہے جہاں حقیقت نگاری بھی ہے اور فنکاری بھی۔ ملاحظہ کریں یہ اشعار۔

دولت کیا ہے، کیا ہے عشرت دنیا والے جانے ہیں
لاکھ چمک سے بجلی چمکے پل بھر میں مٹ جائے ہے

عجب ہے یہ دنیا عجب سی ادا ہے
کوئی محوِ عشرت کوئی غمزدہ ہے

'مجموعہ کمالات' (جو ابھی زیر اشاعت ہے) کے علاوہ موصوف نے علمی واخلاقی، دینی، ملی، سماجی، سیاسی اور غیر سیاسی موضوعات پر مضامین تحریر کیے ہیں۔ ان کے مضامین کے دو مجموعے بعنوان (1) نثری مجموعہ کمالات اور (2) دینی مجموعہ کمالات (منتخب ترجمہ قرآنی آیات) ابھی زیر ترتیب ہیں۔ موصوف کا انتقال 12 جولائی 2014 مطابق 13 رمضان 1435ھ میں پھلواری شریف میں ہوا۔

■

Dr. Shazia Kamal
Guest Asst Professor (Urdu)
B R A, Bihar University
Muzaffapur -842001 Bihar)

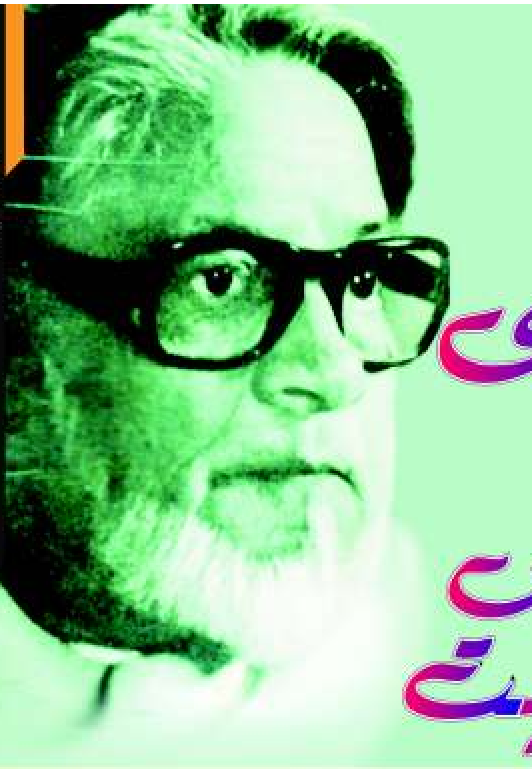

جاوید احمد

نذیر بنارسی کی شاعری میں عصری حسیت

نذیر بنارسی کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے ایک بات پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے شعری تخیل کا مرکز و محور عام انسان کی زندگی، زبان اور ماحول سے بیحد متاثر ہے اور انھیں کے حالات و واقعات کو انھوں نے ادبی زبان کا جامہ پہنا کر پیش کیا ہے، لیکن اس سے بھی بڑھ کر ان کے یہاں کیف و انبساط سے پر اس رومانی شاعری سے استفادے کا رجحان ملتا ہے، جس کا ایک زمانے میں حقیقت سے بڑا گہرا تعلق رہا ہے۔ اس قسم کے خیالات عام مشاعروں کی کامیابی کے ضامن ہیں اور عام لوگوں کے اردو زبان کی شیرینی سے متاثر ہو کر اس کی جانب توجہ کرنے اور اسے سیکھنے کے رجحان کی آبیاری میں بھی اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ لیکن ان کے درمیان ان کے ذخیرۂ شاعری میں ایسے اشعار کی کثرت بھی ہے جو نہ صرف ان کے گہرے ادبی شعور کے غماز ہیں بلکہ عصری احساسات اور زمانے کی رو کو دیکھتے ہوئے موجودہ حالات اور مستقبل کے امکانی حالات سے بھی زمانے کے ذہن کو متوجہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ زبان کے اتنے رخوں کو ایک ساتھ برتنا زبان کی ماہیت اور اس کے لوازمات پر ان کی دسترس کے ضامن ہیں۔ شعری گفتگو ذاتی ہو یا شخصی، نذیر بنارسی نے ابہام کو ان اشاراتی زاویوں کے طور پر استعمال کیا ہے جن کی گہرائی اور گیرائی سے معنویت کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ اس کے لیے انھوں نے فلسفے کی معنوی پیچیدگیوں سے کام نہیں لیا ہے بلکہ مادیت کے سیاق میں منتخب موضوعات کے تخلیقی اظہار کے ضمن میں ان ادیبوں میں شامل ہیں جن کے بارے میں احتشام حسین نے لکھا ہے:

''مادی نظریے پر عام طور سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس پر عمل کرنے والے ادب میں ادبیت کے بجائے فلسفہ، تاریخ، معانیات اور دوسرے عناصر کی جستجو کرتے ہیں۔ یہ درست نہیں ہے کیوں کہ ادب محض فنی خصوصیات کا مجموعہ نہیں ہے، اس سے کچھ زیادہ ہے۔ پھر نئی فنی خصوصیات خود تاریخی حالات اور سماجی ارتقا سے وجود میں آتی ہیں۔''

(بحوالہ، جدید اردو تنقید، اصول و نظریات، شارب ردولوی، ص، 369)

دلیل کے طور پر نذیر بنارسی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

لڑکے آپس میں مریں، اور وطن پر نہ مریں
اس قدر خون مگر خون شہیداں کی کمی
مٹ گیا تھا اختلاف باہمی کل رات کو
زندگی تھی زندگی در زندگی کل رات کو
تھی کسی کی ہر نظر، پہلی کرن، خورشید کی
ہو رہی تھی صبح کی سی روشنی کل رات کو
رہ گئی ہچکی سی لے کر، فکر دنیا، اے نذیر
غم کو بھی کرنا پڑی تھی خودکشی کل رات کو
زندگی بھر چل کے ہم آئے ہیں منزل کی طرف
دو قدم منزل کو بھی اب چل کے آنا چاہیے

جیسا کہ اشعار سے ظاہر ہے کہ یہ زندگی کے مختلف رنگ کی ترجمانی کر رہے ہیں، اور ہر ایک میں نذیر بنارسی کی علمی لیاقت اور زبان کو برتنے کے مختلف زاویوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ پہلا شعر عصر حاضر کے غالباً سب سے پیچیدہ مسئلے، جو کہ ہندوستانی معاشرے کے لیے ناسور کی شکل اختیار کر گیا ہے، کی آئینہ داری کے ساتھ ساتھ اس کے غالب آنے کے خطرناک نتائج کی جانب بھی ہماری توجہ منعطف کرتا ہے۔ دوسرا شعر زندگی کی تکرار کے ساتھ رومانی چاشنی میں مزید اضافہ کرتا ہے۔ تیسرا شعر تضاد کی بہترین مثال ہے۔ چوتھا شعر عام رومانی شعری روش کے بالکل الٹ ہے۔ غم کے بھی خودکشی کرنے کا موضوع نیا نہ سہی لیکن اس کو جس طرح نذیر نے رومانیت کے لمحات کے ساتھ منسلک کر کے نیا معنوی جامہ پہنایا ہے، میرے خیال میں بے مثال ہے۔ آخری شعر مجھے بانی کے اس شعر کی یاد دلاتا ہے:

عجیب مرحلہ تھا، بھیڑ سے گزرنے کا
اسے بہانہ ملا مجھ سے بات کرنے کا

یہ خودداری یا اپنے وجود کے احترام کا جذبہ بانی کے اس شعر کی بہ نسبت موضوع کے اعتبار سے نذیر بنارسی کے مندرجہ بالا آخری شعر میں زیادہ وسیع کینوس میں نظر آتا ہے۔ ممکن ہے ان کا شعری موقف رومانیت تک محدود ہو، لیکن اصل میں یہ بھی ہے کہ الفاظ کے اندر جو معنی پوشیدہ ہوتے ہیں، اس کے مختلف ابعاد کی ترسیل ہی مختلف معنوی جہات کی ضامن ہوتی ہے۔ شاعر کی شعری نفسیات شعر کہتے ہوئے بھلے ہی کسی ایک موضوعی دائرہ کار میں رقص کرے، لیکن خیال اور معنی کی امکانی وسعت سے اس کو الگ کرنا ناممکن ہے۔ ہارڈنگ نے لکھا ہے۔

اگر ہم شاعر سے یہ پوچھتے ہیں کہ وہ کس شے کی ترسیل کر رہا ہے تو گویا ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس کے پاس پہلے سے کوئی خیال یا معنی تھا، جس کو اس نے نظم کے الفاظ میں ترجمہ کر دیا۔ حالانکہ جو بات اسے کہنا تھی، اس کا وجود ہی اس وقت تک نہ تھا جب تک وہ کہی نہیں گئی تھی۔ کوئی

سوچا ہوا خیال جو خود نظم نہ ہو،لیکن ہو یہ ہو نظم کی طرح ہو،ناممکن تھا... ایک ہی خیال کے لیے ایک سے زیادہ لسانی اسلوب نہیں ہوسکتا۔ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی ایسی عینی لسانی شکل ہو جو درستی اور کفایت کے ساتھ اس سب کو ظاہر کردے، جو خیال کے اندر چھپا ہوا ہے۔

(بحوالہ شعر، غیر شعر اور نثر، از شمس الرحمٰن فاروقی، ص 95)

نذیر بنارسی نے رومان کے مخصوص الفاظ کے لسانی برتاؤ میں جدید معنوی امکانات بھی تلاشے ہیں۔ان کے بعض اشعار ایسے ہیں جو زمان و مکاں کی حدود سے ماورا ہیں۔یعنی ان کو کسی بھی زمانے کے آئینے میں پرکھا جاسکتا ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

بدلتا ہے ہر دور کے ساتھ ساقی
یہ دنیا ہے کتنی بڑی انقلابی
کوئی لا سکو تو لاؤ،مرا وہ حسیں زمانہ
جسے میں نے کچھ نہ سمجھا،جسے میں نے کچھ نہ جانا
یہ مجبوری سی مجبوری،یہ ناچاری سی ناچاری
کہ تنہا ہو نہ سکنے پر بھی تنہا ہو گئے ہم تم
ایسی سحر کہ جس میں کوئی جلوہ گر نہ ہو
وہ رات کا کفن ہو،ہماری سحر نہ ہو
بچا لو وحشت دیوار و در سے
کھنڈر بہتر ہے غیر آباد گھر سے

چوتھے شعر میں جلوہ گر کا معنی اگر خواہش یا آرزو لے لیا جائے،جس کے پورا ہونے کے امکان میں تذبذب ہو تو اس شعر کے معنوی امکانات بہت وسیع ہو جاتے ہیں۔اس قسم کے اشعار جہاں تنہا احساسات کی آئینہ داری کرتے ہیں وہیں اجتماعیت کے عناصر بھی رکھتے ہیں۔جدیدیت کے رجحان کی ناکامی یا اس کے تاثر کے جلد زائل ہوتے چلے جانے کا ایک سبب یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ پیچیدہ الفاظ برتنے کی زبردستی کی شعوری کوشش نے اس کے اسرار و رموز کی معنویت کا وہ اثر برقرار نہ رہنے دیا جو ان کا خاصہ تھا۔باقر مہدی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''جدید شاعری کا ڈیلیما یہ ہے کہ اس نے مسائل کو رد کرکے جو تخلیقی اسرار و رموز کی تلاش کی،وہ اسے دوسرے جزیروں تک نہیں لے گئی،یعنی تخلیق کے لیے تشکیل کیسے کی جائے؟ پر غور نہیں کیا گیا بلکہ ذات کو ہی سرچشمہ شعر و ادب سمجھ لیا گیا اور پھر ان پر تکیہ کرلیا گیا۔''

(باقیات باقر مہدی،مرتب،یعقوب راہی،ص،134)

ظاہر ہے کہ نذیر بنارسی کے یہاں اسرار و رموز کی جستجو کا وہ رجحان نہیں ہے اور تخلیق کی تشکیل کا وہ اعلیٰ معیار جو کہ پوری دنیا کی بوطیقا میں شامل ہے یا ہوسکتا ہے،نذیر بنارسی کے یہاں موجود ہے۔ان کے یہاں ماحول اور حالات کے وہ عناصر سرچشمہ شعر و ادب ہیں جو تخیل کو واقعاتی صورت میں تبدیل کر کے بیک وقت مختلف مراکز میں نمایاں ہوتے ہیں۔اشعار ملاحظہ ہوں۔

اپنے سر ہر اک مسافر کی بلا لینے کے بعد
ناخدا ڈوبا، مگر بیڑا بچا لینے کے بعد
اپنا اپنا زور بازو آزما لینے کے بعد
سب کنارے ہوگئے طوفاں اٹھا لینے کے بعد
آپ سے کس نے کہا تھا کہ سہارا دیجیے
آپ نے ڈوبنے والوں کو ابھرنے نہ دیا
کچھ تازہ حوصلے دیے،کچھ تازہ ولولے
طوفاں نے زندگی کو بھی طوفاں بنا دیا
ہر گھڑی چپ بھی رہنا کچھ اچھا نہیں
جانے کتنے یوں ہی بے زباں ہو گئے
بڑھتے جاتے ہیں زمانے میں مسیحا جتنے
زندگی اتنی ہی بیمار نظر آتی ہے

ان اشعار کا اطلاق بھی دنیا کی کسی قوم،ملک اور حالات پر ہوسکتا ہے جہاں یہ مسئلے یا واقعات موجود ہیں۔جیسے کہ پہلا شعر کسی بھی ملک کے رہنما یا لیڈر جس نے قوم اور ملک کے لیے قربانی دی ہو،کی شخصیت پر صادق آتا ہے۔اسی طرح دوسرے اشعار بھی ہیں جو آج کے مسائل کی مختلف صورتوں میں آئینہ داری کرتے ہیں۔نذیر بنارسی کے اشعار کی آفاقیت کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ان کے شعری تخیل ان کے بعد شاعری کرنے والوں کے یہاں بھی ان محسوسات کے ساتھ مل جاتے ہیں جو نذیر بنارسی نے بیان کیے ہیں۔مندرجہ بالا پانچویں شعر کو ذہن میں رکھتے ہوئے ڈاکٹر زبیر فاروق العرشی جو کہ پہلے صاحب دیوان عرب شاعر ہیں اور دبئی (متحدہ عرب امارات) ان کا وطن ہے،کا شعر پیش ہے۔

چپ رہنے کی عادت تجھے پتھر نہ بنا دے
تو اب در و دیوار سے گفتار کیا کر

زبیر فاروق کے یہاں صیغۂ واحد کو مرکز بنا کر جو بات کہی گئی ہے اس سے بہت پہلے نذیر بنارسی کے یہاں وہی بات دلیل کے ساتھ جس کا سرا مختلف تاریخی شواہد میں بھی تلاش کیا جاسکتا ہے،کو اپنے احاطے میں لیے ہوئے ہے اور اس کا تاثر بھی اجتماعی ہے۔آخری شعر کے ماحول میں نذیر کی شعری شخصیت کاڈویل کے اس بیان کی مماثل نظر آتی ہے۔وہ لکھتا ہے:

''وہ (کوئی باشعور شخص) معاشی زندگی کے ارتقا کے تسلسل میں ماحول سے جدوجہد کرتے ہوئے اور عملاً اس (جدوجہد) کی تعبیر کرتے ہوئے اپنے آپ کو شعوری طور پر ماحول سے الگ کرتا ہے۔جب انسان بیرونی حقیقت کی نوعیت کو اقتصادی پیداوار کی مسلسل کوششوں کے ذریعے گرفت میں لے لیتا ہے تو ماحول اور اپنی ذات کا باہمی امتیاز اس کی سمجھ میں آجاتا ہے کیوں کہ اب وہ ان کی وحدت کو بھی سمجھتا ہے۔وہ یہ جان لیتا ہے کہ انسان ایک مشین کی طرح (سماجی) ضرورت کا تابع بھی ہے اور کائنات کے تسلسل میں (اس سے ہم آہنگ) آزادانہ ارتقا کا تماشہ (تحیّر) بھی۔''

(بحوالہ جدیدیت کی فلسفیانہ اساس، از شمیم حنفی، ص 15-114)

اس قبیل کے متعدد اشعار ان کے یہاں موجود ہیں۔ان کے علاوہ انھوں نے حسن و عشق کے مثبت اور منفی پہلوؤں کو پیش کرتے ہوئے ان میں سے بیش تر میں اپنی فنکاری کا ثبوت دیا ہے۔اس ضمن میں چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

عمر بھر کی بات بگڑی،اک ذرا سی بات میں
ایک لمحہ زندگی بھر کی کمائی کھا گیا
تمھیں چند قطرہ اشک بھی،کیے پیش جس کے جواب میں
وہ سلام نیچی نگاہ کا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
اک نظر ان کو دیکھنے کے لیے
کی ہے کتنوں نے دوستی ہم سے
بخشا اسی کو درد جو شایان درد تھا
دل بھی دیا خدا نے تو پہچان کر دیا
کچھ روز ہم بھی تارک دنیا و دیں رہے
انجام یہ ہوا کہ کہیں کے نہیں رہے
آسماں سے اتارا گیا
زندگی دے کے مارا گیا

یہ وہ اشعار ہیں جن میں دوسرے معنوی امکانات بھی تلاشے جاسکتے ہیں،لیکن میرے خیال میں غالب موضوع حسن و عشق کی فضا کے ارد گرد ہی سفر کرتا ہے۔وزیر آغا نے اردو غزل کے حوالے سے لکھا ہے:

''غزل بت پرستی کی ایک صورت بھی ہے اور بت شکنی کا ایک عمل بھی۔اس میں جزو کی بے قراری بھی ہے اور کل کا تھپک کر سلا دینے والا ہاتھ بھی۔غزل میں ان دونوں پہلوؤں کا وجود ضروری ہے۔جہاں ایسا نہیں ہوتا اور وہ کسی ایک پلڑے کی طرف واضح طور پر جھک جاتی ہے تو اس سے غزل کا مزاج بری طرح متاثر ہوتا ہے۔اردو غزل کے تدریجی ارتقا میں ایسے ادوار بھی آئے ہیں، جن میں غزل توازن کی اس صفت کو برقرار نہیں رکھ سکی اور اسی لیے خالص بت پرستی یا خالص تخیل پسندی کی رو میں

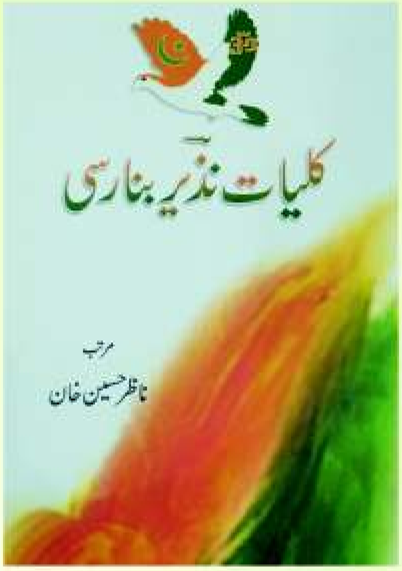

بہہ گئی ہے، تاہم بحیثیت مجموعی اس نے اپنی بنیادی صفت سے انحراف نہیں کیا ہے۔" (معنی اور تناظر، از، وزیر آغا، ص 249)

بلا شبہ یہ توازن نذیر بنارسی کے یہاں موجود ہے۔ کلاسکی اور جدید طرز فکر میں انھوں نے تحریک آزادی اور وطن پرستی کے موضوع پر بھی شعر کہے ہیں۔ ان کے علاوہ شہر بنارس جس کو 'یاران دلبراں' بھی کہا جاتا ہے، کی خصوصیات کا محاکمہ کرتے ہوئے پوری غزل اور دوسری غزلوں میں اشعار موجود ہیں۔

کسی پہلو سے جب دنیا ہمیں زندہ نہ چھوڑے گی
وطن ہی کے لیے ہم سر کٹا لیتے تو اچھا تھا
اپنے آنسو پونچھ لے اے مادر ہندوستاں
اس لٹی حالت پہ بھی سب کچھ لٹا سکتے ہیں ہم
اس پرانی بے وفا دنیا کا رونا کب تلک
آیئے مل جل کے اک دنیا نئی پیدا کریں
دوسروں سے کب تلک ہم پیاس کا شکوہ کریں
لاؤ تیشہ، ایک دریا دوسرا پیدا کریں
ایسا بھی ہے بازار بنارس کی گلی میں
بک جائیں خریدار بنارس کی گلی میں
ہشیاری سے رہنا نہیں آتا جنھیں اس پار
ہو جاتے ہیں اس پار بنارس کی گلی میں

اس کے علاوہ بھی نذیر بنارسی نے سماج کے ایک بہترین نبض شناس کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کے یہاں موجودہ معاشرے سے بیزاری کا رجحان نہیں ملتا اور نہ ہی اپنی انفرادیت کے کھو جانے کا جذبہ انھیں پریشان کرتا ہے۔ وہ در اصل کثرت میں وحدت اور وحدت میں کثرت کے قائل ہیں۔ ان کے یہاں دونوں صورتیں یکساں اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کا فن کبھی اذیتوں سے نجات کی کوشش کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے تو کبھی زندگی کی وحشت خیزی کی تلافی کے عناصر کی صورت میں۔ اور ان کے درمیان زندگی کے دوسرے شعبہ ذات مثلاً دینی، تہذیبی، مادی، سیاسی وغیرہ گردش کرتے ہیں۔ ان مختلف موضوعاتی محوروں کے اسباب میں سے ایک یہ بھی ہے کہ منزل کا نشاں ہنوز دھندلا ہے، جو مختلف نجات کے راستوں کی جانب لے جاتا ہے۔ میکس شلر نے کہا ہے۔

"ہم پہلی نسل ہیں، جس میں انسان آپ اپنے لیے متنازعہ بن گیا ہے۔ جس میں اسے یہ علم نہیں رہ گیا ہے کہ حقیقتاً وہ کیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ وہ کچھ نہیں جانتا۔"

(بحوالہ، جدیدیت کی فلسفیانہ اساس، از شمیم حنفی، ص 180)

اور اسے جانتے ہوئے بھی نہ جاننے اور نہ جانتے ہوئے جاننے کی مختلف صورتوں کا اظہار جب نذیر بنارسی اپنے مخصوص انداز میں کرتے ہیں تو اس پورے سیاق میں آڈن کے یہ الفاظ یاد آتے ہیں:

"زبان کی ماہیت پر کوئی غور وفکر اس فرق کو سامنے رکھے بغیر شروع نہیں کی جا سکتی جو الفاظ کے اس طریقۂ استعمال میں، جب ہم انھیں ذاتی گفتگو کے لیے کام میں لاتے ہیں... جب ہم واقعی گفتگو کرتے ہیں تو ہمارے پاس ہمارا حکم بجا لانے پر تیار الفاظ، موجود پہلے سے نہیں ہوتے، بلکہ ہمیں انھیں ڈھونڈنا پڑتا ہے اور جب تک ہم بات کہہ نہیں لیتے۔ ہمیں ٹھیک ٹھیک پتہ نہیں ہوتا کہ ہمیں کیا کہنا ہے۔"

(بحوالہ شعر غیر شعر اور نثر، از شمس الرحمن فاروقی، ص 94)

میرے خیال میں زبان کی ماہیت کے ساتھ ساتھ تخیل کی ماہیت اور مکمل ادائیگی پر بھی صادق آتے ہیں۔ نذیر بنارسی کے یہاں حقیقت کی عکاسی کے بیان کی دوسری پرتیں بھی ہیں جن میں تغزل کے ساتھ سنجیدگی اساطیری، دیو مالائی، تاریخی اور فلسفیانہ عناصر بھی شامل ہیں۔ اشعار

جو اکیلے ہنسے، وہ پاگل ہے
صرف اپنی خوشی، خوشی تو نہیں
اک مسافر اس طرح سویا ہے تیرے در کے پاس
ایک پتھر سر کے نیچے، ایک پتھر سر کے پاس
تم مبارک باد کے قابل ہو اے اہل جنوں
تم بگڑتے بھی گئے تو کارواں بنتا گیا
مرے خیال نے پہنچا دیا ہے کس کے پاس
شکنتلا کی انگوٹھی کی طرح گم ہیں حواس!

زمانہ ہو گیا، بن سائیں سائیں کرتا ہے
تمھارے بعد کسی کو نہ مل سکا بن باس
اس کے جینے کی داستان نہ پوچھ
سانس بھی لے کے جو ادھار چلے

اگر نذیر بنارسی کے ان اشعار کا جائزہ نہ لیا جائے جو کہ ان کے مندرجہ بالا تمام اشعار کے بالمقابل ان کی شاعرانہ شخصیت پر اگر منفی اثر نہیں ڈالتے تو ان کے وقار میں کسی قسم کا اضافہ بھی نہیں کرتے، تو مضمون مکمل نہ ہوگا۔ مجھے لگتا ہے کہ انھوں نے اس قسم کے اشعار عام مشاعروں کے قارئین کے جذبات اور ان کی ذہنی سطح کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہے ہیں۔ اس قبیل کے بھی چند اشعار ذیل میں درج ہیں۔

تم ساتھ میں لے کر چلنا بھی چاہو تو میں شاید چل نہ سکوں
پابند ہوں اب آزاد کہاں، مجبور ہوں، خود مختار نہیں
بہار آئی، سبزے کھلے دھانی دھانی
پھر انگڑائی لینے لگی ہے جوانی
مرے شانے پر یہی زلف تھی، جو ہے آج مجھ سے کھنچی کھنچی
مرے ہاتھ میں یہی ہاتھ تھا، تمھیں یاد ہو، کہ نہ یاد ہو
کلیوں میں مسکرا کے پھولوں میں کھلکھلا کے
یہ کون جھانکتا ہے، پردہ اٹھا اٹھا کے
نذیر آؤ رو لیں گلے مل کے ہم تم
نہ جانے کہاں پھر ملاقات ہوگی
کہیں دیکھا ہے میں نے تم سا حسیں
سوچتا ہوں کہ تم وہی تو نہیں

اس قسم کے مزید اشعار بھی نذیر بنارسی کی شاعری میں تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ ان میں بھی ایک خوبی یہ ہے کہ رومانی اور سماجی سطح پر یہ ان موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں جن کی قدر و قیمت شعبہ زندگی میں اپنی انفرادیت رکھتی ہے، خواہ وہ انسان کے کتنے ہی قدیم روایتی احساسات کی ترجمانی کریں، انسان ان سے ازل سے ابد تک نہ الگ ہو سکتا ہے اور نہ فرار حاصل کر سکتا ہے۔ جب مجموعی طور پر ان کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے، تو ان کی قدر و قیمت قارئین کے دلوں میں خود نذیر بنارسی کے اس شعر کے عین مطابق جگہ بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ وہ شعر یہ ہے۔

وقت کی قدر کرو، وقت کی قیمت سمجھو
وقت ہوں، وقت نہیں لوٹ کے پھر آنے کا

■

Jawed Ahmad (Javed Anwar)
Editor 'Tahrik-e-Adab'
Research Scholar, Dept of Urdu, BHU
Varanasi - 221005

محمد اویس سنبھلی

سعادت علی صدیقی

اردو زبان و ادب کا خدمت گذار

اردو زبان کی تعلیم و ترقی کے لیے بے لوث خدمات انجام دینے والوں کی کوئی فہرست ڈاکٹر سعادت علی صدیقی کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ وہ تھے تو لکھنؤ کے مگر سنبھل میں انھیں درس و تدریس کا فریضہ انجام دینے کا موقع ملا۔ نوکری تو کرنا آسان ہے مگر نوکری کو مشن بنانا اور اٹھتے بیٹھتے اس فکر میں رہنا کہ لوگ نہ صرف تعلیم یافتہ ہو جائیں بلکہ اردو زبان ان کے رگ و پے میں سرایت کر جائے یہ ایک مشکل کام تھا مگر یہ کام سعادت علی صدیقی نے نہایت دلجمعی اور حوصلہ کے ساتھ اس طرح انجام دیا کہ اب سنبھل کی ادبی تاریخ ڈاکٹر سعادت علی صدیقی کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔

سعادت صاحب جوانی کی عمر میں بلڈ شوگر کے خطرناک مرض میں مبتلا ہو گئے تھے۔ عرصہ تک لکھنؤ میں علاج ہوتا رہا۔ علالت کا سلسلہ چلتا رہا اور ایسے وقفے بھی آتے رہے کہ مرض اپنی انتہا کو پہنچ جاتا اور جسم پر کپڑا پہننا بھی محال ہو جاتا اور کبھی کبھی تو زندگی خطرے میں نظر آتی۔ ذرا طبیعت سنبھلی تو لکھنے پڑھنے کا کام شروع کر دیتے۔ اپنے دوستوں اور نیازمندوں کی کسی تحریر یا تصنیف سے متاثر ہوتے تو اپنے تاثر کی اطلاع دیتے۔ خوب اچھی طرح یاد ہے 13 فروری 1994 کی وہ صبح جب میں اپنی کلاس کرنے کالج کے لیے روانہ ہو رہا تھا کہ ہمارے ایک عزیز محمد ناظم ایڈووکیٹ نے یہ اطلاع دی کہ سعادت صاحب کا انتقال ہو گیا۔

ایک ذہین، مخلص اور غیر معمولی صلاحیتیں رکھنے والی شخصیت ہم سے چھن گئی۔ سعادت صاحب کے انتقال پر پورے ملک کے ادبی حلقوں میں کہرام مچ گیا اور ہر اس شخص نے ان کا ماتم اور سوگ منایا جو ان کی بے ریا زندگی، دلکش شخصیت اور منفرد ادبی حیثیت کا قائل تھا۔ 'ہماری زبان' دہلی، 'جنت نشاں' مراد آباد اور ماہنامہ 'فروغ اردو' لکھنؤ نے بساط بھر اس جواں مرگ ادیب کو اپنے اپنے 'سعادت علی صدیقی نمبر' کی صورت میں خراج عقیدت پیش کیا۔ 'ہماری زبان' کے ایڈیٹر خلیق انجم نے سعادت علی صدیقی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا تھا:

''سعادت علی صدیقی مرحوم ان چند لوگوں میں ہیں جنھوں نے خلوص دل سے اردو زبان کی خدمت کی ہے۔ وہ انتہائی مخلص، مہذب، شریف النفس اور منکسر المزاج انسان تھے.... لاکھوں دلوں میں ان کے لیے جگہ تھی۔ یہ شہرت داؤ پیچ اور سازشوں کے ذریعہ حاصل کی ہوئی نہیں تھی بلکہ نتیجہ تھی سعادت کی لگن، خلوص، بے لوث اور انتھک خدمات کی۔''

('سعادت علی صدیقی نمبر' ہفت روزہ ہماری زبان، 8 مارچ 1994)

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی کے چھوٹے بھائی اور سعادت علی صدیقی مرحوم کے چچا محترم شفاعت علی صدیقی لکھنؤ کی جانی پہچانی شخصیت تھے۔ لکھنؤ کے آل انڈیا ریڈیو کے پروگرام ڈائریکٹر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ سعادت صاحب ان کے بڑے چہیتے بھتیجے تھے۔ ماہنامہ فروغ اردو نے جب 'سعادت علی صدیقی نمبر' نکالنے کا اعلان کیا تو اس کی ذمہ داری شفاعت صاحب کو دی گئی۔ شفاعت صاحب نے بڑی محنت اور محبت سے اس نمبر کو تیار کیا۔ ایک چچا نے اپنے بھتیجے کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے خون میں انگلیاں ڈبو کر یہ چند سطریں قلم بند کیں:

28 جنوری 1987 کو میری اکلوتی بیٹی کا انتقال ہوا تھا۔ سات سال گذر جانے کے باوجود اس حادثہ کا غم تازہ تھا اور زخم ہرا۔ سعادت کی موجودگی اس زخم کے لیے مرہم کا کام کرتی تھی لیکن مشیت کے معاملات میں انسان کتنا مجبور ہے کہ میں اور برادر مکرم ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی بیٹھے ہی رہ گئے اور موت ہمارے بازو کی قوت، ہماری آنکھوں کے نور، لائق اور با کمال فرزند کو اٹھا لے گئی۔ مرنا برحق ہے، جو پیدا ہوا ہے اسے ایک نہ ایک روز تو مرنا ہی ہے مگر سعادت کی وفات، فرمانبرداری، منکسر المزاجی، سعادت مندی اور خوش اخلاقی کا مرثیہ ہے۔ اگر ہمیں اللہ تعالی کی رحمت و مصلحت پر یقین نہ ہوتا اور اللہ صبر و برداشت کی طاقت نہ عطا فرماتا تو اتنا بڑا حادثہ جھیل جانا ہم لوگوں کے لیے ممکن ہی نہ تھا.......

(اداریہ 'سعادت علی صدیقی نمبر' ماہنامہ فروغ اردو، 1994)

راقم الحروف کے والد ماجد جناب نظیف الرحمن سنبھلی اور ڈاکٹر سعادت علی صدیقی کا تعلق خاطر کچھ خاص ہی تھا اور واقعہ یہ ہے کہ والد صاحب کو بھی ان سے جو فکری مناسبت اور قلبی تعلق تھا وہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے ایک شفیق استاد اور عزیز دوست سے ہونا چاہیے تھا۔

سعادت علی صدیقی کی چھوٹی بہن ڈاکٹر پروین شجاعت نے 'وہ جن کی یاد سے آباد دل کی بستی ہے' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا۔ اس مضمون میں انھوں نے بھائی صاحب مرحوم کے کارناموں اور اپنی یادوں کو سمیٹتے ہوئے لکھا ہے:

''.....انگریزی زبان کے مشہور شاعر رابرٹ فراسٹ کی مشہور لائنیں ہیں:

"The woods are lovely dark and deep but I have promises t o keep and miles to go before I Sleep and miles to go.

یعنی دنیا میں آ کر مجھے بہت سے کام پورے کرنے ہیں اور ایک لمبی مسافت طے کرنی ہے، اس سے قبل کہ مجھے ابدی نیند آ جائے۔

بھائی صاحب یعنی ڈاکٹر سعادت علی صدیقی کے

لیے رابرٹ فراسٹ کی یہ لائنیں لفظ بہ لفظ صحیح معلوم ہوتی ہیں۔ شاید انہیں اس بات کا علم تھا کہ ان کے پاس اپنی مادری زبان اردو کی خدمت کرنے کے لیے وقت بہت کم ہے اور شاید اسی لیے قدرت نے انھیں سچے کوئلے کی طرح سلگتے رہنے کا ہنر دے دیا تھا۔ نہایت کم عمری سے ہی وہ اپنی زبان و ادب کی خدمت میں جٹ گئے تھے۔ 8 سال کی عمر ہی میں انھوں نے قلم تھام لیا اور کاغذ کو اپنا کھلونا بنایا۔ اس عمر میں انھوں نے ایک ڈرامہ 'آموں کی دعوت' لکھا تھا جو 1953 میں رسالہ 'روشنی' میں شائع ہوا تھا....طالب علمی کے زمانے سے ہی انھوں نے سنجیدہ موضوعات پر مضامین لکھنے شروع کر دیے تھے.......اور اسی زمانے میں انھوں نے احمد ابراہیم علوی کے اشتراک سے ایک قلمی میگزین 'خوش رنگ' نکالا تھا۔ یہ پوری میگزین انھیں کی تحریر میں ہوتی تھی....اردو کے حقوق کی بازیابی کے لیے ان کی مخلصانہ جدوجہد کو فراموش نہیں کیا جاسکتا.... جب بھی اردو کی ترقی و بقا کے لیے کی گئی کوششوں سے متعلق کچھ تحریر کیا جائے گا تو اس میں اردو کے اس خدمت گزار کا نام ضرور شامل ہوگا۔ (ایضاً ص 137 مطبوعہ 2008)

سعادت علی صدیقی نے بچوں کے لیے بے شمار کہانیاں لکھیں۔ چور کی چالاکی، غرور کا سر نیچا، انوکھی چادر، رحم دلی، سانپ اور بینا، چاند میں خرگوش اور راجہ کا انصاف وغیرہ بچوں کے لیے لکھی گئیں بڑی دلچسپ کہانیاں ہیں۔

'چاند میں خرگوش' ڈاکٹر سعادت علی صدیقی کی کہانیوں کا مختصر مجموعہ ہے۔ یہ کہانیاں ان کی علمی و ادبی صلاحیتوں کی غماز ہیں۔ 'چاند میں خرگوش' آسان زبان میں لکھی گئی کہانی ہے۔ بچوں کو یوں بھی جانوروں سے متعلق کہانیاں بہت پسند آتی ہیں۔ یہ کہانی ایثار و قربانی کی بہترین مثال ہے۔

1965 میں لکھنؤ سے بچوں کا خوبصورت رسالہ 'ثانی' نکلتا تھا اس کے مدیر جناب معظم جعفری تھے۔ سعادت علی صدیقی اس کی مجلس ادارت میں شامل تھے۔ غیر ممالک کی مشہور کہانیوں کو اپنی زبان میں بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا۔ ان کہانیوں کو 1970 میں ادارہ ماہنامہ 'ثانی'، 'بچوں کی لوک کہانیاں' کے نام سے شائع کیا۔

بلاشبہ ہم سعادت علی صدیقی کے تحقیقی، تخلیقی اور تنقیدی کارناموں اور ادبی مشاغل کو حق وصداقت کے اعلیٰ معیار پر رکھ سکتے ہیں۔ ان کی علمی و ادبی سرگرمیاں اردو زبان وادب کے سرمائے میں بیش بہا اور مثالی اضافہ ثابت ہوں گی۔

ڈاکٹر سعادت علی صدیقی اردو تحریک سے وابستہ ایک سپاہی تھے۔ وہ اردو کو فنی اعتبار سے مالامال اور زندہ زبان سمجھتے تھے۔ انھیں اردو کی اہمیت اور اس کی افادیت اور مقبولیت کا اندازہ تھا۔ وہ اردو کی ترقی، ترویج و اشاعت کو اپنا مقدس فریضہ جانتے تھے۔ اردو زبان کے متعلق ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''اردو کی ہمہ گیر مقبولیت اور ہمہ جہت محبوبیت اس کے سیکولر کردار اور ترقی پسند افکار، جمہور نواز نظریات اور ہر دلعزیز مزاج کے باعث ہے۔ اس کا دامن ابتدا ہی سے وسیع تر رہا ہے۔ اس نے سب زبانوں، سب مذہبوں اور سب طریقوں کا فراخ دلی سے خیر مقدم کیا اور ان کے احساسات و جذبات کی ترجمانی خلوص و دل سے کی۔ 'مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا' اس کا ایمان رہا اور ''یا مسلمان اللہ یا برہمن رام رام'' اس کا کردار۔ اردو شاعر اور ادیب محبت ورواداری کے پیامبر اور پریت ملتی کے علمبردار ہیں۔ وہ اس دھرتی کے باسی ہیں جسے سارے جہاں سے اچھا ہونے کا شرف حاصل ہے، جہاں مختلف مذاہب کے بزرگوں، پیشواؤں اور مہاتماؤں نے پیام اتحادم، اخوت اور انسانیت کا درس دیا۔''

('ادبی تحریریں'/ مجموعہ مضامین 'اردو شاعری میں نانک کھتا' از سعادت علی صدیقی صفحہ 71 مطبوعہ 1989)

ڈاکٹر سعادت علی صدیقی سیکولر ذہن رکھتے تھے اور تمام مذاہب کا بھرپور احترام کرتے تھے۔ انھوں نے انسانیت، بھائی چارہ، سماجی اور اردو شاعری میں رام کتھا، اردو شاعری میں نانک کتھا، ہریش چند کی اردو شاعری، اردو شاعری میں کرشن کتھا جیسے کئی مضامین قلم بند کیے۔ مندرجہ ذیل اقتباس سے ان کے سیکولر نظریات کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے:

''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا، کثرت میں وحدت کا زریں نشان، آج دنیا کا سب سے بڑا جمہوری و سیکولر ملک ہے۔ جہاں مذہبوں و دھرموں کے ماننے والے شیر و شکر ہوکر رہتے ہیں اور اپنے اپنے طریق عبادات و مذہبی رسوم ادا کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہندوستان ارض چمن کا وہ حسین گلدستہ ہے جس کا ہر پھول سدا بہار اور ہر رنگ پائدار ہے۔ اس کی ایک غیر مذہبی مشترکہ تہذیب ہے جس میں ندرت و جامعیت ہمہ گیری و آفاقیت اور گہرائی و گیرائی کی روح جلوہ گر ہے۔''

('ادبی تحریریں' مجموعہ مضامین 'اردو شاعری میں رام کتھا' از سعادت علی صدیقی ص 16 مطبوعہ 1989)

'ادبی آئینے'، ڈاکٹر سعادت علی صدیقی کے مضامین کا دوسرا مجموعہ تھا جو 1983 میں منظر عام پر آیا۔ اس سے قبل ان کے مضامین کا ایک مجموعہ 1975 میں 'ادبی جائزے' کے نام سے شائع ہو چکا تھا۔ ان دونوں ہی مجموعہ مضامین کو اترپردیش اردو اکادمی نے اعزاز سے نوازا۔ 'ادبی آئینے' میں شامل دیگر اہم مضامین کے ساتھ ساتھ 'سنبھل کے چند قدیم شعرا'، ایک باکمال غیر معروف شاعر 'فرض نگینوی' اور 'سید سر سیوا ایک باکمال شاعر' جیسے مضامین شامل ہیں۔ آکاش وانی لکھنؤ سے اس زمانے میں کتابوں پر تبصرے نشر کیے جاتے تھے۔ 'ادبی آئینے' پر آکاش وانی سے تبصرہ کرتے ہوئے معروف صحافی جناب صباح الدین عمر نے کہا کہ ''ڈاکٹر سعادت علی صدیقی ایک نوجوان اردو ادیب ہی نہیں بلکہ اردو کے بڑے مبلغ ہیں اور اپنے ضلع میں اردو کی ترقی و ترویج و اشاعت کے لیے بڑے سرگرم رہتے ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ درس و تدریس اور دوسری مصروفیات کے علاوہ لکھنے کے لیے بھی وقت نکال لیتے ہیں۔'' ڈاکٹر سعادت علی صدیقی کی ایک کتاب 'حبسیۂ غالب' ہے۔ محض 80 صفحات پر مشتمل ایک مختصر تحقیقی کاوش ہے جس میں غالب کا حادثہ اسیری، حادثہ اسیری کے اسباب، غالب کی قمار بازی، ہمعصر تصانیف میں حادثہ اسیری کے اثرات، حبسیۂ غالب کی اہمیت جیسے قیمتی مضامین شامل ہیں۔ سعادت صاحب کی اس ادبی و تحقیقی کاوش پر ڈاکٹر رغیب حسین نے 'پیش گفتار' کے عنوان سے ایک مقدمہ تحریر کیا ہے جس میں ڈاکٹر سعادت علی صدیقی کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے موصوف رقمطراز ہیں:

''کتاب میں غالب کا فارسی ترکیب بند اور اس کا اردو ترجمہ بھی شامل ہے، ترجمہ کرنا درحقیقت ایک دشوار فن ہے لیکن مجھے خوشی ہے کہ عزیزی سعادت نے اس ترکیب بند کا ترجمہ نہایت ہی خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے اور اس ادبی ذمہ داری کو خوش اسلوبی کے ساتھ نبھایا ہے، چونکہ وہ زبان کی نزاکتوں سے خوب واقف ہیں، اس لیے انھوں نے اس بات کا پورا لحاظ رکھا ہے کہ ترجمے سے شعر کی اصل روح مجروح نہ ہونے پائے۔ حبسیۂ غالب کے مطالعہ سے اس ہونہار ادیب کی تحقیقی صلاحیتوں اور ادبی سلیقہ کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔''

(پیش گفتار، حبسیۂ غالب از سعادت علی صدیقی صفحہ 9 مطبوعہ 1971)

حبسیۂ غالب کے علاوہ ڈاکٹر سعادت علی صدیقی کی دیگر تصانیف 'ادبی جائزے'، 'ادبی آئینے' اور 'ادبی تحریریں' ہیں۔ یہ تینوں کتابیں سعادت صاحب کے تحقیقی وتنقیدی اور تعارفی مضامین کے مجموعے ہیں۔ 'انیسوی صدی میں اردو کا زندانی ادب' سعادت علی صدیقی کا تحقیقی مقالہ تھا۔

■

Mohd. Ovais Sambhali
178/157, Barood Khana, Golaganj
Lucknow - 226 018 (UP)
Mobile: 9794593055
Email: ovais.sambhli@gmail.com

سائنس کے بغیر ملک کی ترقی نہیں ہو سکتی: محمد خلیل

عبدالحی

محمد خلیل (پیدائش 30 جنوری 1944) کا تعلق شیراز ہند جونپور سے ہے۔ انھوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ایم ایس سی (بوٹنی) کی ڈگری حاصل کی اور بھارتیہ ودیا بھون نئی دہلی سے جرنلزم میں ڈپلوما کیا۔ انھوں نے اپنی پروفیشنل زندگی کا آغاز دہلی یونیورسٹی کے کالج میں سائنس کی تدریس سے کیا۔ اس کے بعد مشہور مجلہ 'سائنس کی دنیا' کی ادارت سے وابستہ ہوگئے۔ انھوں نے سائنسی موضوعات پر اردو میں بہت سی کتابیں اور مضامین تحریر کیے۔ ان کی سائنسی خدمات کے اعتراف میں دہلی اردو اکادمی، مغربی بنگال اردو اکادمی، اتر پردیش اردو اکادمی سے اعزازات مل چکے ہیں۔انھیں ساھتیہ اکادمی جیسے موقر ادارے سے ادب اطفال کا ایوارڈ بھی ملا ہے۔ ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں ان کی کئی اہم تصانیف ہیں جن میں عجیب و غریب جانور، سائنس اور ہم، نہرو اور سائنس، انوکھے پرندوں کی دنیا، حیوانات کی دلچسپ دنیا، سائنسدانوں کی دلچسپ باتیں، چچا جان کی سائنسی کہانی اور سائنسی ایجادوں کی کہانی قابل ذکر ہیں۔ ان سے پاپولر سائنس اور اردو کے حوالے سے ڈاکٹر عبدالحی نے گفتگو کی ہے۔ پیش ہیں انٹرویو کے کچھ اہم اقتباسات:

عبدالحی: سب سے پہلے اپنی تعلیم و تربیت اور ابتدائی زندگی پر روشنی ڈالیں؟

محمد خلیل: میں شیراز ہند جون پور (یوپی) میں 30 جنوری 1944 کو پیدا ہوا۔ میرا خاندان زمیندارانہ تھا۔ میرے دادا جان اور نانا جان دونوں زمیندار تھے۔ لیکن ان کو علم اور خاص طور پر اردو زبان سے لگاؤ تھا۔ وہ اس زمانے کے رسالہ مولوی، آستانہ اور سیاست اخبار پابندی سے منگاتے تھے جس کا اثر قدرتی طور پر مجھ پر ہونا تھا۔ میں نے ہائی اسکول کرنے کے بعد مولوی عبدالحق بابائے اردو کا پہلا سائنسی رسالہ 'سائنس' وطن میں پہلی مرتبہ گھر پر دیکھا تھا جو میرے والد محمد اسمٰعیل صاحب منگاتے تھے ان سب چیزوں کا بچپن میں مجھ پر اثر ہوا۔ میری ابتدائی تعلیم محمد حسن انٹر کالج میں ہوئی جو اس وقت قدیم اٹالہ مسجد میں تھا۔ اب تو اس کی نئی شاندار عمارت ہے۔ پھر تلک دھاری انٹر کالج میں سائنس کے مضمون کی وجہ سے داخل ہوا۔ اس کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی ایس سی اور ایم ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔تعلیم و تربیت سے بھی لگاؤ تھا پھر وہاں سے بی ایڈ کے مقابلے میں آ گیا اور اس کے بعد پی ایچ ڈی کے لیے ریسرچ کا کام شروع ہوا جس کا موضوع 'مختلف پودوں کی بیماریاں' تھا لیکن اسے نامکمل چھوڑ کر دہلی آ گیا جہاں دہلی یونیورسٹی کے ایک کالج میں میرا تقرر ہوگیا تھا۔ میں تدریس میں مصروف رہا، ساتھ ہی اردو اور ہندی زبانوں میں مقبول سائنس (پاپولر سائنس) کے مختلف موضوعات پر مضمون لکھتا رہا۔ میرے مضامین انگریزی کے کئی میگزین میں بھی اس وقت شائع ہوئے تھے۔اس کے بعد سی ایس آئی آر کے ایک انسٹی ٹیوٹ نیسکیئر میں بہ حیثیت سائنسداں ہندوستان کے پہلے سائنسی رسالہ 'سائنس کی دنیا' کی ادارت کو دیکھنے کی ذمے داری سنبھالی اس وقت اس کے نگراں مشہور سائنسداں رسالہ کے بانی اور سربراہ پروفیسر اے رحمٰن جو اس وقت سائنسی منصوبہ بندی کے بھی سربراہ تھے ایک اردو نواز شخصیت تھے۔ آج بھی یہ رسالہ سلور جوبلی سے گزر کر اپنی اشاعت کے باون سال پورا کرتے ہوئے شائع ہو رہا ہے۔

ع ح: آپ نے سائنس کے میدان میں مہارت حاصل کی، یقیناً ذریعہ تعلیم انگریزی رہا ہوگا، پھر بھی آپ نے اردو ہی میں لکھنا کیوں پسند کیا؟

محمد خلیل: مقبول سائنس (پاپولر سائنس) کو مادری زبان میں لکھنا اور سائنس کو طالب علموں اور عوام تک پہنچانا زیادہ آسان ہے۔ یہ ذہن پر اپنا پورا اثر چھوڑتی ہے۔ ترجمے سے فائدہ اٹھانا اچھی بات ہے۔ پاپولر سائنس ترجمے کی مخالفت کرتی ہے۔

ع ح: سائنس کے میدان میں بھی آپ کیئریر بنا سکتے تھے لیکن آپ نے اردو سائنسی رسالہ کو کیوں منتخب کیا؟

محمد خلیل: ہر قوم کے لیے مادری زبان کی بڑی اہمیت ہے۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ اردو زبان کے ذریعے سائنس کو عوام اور طالب علموں تک پہنچایا جاسکتا ہے۔ اس وقت رسالے میں ترجمے کے مضامین چھپتے تھے۔ میں نے 1988 میں اسے بہ حیثیت مدیر انچارج مکمل طور پر تبدیل کر دیا۔ اس کا سرورق بدل دیا، اداریے کے علاوہ متعدد کالم کی ابتدا ہوئی۔ غیر ترجمے کے مضامین کو ترجیح دی گئی اور خاص طور پر ان شخصیات کے جو سائنسی تعلیم سے وابستہ تھے۔ بچوں اور خواتین کے کالم کا خاص طور پر اہتمام کیا گیا۔ ملک کی بڑی شخصیات نے اس تبدیلی کو سراہا کیونکہ کل کا ہندوستان بچے ہی ہیں اس وقت مجھے رسالہ 'کھلونا' اور 'بانو' کی یاد آرہی ہے اس کا کیا عمدہ معیار تھا۔

ع ح: 'سائنس کی دنیا' کی ادارت کے کچھ تجربات بیان کریں؟

محمد خلیل: میں رسالے میں تقریباً ستائیس سال تک رہا۔ اشاعت میں ایک اہم مسئلہ رسالے کے لیے معیاری مواد کا حاصل کرنا ہے اور اس میں دشواری پیش آتی ہے۔ لیکن کچھ بڑی شخصیتیں جو مقبول سائنس کے قریب ہیں لیکن ان کے کچھ ذاتی مسائل ہیں فیصلہ لیا کہ ترجمہ کے بجائے سائنسی ماہرین سے درخواست کی جائے

وہ عام اپنے انداز میں لکھ دیں پھر اسے رسالے کے معیار اور ضرورت کو سامنے رکھ کر ایڈیٹنگ کر دیں یہ کام آسان نہ تھا لیکن ایک موقع پر پروفیسر اے آر قدوائی صاحب نے میرے اس قدم کو پسند کیا اسے ممکن بنانے کے لیے کچھ مسودے دیے۔ مجھے اس سلسلے میں ایک پرانا واقعہ یاد آتا ہے۔ رسالے میں ملکی سطح پر ان کوششوں سے بڑے سائنسی ماہرین کے مضامین شائع ہوئے لیکن ملک کی ایک بڑی شخصیت پروفیسر ڈی ایس کوٹھاری سے مضمون حاصل کرنے کا خیال آیا وہ اردو اور کچھ فارسی سے بھی واقف تھے۔ میری درخواست پر وہ انٹرویو کے لیے رضامند ہوگئے وہ عمر رسیدہ شخصیات میں تھے ان کا انٹرویو سائنس کی اہم باتوں کا احاطہ کرتا تھا۔ مضمون جو ان کے دیے انٹرویو پر تھا شائع ہونے کے بعد بڑی شخصیات کے ٹیلی فون آنے لگے کچھ لوگوں سے ملک کے مختلف حصوں سے اس مضمون کو پڑھنے کے لیے کاپی منگوائی اس سے انکار نہیں کہ کئی ملاقاتوں میں میں نے یہ محسوس کیا کہ ڈاکٹر صاحب کو پاپولر سائنس کے مضامین کی اہمیت کے مدنظر بے حد لگاؤ ہے۔ اپنی دلچسپی کے تحت انھوں نے بعد میں اپنے مضامین سے نوازا۔ اس طرح کے کئی واقعات پیش آئے۔

ع ح: آپ کی تحریروں کے اصل قاری کون ہیں؟

محمد خلیل: میرے اصل قاری طالب علم ہیں جو 9 سے 16 کے درمیان تعلیم میں مشغول ہیں۔ میرے دوسرے میدان اردو عوام، خواتین کا سائنسی ادب، ماحولیات، صحت، حیوانات، نباتات، پرندوں سے تفصیلی جائزہ، اور سائنسدانوں کے کارہائے نمایاں رہے ہیں۔

ع ح: آج کا دور سائنس اور ٹکنالوجی کا دور ہے، ایجادات، تجربات کے بعد نئی اصطلاحات کی بھرمار ہے، کیا جدید لغت پر کام ہونا چاہیے۔

محمد خلیل: سائنس ٹکنالوجی کی اصطلاحات کو آسان بنانا ہوگا تا کہ زبان کی روانی قائم رہے۔ مشکل تکنیکی الفاظ کے استعمال سے طلبہ کو سائنس سمجھنے میں مشکل آئے گی۔

ع ح: پاپولر سائنس پر لکھنے والوں کی تعداد بہت کم ہے اسے کیسے بڑھایا جاسکتا ہے؟

محمد خلیل: اس میدان میں لکھنے والے ماہرین کی کمی کو عرصہ سے محسوس کیا جارہا ہے لیکن ان کی تعداد بڑھانے کے لیے اب جو کوششیں کی گئی ہیں ان کو بڑھانے کی ضرورت ہے۔

ع ح: زبان کے ذریعے سائنس کی صورت حال کو آپ کس طور پر سوچتے ہیں؟

محمد خلیل: ہمارے معاشرے میں مادری زبان کی بڑی اہمیت ہے۔ اس طرح ملک کی مختلف زبانوں میں سائنس کی تدریس اور اشاعت میں اضافہ کیا جائے تو اس کے فائدے سامنے آئیں گے۔ عوام کے سوچنے کا انداز تبدیل ہوگا، سائنسی مزاج پیدا ہوگا اور ہم سائنسی ترقی کی طرف بڑھیں گے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کام کون لوگ کریں؟ میرا جواب ہوگا کہ اس اہم کام کو ہمارے سائنسی ماہرین بڑے معیاری طور پر انجام دے سکتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کام کے بدلے میں انھیں کیا حاصل ہوگا لیکن یہ کام خدمت کے جذبے سے انجام دیا جاسکتا ہے۔ یہ اہم مسئلہ غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔

ع ح: ادبیات کے علاوہ آپ کی دلچسپی کے اہم ترین موضوع؟ اس موضوع پر آپ کا کوئی ارادہ یا منصوبہ؟

محمد خلیل: پاپولر سائنس کے مختلف موضوعات پر اردو ماہرین سے پاپولر سائنس کے خطبے کا انعقاد کرایا جائے اس سے کسی حد تک اردو سائنسی عوام جمع ہو کر اس کی اہمیت کو سمجھیں گے۔ میرا مقصد ہے کہ اردو میں زیادہ سے زیادہ سائنسی مواد فراہم کیا جائے۔

ع ح: ہمارے قارئین کو اپنی تصنیفات کی تفصیلات دیں؟

محمد خلیل: میری شائع شدہ تیرہ کتابیں ہیں (جن میں دو ہندی کی ہیں) شائع مضامین کی تعداد ہزار سے اوپر ہے جو گذشتہ چار دہائی کے دوران شائع ہوئے ہیں۔ ساہتیہ اکادمی نے ایوارڈ کے لیے ملکی سطح پر میری کتاب 'سائنس کے دلچسپ مضامین' کو منتخب کیا جس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو چکا ہے۔ یہ کتاب سائنس کے مختلف میدانوں سے تعلق رکھتی ہے مثلاً حیوانات، نباتات، ماحولیات، شخصیات، سائنسی طنز ومزاح (جو سائنس پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے) سائنسی فکشن، سائنسی ترجمہ آلودگی (تیسرا ایڈیشن نیشنل بک ڈپو) ملک کا سب سے قدیم اور پہلی سائنس میگزین جس کی اشاعت کو ایک سو پانچ ہو گئے ہیں میری سائنسی کارکردگی پر عرصہ ہوا خصوصی نمبر شائع کیا تھا۔

ع ح: آپ کو کتنے ایوارڈ مل چکے ہیں؟

محمد خلیل: متعدد ایوارڈ کا ذکر آپ نے کیا ہے۔ سب سے پہلے این سی ای آر ٹی نے میری پہلی کتاب پر انعام دیا جسے قارئین نے بے حد پسند کیا تھا۔ ملکی سطح پر غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی نے سائنسی خدمات کے لیے اور دہلی اردو اکادمی نے سب سے پہلے نوازا تھا۔ آپ نے مقام کی بات دریافت کی ہے۔ میں اردو سائنسی خادم ہوں وہی رہنا چاہتا ہوں۔ مقام کا فیصلہ اردو قارئین اور ماہرین کریں گے۔ میری دلچسپی اردو زبان کے ذریعے سائنس کو دور تک لے جانے میں ہے۔

ع ح: قومی اردو کونسل کے بارے میں آپ کے کیا تاثرات ہیں؟

محمد خلیل: قومی اردو کونسل کے کاموں سے میں پوری طرح مطمئن ہوں۔ خاص طور پر ان کے بچوں اور بڑوں کے شائع ہونے والے رسالوں سے۔ کتابوں کو شائع کرنے کے لیے مالی معاونت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ میری ایک سائنسی کتاب حیوانات کی دلچسپ دنیا جس کے تین ایڈیشن اب چھپ چکے ہیں اس کا اعزاز قومی اردو کونسل کو جاتا ہے۔ مجھے بہ حیثیت اردو سائنسی خادم کے کونسل کے پہلے ڈائرکٹر پروفیسر عبدالعلیم نے ترجمہ کے لیے مجھے بلا کر متوجہ کیا لیکن میں نے معذرت کر لی کیونکہ پاپولر سائنس ترجمہ کو ترجیح نہ دے کر براہ راست عام فہم تحریر کو ترجیح دیتی ہے۔ ڈاکٹر فہمیدہ بیگم صاحبہ کے زمانے میں تین پینل میں کمیٹی کا رکن تھا۔ پروفیسر اے رحمٰن بھی کونسل کے پاپولر سائنس پینل کے چیئرمین تھے۔

ع ح: سائنسی میدان میں عرصہ تک خدمات انجام دیتے ہوئے کیا آپ اپنے کام سے مطمئن ہیں؟

محمد خلیل: عرصہ تک اس میدان میں رہنے کے باوجود میں اپنے کام سے مطمئن نہیں ہوں۔ میں خود سے سوال کرتا ہوں کہ کیا مقبول سائنس، سائنس کو عوام اور بچوں تک ان کتابوں اور رسائل کو پہنچا رہی ہے۔ کیا والدین خود اس جانب متوجہ ہوئے اور بچوں کے لیے کوئی کتاب یا رسالہ خریدا۔ اساتذہ نے اس کے مطالعے کی اہمیت کو واضح کیا۔ ان سوالات سے میں غیر مطمئن ہو جاتا ہوں۔ جب کہ مقبول سائنس کا اصل مقصد دور کے علاقوں تک سائنس کو پہنچانا ہے۔ میرے اس خیال سے مشہور سائنسی شخصیات مثلاً پروفیسر ڈی ایس کوٹھاری، ڈاکٹر اے آر قدوائی، پروفیسر محمد شفیع، ڈاکٹر کرشن لال، پروفیسر عبید صدیقی اور پروفیسر ایس جی مشرا پوری طرح متفق تھے اور کہتے تھے کہ اس کے بغیر ملک کی ترقی نہیں ہو سکتی کیونکہ سائنس ہماری روزمرہ کی زندگی میں سمائی ہوئی ہے۔

ع ح: نئی نسل کے لیے آپ کا پیغام کیا ہے؟

محمد خلیل: نئی نسل کو مادری زبان میں بنیادی تعلیم کے بعد اس زبان کی کتابوں کو خرید کر بچوں تک پہنچانا چاہیے۔ بچوں کے رسائل کو پڑھنے کی توجہ دلانی چاہیے جس کے لیے عرصہ سے رسالہ 'کھلونا' اور 'پیام تعلیم' اور بچوں کے دوسرے رسالے کوشاں رہے ہیں۔

■

Abdul Hai
CM College, Quilaghat, Rahamganj,
Darbhanga-846004 (Bihar)

محمد لطیف شاہ

اسلوب کی شعریات اور ادبی تنقید

لفظ اسلوب انگریزی زبان کے لفظ (Style) کا اردو مترادف ہے۔جس کے لیے یونانی میں (Stylus)، عربی اور جدید فارسی میں 'سبک'، سنسکرت میں 'ریتی' اور ہندی میں 'شیلی' جیسے الفاظ مستعمل ہیں، جس کے مشتقات، تعبیرات وتشریحات، مبادیات اور انسلاکات سے متعلق بیش بہا مدلولات پیش کیے گئے ہیں۔تاہم ہنوز کوئی ایسی تعریف سامنے نہیں آئی ہے۔جو حرفِ آخر کی سند حاصل کر سکے۔بہر حال لغوی اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ اسلوب سے مراد طرزِ تحریر، طریقہ اظہار، انداز بیان، ڈھنگ، طور طریقہ، زبان وبیان، لب ولہجہ، رنگ، رنگِ سخن، وغیرہ ہیں۔اور اصطلاحی معنوں میں زبان اور ادب کے فنی اقدار (یعنی اصوات، حروف، الفاظ، جملوں، تشبیہ، استعارہ، علامت وغیرہ) کے منفرد استعمال کا نام اسلوب ہے۔ مختلف لغات اور فرہنگ کے علاوہ بے شمار علمائے ادب، دانشوروں، مفکروں، ماہرین لسانیات اور نقادوں نے اسلوب کی جتنی بھی تعریفیں کی ہیں ان کو ہم واضح طور پر دو زمروں (Paradigms) میں رکھ سکتے ہیں ایک ادبی تنقید اور دوسرا لسانیاتی تنقید۔یہاں ہماری مراد ادبی تنقید کے حوالے سے اسلوب کی تفہیم وتعبیر کو زیر بحث لانا ہے۔

ادبی تنقید میں مطالعۂ اسلوب کا سفر تاثر سے شروع ہو کر ذاتی پسند وناپسند سے گزر کر جمالیاتی اقدار کو آغاز ر بنیادی اہمیت دی جاتی ہے۔یعنی ایک قاری یا ناقد کسی فن پارے کو پڑھ کر جتنا محظوظ ہوتا ہے وہ اسی طرح کا فیصلہ بھی صادر کرتا ہے۔علاوہ ازیں ادبی ضائقہ کو بھی ملحوظِ خاطر رکھا جاتا ہے، ظاہری بات ہے کہ ہر کسی قاری کا ادبی ضائقہ ایک جیسا نہیں ہوسکتا ہے۔وجہ یہی ہے کہ ایک ہی صنف کسی کے لیے اعلیٰ اور کسی کے لیے ادنیٰ معلوم ہوتی ہے۔ایسی مثالوں کی ہمارے ادب میں کوئی کمی نہیں ہے۔مثال کے طور پر غزل ہی کو لیجیے جہاں یہ رشید احمد صدیقی کی نظر میں اردو شاعری کی آبرو ہے تو وہی عظمت اللہ خان غزل کی گردن اڑانے کی بات کرتے ہیں، جہاں یہ فراق گورکھپوری کے نزدیک مختلف پھولوں کی مالا ہے تو وہیں الطاف حسین حالی کے نزدیک غزل شاعری کا ناپاک دفتر ہے، جہاں یہ آل احمد سرور کی نظر میں نقاب پوش آرٹ اور چاول پر قل ھواللہ لکھنے کا آرٹ ہے تو وہیں کلیم الدین احمد اس کو نیم وحشی صنفِ سخن قرار دیتے ہے وغیرہ۔صنفِ غزل سے متعلق یہ مختلف اور متضاد آراء دراصل ذاتی پسند وناپسند کی بنیاد پر معرضِ وجود میں آئی ہیں۔ان میں کسی بھی نظریے کو پیش کرتے ہوئے معروضی اور سائنٹفک اصول وضوابط کو ملحوظِ خاطر نہیں رکھا گیا ہے۔گویا یہ آرا اپنے اندر سرِ دست جمالیاتی تاثر رکھتی ہیں جو ادبی تنقید کا خاصہ بھی ہے

اسلوب کی بحث نے دراصل (ادبی دائرے میں) فرانسیسی کے مشہور ومعروف مصنف بفون (Buffon) کے اس جملے سے کافی زور پکڑا کہ "Le style,c'estl' homme' .meme" جس کا انگریزی میں ترجمہ "Style is the man himself" کیا گیا ہے۔یعنی اسلوب کے مطالعے سے ہم مصنف کی شخصیت کو پہچان سکتے ہیں۔بہ الفاظِ دیگر ''اسلوب ہی کسی شخص کے مزاج، ذوق، مشاہدہ، تجربہ اور خصائص ونقائص کی آماجگاہ ہے'' کیونکہ بفون کے مطابق جب اسلوب ہی بذاتِ خود آدمی/شخص

پیرایۂ بیان کی آزادی کا استعمال شعوری بھی ہوتا ہے اور غیر شعوری بھی،اس میں ذوق،مزاج،ذاتی پسند وناپسند، صنف یا ہیئت کے تقاضوں وفنکاری کی نوعیت کے تصّور کو بھی دخل ہوسکتا ہے۔یعنی تخلیقی اظہار کے جملہ ممکنہ امکانات جو وجود میں آچکے ہیں اور وہ جو وقوع پذیر ہوسکتے ہیں،ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا (جس کا اختیار مصنف کو ہے) دراصل اسلوب ہے۔

ہے، تو مذکورہ عوامل کا اس میں ہونا پھر لازم بنتا ہے۔ جب کہ قطعی طور پر ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ پیرایۂ بیان یا طرزِ اظہار شعوری بھی ہوتا ہے اور غیر شعوری بھی، اور کسی بھی شعوری اظہار بیان میں مصنف کی ذات بہت کم ملتی ہے اور انانیت زیادہ۔ جس کی مثال میں قاضی عبدالودود کا یہ واقعہ پیش کیا جاسکتا ہے کہ شادؔ عظیم آبادی کی خودنوشت پڑھنے کے بعد انھوں نے شاد کو جھوٹوں کا بادشاہ کہا ہے۔ کیونکہ پیرایہ بیان میں انھیں وہ شاد نہیں ملا جنھیں وہ حقیقت میں جانتے تھے۔ غرض مصنف کی شخصیت کے کچھ نقوش اسلوب میں ضروری پائے جاتے ہیں لیکن مکمل مصنف نہیں۔ کیونکہ اس میں اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے ملاحظہ ہو پروفیسر گوپی چند نارنگ کا یہ بیان:

''پیرایۂ بیان کی آزادی کا استعمال شعوری بھی ہوتا ہے اور غیر شعوری بھی، اس میں ذوق، مزاج، ذاتی پسند وناپسند، صنف یا ہیئت کے تقاضوں وقاری کی نوعیت کے تصور کو بھی دخل ہوسکتا ہے۔ یعنی تخلیقی اظہار کے جملہ ممکنہ امکانات جو وجود میں آچکے ہیں اور وہ جو وقوع پذیر ہوسکتے ہیں، ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا (جس کا اختیار مصنف کو ہے) دراصل اسلوب ہے۔''[1]

یعنی اسلوب کی تشکیل میں جہاں مصنف کی ذات اہمیت رکھتی ہے، تو وہیں اس تشکیل شدہ صنف کے فنی لوازمات بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ نیز ان قارئین کے تصورات کا بھی عمل دخل رہتا ہے جن کے لیے کسی بھی فن پارے یا تخلیق کو معرضِ وجود میں لایا جاتا ہے۔ یہ بات بھی بدیہی ہے کہ کسی بھی تحریر کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے، جس کی ترسیل و ابلاغ کے لیے لکھنے والا زبان کی تراش وخراش، کاٹ چھانٹ اور انجذاب و انحراف سے کام لیتا ہے۔ اس طرح اس عمل سے ایک منفرد انداز، طریقۂ کار اور پیرایۂ اظہار قائم ہوتا ہے، جس سے ادبی اصطلاح میں اسلوب کا نام دیا جاتا ہے، اور اس پورے عمل کو شعریاتِ اسلوب کا نام دیا جاتا ہے۔

مغرب ومشرق کے حوالے سے اسلوب پر پیش کی گئی تعریفوں پر ایک سرسری نظر ڈالتے چلیں تاکہ اسلوب سے متعلق مزید معلومات حاصل ہو کر اس بات کا بھی صحیح اندازہ ہوسکے کہ یہ لوگ اسلوب کو کن معنوں میں لیتے ہیں۔

اردو ادب کے ممتاز ومعروف ادیب اور ناقد آل احمد سرور اسلوب سے متعلق پہلے تین نکات کو بیان کرتے ہیں! بیان کا طریقہ، حسنِ بیان اور انفرادیت کا حسن اور آگے چل کر واضح الفاظ میں اسلوب کی تعریف کرتے ہوئے یہ فیصلہ سناتے ہیں کہ ''اسلوب واضح خیال کا موزوں اور اسی لیے منفرد اظہار ہے''، بڑی حد تک جامع ہے۔''

اردو زبان وادب کے اور ایک ناقد ڈاکٹر علی رفاد فتیحی نے اپنی کتاب 'ساخت اور اسلوب: نظریہ وتجزیہ' میں اسلوب اور اس کی ساخت کے بارے میں طویل گفتگو کی ہے۔ اور کچھ مغربی ماہرین اسلوبیات کے نظریات کو بھی مختصر طور پر پیش کیا ہے۔ اسلوب کی تعریف کے حوالے سے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ:

''امر واقعہ ہے کہ اسلوب کی دلکشی، فنکار کی شخصیت اور مذاق ومیلان سے ہمکنار ہو کر نئی معنویت اور اہمیت حاصل کر لیتی ہے۔ اور اس میں نیا نکھار، نئی توانائی اور نئی تابناکی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلوب ادیب کی شخصیت کا مظہر بھی ہے۔ ابلاغ خیال کا وسیلہ بھی اور ادب کا اہم تقاضا بھی۔''[2]

اسلوب سے مراد ذاتی تجربات ومشاہدات اور علمیت سے زبان کا وسیلہ لے کر اپنے خیالات واحساسات کو موثر انداز میں پیش کرنا ہے۔ نیز اس میں انتخاب، اجنبیت، تناسب خوبیِ الفاظ اور فنی اقدار کا بھی عمل دخل رہتا ہے۔ اس نظریہ کے حوالے سے ایک انگریزی ناقد ہولن ولز (Hulon Willis) کا بیان بھی اہمیت رکھتا ہے۔ جس میں وہ کہتے ہیں کہ جملوں کی ساخت اور الفاظ کی چست بندی سے ہی اسلوب وجود میں آتا ہے۔ جس میں مصنف کی ذہنی تربیت اور انتخاب الفاظ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ملاحظہ ہوں ان کے یہ الفاظ:

"Sentence structure and diction make style,and just as sentence can be composed instead of issued of thoughtlessly from the writer's mind,so words can be chosen in a very real sense,style is choice"

''جملے کی ساخت اور معمول ہی اسلوب بناتے ہے۔ الفاظ کی چست بندی اور مصنف کی ذہنی ترتیب و انتخاب سے ہی اسلوب وجود میں آتا ہے۔ نہ کہ مصنف کے بنا سوچے سمجھے خیالات سے۔ لہٰذا صحیح معنوں میں الفاظ کا انتخاب ہی اسلوب ہے۔''

امر واقعہ ہے کہ اسلوب کی دلکشی، فنکار کی شخصیت اور مذاق و میلان سے ہمکنار ہو کر نئی معنویت اور اہمیت حاصل کر لیتی ہے۔ اور اس میں نیا نکھار، نئی توانائی اور نئی تابناکی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلوب ادیب کی شخصیت کا مظہر بھی ہے۔ ابلا غ خیال کا وسیلہ بھی اور ادب کا اہم تقاضا بھی۔

اسلوب کوئی خارجی یا اضافی شے نہیں ہے۔ نا یہ آورد والا کوئی معاملہ ہے، بلکہ یہ ذہنِ انسانی میں ایک جزولاینفک کی طرح ابتدا سے ہی موجود ہوتا ہے، اور ہر عمل میں کارفرما رہتا ہے۔ اسی طرح یہ زبان کے وجود کا بھی حصہ ہے۔ جو کسی بھی صورت میں زبان سے الگ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ وجہ یہی ہے کہ ابتدا میں کسی بھی ادیب یا شاعر کا ذہن زبان کی باریکیوں سے زیادہ روشناس نہیں ہوتا ہے، اور اکثر بیشتر اسلوب میں بھی زیادہ جاذبیت اور نکھار و ندرت نہیں ہوتی ہے۔ جیسے جیسے مصنف کا ذہن اصناف کے فنی لوازمات، زبان کی باریکیوں اور الفاظ کے ذخیرے سے واقفیت حاصل کرتا ہے تو اس کے اسلوب میں بھی نکھار، انوکھا پن، جدت اور ندرت جیسی خصوصیات کامیابی کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہیں۔ بہ الفاظِ دیگر اسے یوں بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ مثلاً: سیکھنے کے عمل میں جب مصنف عہدِ طفلی میں ہوتا ہے تو اس سے یہ پتا نہیں ہوتا ہے کہ مسرت، انبساط، نشاط، سرور، عشرت، عیش، وغیرہ قریب المعنی الفاظ ہیں لیکن جیسے ہی یہ اس امر سے واقف ہوتا ہے تو وہ ان کے استعمال میں بھی طرح طرح کی بوقلمونی طبع فطرت سے ہی اجاگر کرتا ہے۔ یوں ایک ہی خیال کو پیش کرنے میں مصنف الفاظ کی تکرار سے دامن بچا کر مختلف قریب المعنی الفاظ کے استعمال میں مکمل دسترس حاصل کرتا ہے۔ اس میں مصنف کے تجربات، مشاہدات اور علمیت کا بھی عمل دخل ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کا یہ عمدہ خیال ملاحظہ فرمایئے:

اسلوب ایک ارتقائی عمل سے عبارت ہے، جیسے جیسے تجربات، مشاہدات اور مطالعے میں اضافہ ہوتا ہے۔ اسلوب میں بھی اسی نسبت سے گہرائی نکھار اور جاذبیت در آتی ہے، بلکہ ایک لحاظ سے اسلوب کا سفر، سفر حیات سے مماثل ہے۔

''یہ (اسلوب) ایک ارتقائی عمل سے عبارت ہے، جیسے جیسے تجربات، مشاہدات اور مطالعے میں اضافہ ہوتا ہے۔ اسلوب میں بھی اسی نسبت سے گہرائی نکھار اور جاذبیت در آتی ہے، بلکہ ایک لحاظ سے اسلوب کا سفر، سفر حیات سے مماثل ہے۔''[4]

زبان کے منفرد استعمال سے بھی ہم اسلوب کی تخصیص کرتے ہیں جس میں انفرادی اور اجتماعی دونوں

طرح کی درجہ بندی کی جاسکتی ہے۔ ہر کسی شاعر یا ادیب، دور، عہد، تحریک، دبستان، وغیرہ کے استعمال زبان کا عمل مختلف ہوتا ہے جو اپنے اندر متنوع ومختلف خصائص بھی رکھتا ہے۔ ان خصوصیت کی وجہ سے ہم اسلوب کی تخصیص بھی کرتے ہیں۔ غرض زبان اور اس کے منفرد استعمال سے بھی اسلوب وجود میں آتا ہے۔ اس زمرے میں پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ لکھتے ہیں:

''اسلوب سے زبان کے برتے جانے کا انداز یا زبان کا مخصوص ومنفرد استعمال مراد ہے، لیکن زبان سے اسلوب مراد لے جانے کی مثالیں بھی ملتی ہیں، مثلاً حکیم آغا جان عیش نے غالب کی مشکل پسندی سے تنگ آکر جب یہ کہا تھا کہا،

زبانِ میر سمجھے اور کلامِ مرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

تو 'زبانِ میر' سے ان کی مراد میر تقی میر کا اسلوب تھا جو غالب کے مشکل اور پیچیدہ اسلوب کے مقابلے میں سہل اور آسان اسلوب تھا۔''[5]

اسلوب کی تشکیل میں جہاں زبان اور شخصیت کو اہمیت حاصل ہے۔ تو وہیں ترسیل و ابلاغ کو بھی دائرہ اہمیت سے مستثنیٰ نہیں رکھا جاسکتا ہے۔ کیونکہ کوئی واقعہ، حادثہ، سانحہ وغیرہ دیکھنے سے ایک شاعر یا ادیب (جو زیادہ حساس ہوتے ہیں) کے اذہان پر ایک کیفیت طاری ہوتی ہے۔ جس کے ردعمل میں یہ سوچتے ہیں کہ کیا کہا جائے۔ یہ کہنا یا بولنا یا لکھنا جس سے ہم سب بخوبی واقف ہیں، ترسیل و ابلاغ کا بنیادی مقصد ہوتا ہے۔ جس کے ساتھ ساتھ مصنف کے ذہن میں اور ایک پہلو اساسی اہمیت رکھتا ہے جس سے ہم مختصر الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ پہلو کہنے کو کس طرح کہا جائے! کا ہے۔ یہی وہ عمل ہے جو اجتناب، انتخاب، موثر اور انفراد کے پہلوؤں کو سینے سے لگاتا ہے۔ غرض خارج و داخل کا حسین امتزاج اور زبان و جمالیاتی پہلوؤں کی رنگارنگی اسلوب کی تشکیل میں اہم اور کلیدی رول ادا کرتے ہیں۔

اسلوب ادب کے حوالے سے کسی بھی صنف کی خارجی ہیئت اور فنی لوازمات کو نظر انداز کر کے کوئی وجود نہیں رکھتا ہے۔ ایک اسلوب کی تشکیل میں ہیئت اور فنی اقدار جسم میں خون کی مانند کام انجام دیتے ہیں۔ جو اسلوب کی شکل وصورت اور انفرادیت میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ جس کو اس طرح بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ ایک شاعر جب شعر کہتا ہے تو تب تک اس کی شاعری کو کسی صنفِ سخن کے زمرے میں نہیں رکھا جاسکتا ہے جب تک کہ انہوں نے کسی صنفِ سخن کی ہیئت اور فنی لوازمات کو ملحوظِ خاطر نہ رکھا ہو۔ جب شاعر کا منشا غزل کہنے کا ہوگا تو وہ غزل کے فنی لوازمات کو ضرور ذہن میں رکھے گا مثلاً، قافیہ، ردیف، وزن، بحر وغیرہ اس طرح اگر یہ اپنے خیالات، احساسات اور جذبات کو اور کسی صنفِ سخن کی شکل دینا چاہتا ہے تو اسی صنفِ سخن کی ہیئت کو خاطر میں لائے گا۔ کیونکہ ادب کی بیشتر اصناف کی زمرہ بندی ہیئت کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ مثلاً غزل، مثنوی، رباعی، مسدس، وغیرہ اصناف نثر میں ناول، افسانہ، ڈراما، وغیرہ اس کے ساتھ ساتھ ایک مصنف تحریر رقم کرتے ہوئے کس انداز سے اپنی اپچ کو بروئے کار لاتا ہے یہ سب مل کر ان کے اسلوب کی انفرادیت کو قائم کرتے ہیں۔ اور کسی بھی اسلوب کی تشکیل میں ہیئت، فنی لوازمات اور ان کا استعمال خود بخود ساتھ ساتھ اپنی شمولیت یقینی اور ضروری بناتے ہیں۔ جس کا پرتو ہمیں متن یا فن پارے میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

ایک وسیع تر تناظر میں ہائے زندگی تمام تر شعبہ ہائے زندگی میں اسلوب کی شمولیت ناگزیر ہے۔ اور ہر دور میں تغیر کی دھار سے گزر کر اسلوب بھی متغائر ہوتا ہے۔ مثلاً بول چال کا ڈھنگ، رہن سہن کا طریقہ، سوچنے کا طریقہ، رسوم ورواج کا طریقہ، سج دھج کا انداز، کھانے پینے کا طور طریقہ، لب ولہجہ کا انداز وغیرہ ان تمام اسالیب کو سماجی اسلوب (Social Style) میں شامل کیا جاتا ہے۔ اور مختلف علاقوں، لوگوں اور ادوار سے منسلک کیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے نکولس کوپلینڈ (Nikolas Coupland) نے اپنی کتاب "Style Language Variation and Identity" میں وضاحت کے ساتھ بحث کی ہیں ان کے خیال میں تہذیب وتمدن کے تمام تر جہات میں اسلوب ایک اہم کردار ادا کرتا ہے اس لیے اسلوب کی ایک سماجی معنویت بھی ہے:

"It(style) has a social meaning.The same is tru e forstyles in all other life-domains.Culture resonances of time place and people attach to styles of dress and personal appearance in general, to styles in the making of material goods, to styles of social and institutional practice, perhapes even to styles of thinking."

''اسلوب کی ایک سماجی معنویت بھی ہے۔ جس کی اہمیت تمام تر شعبہ حیات میں بھی ہے۔ ایک مخصوص ثقافتی تناظر میں لوگوں کے رہن سہن، کھانے پینے، عادات واطوار، کام کاج اور سماجی وثقافتی انسلاکات میں! یہاں تک کہ سوچنے کے عمل میں بھی اسلوب کی جلوہ گری کار فرمارہتی ہے۔''

اسلوب کی ایک سماجی معنویت بھی ھے۔جس کی اھمیت تمام تر شعبہ حیات میں بھی ھے۔ایک مخصوص ثقافتی تناظرمیں لوگوں کے رھن سھن، کھانے پینے، عادات واطوار، کام کاج اور سماجی وثقافتی انسلاکات میں!یھاں تک کہ سوچنے کے عمل میں بھی اسلو ب کی جلوہ گری کار فرما رھتی ھے۔

الغرض ادبی تنقید (Literary Criticism) کے زمرے میں اسلوب کی تشکیل میں کسی مصنف، عہد، دور، اور ہیئت کو اہمیت حاصل ہے جن کے توسط سے ایک فن پارہ وجود میں آتا ہے۔ نیز یہ کہ اسلوب سے مراد منفرد اظہار بیان یا پیرایہ ہے، اسلوب شاعر یا ادیب کی شخصیت کا غماز ہوتا ہے، اسلوب کی پرورش میں جمالیاتی حظ اور فنی اقدار کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہاں اسلوب کا تصور زیادہ تر داخلی تاثرات اور ذاتی پسند و ناپسند پر منحصر ہوتا ہے۔ اور ایک ہی صنف کو کافر، عطر، آبرو، بدبو وغیرہ کہنے کی کمی بھی نہیں دکھائی دیتی ہے۔ بہر حال مطالعۂ اسلوب کے سلسلے میں ادبی تنقید سے جڑے بیشتر مفروضات رمبادیات کو صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا ہے۔

حواشی

1 بحوالہ پروفیسر گوپی چند نارنگ، ادبی تنقید اور اسلوبیات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1989، ص 15

2 بحوالہ: ڈاکٹر علی رفاد فتیحی: ساخت اور اسلوب: نظریہ و تجزیہ، بک کارپوریشن، دہلی، 2016، ص 132

3 Structure,Style and usage Rhetorical and Reaoning,third edt, 1973, Holt,Rinehort and Winston.inc. P 209

4 بحوالہ: ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش: جدید افسانے کے رجحانات، اشاعت اول، انجمن ترقی اردو، کراچی، 2000، ص 531

5 بحوالہ: پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ: زبان، اسلوب اور اسلوبیات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2011، ص 18

6 (Nikolas Coupland, Style (Language, Variation, and Identity), Cambridge University Press, 2007, P 1

■

Mohd Lateef Shah
Research Scholar, Dept of Urdu
Kashmir University
Kashmir - 190006 (J&K)
Mob.:9797130907

حفیظ میرٹھی کی شعری کائنات

راحت علی صدیقی قاسمی

حفیظ میرٹھی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں، ان کی شعری کائنات میں غزل کی حکمرانی ہے، غزل گوئی ہی ان کی شناخت کا باعث ہے۔ انھوں نے جس زمانے میں غزل کی وادی میں قدم رکھا، وہ ترقی پسند تحریک کے شباب کا زمانہ تھا، میرٹھ میں بھی ترقی پسندوں کی سرپرستی میں نشستیں منعقد ہوتی تھیں، جن میں ترقی پسند تحریک کے افکار و نظریات کا غلبہ رہتا تھا، نظم کی طرف زیادہ توجہ دی جاتی تھی، مسلسل کسی ایک موضوع پر خیالات پیش کرنا موزوں اور مناسب سمجھا جاتا تھا، میرٹھ ہی نہیں پوری ادبی دنیا اسی روش پر گامزن تھی، نظم کی روایت ترقی کر رہی تھی، غزل پر اعتراضات کیے جا رہے تھے، اسے فرسودہ اور بے وقت کی راگنی خیال کیا جا رہا تھا، اس کے موضوعات و لفظیات کو فرسودہ و قبیح تصور کیا جا رہا تھا، شاعری کا مسائل زندگی سے ہم آہنگ ہونا ضروری تصور کیا جانے لگا تھا، شعرا کی پوری توجہ اسی جانب مرکوز تھی۔

حفیظ نے اس دور میں غزل گوئی کا فریضہ بڑی خوبی کے ساتھ انجام دیا، اور کسی نظریے و تحریک کے پابند نہیں ہوئے، غزل کو ایسے موضوعات اور افکار عطا کیے، جن کا تصور غزل کے پیرایہ میں کم ہی ہوتا ہے، فرسودہ خیالات سے اجتناب کیا، روایتی طرز اختیار نہیں کیا، قدیم لفظیات کے ذریعے ہی نئے معانی تخلیق کیے۔

زندگی جن مشکلات و مصائب سے دوچار ہوتی ہے، سماج و معاشرہ جس کربناک صورت حال کا مشاہدہ کرتا ہے، غربت و افلاس کے جو ہولناک مناظر ہوتے ہیں، حفیظ نے ان کو غزل کے موضوعات میں تبدیل کر دیا، زندگی کے نشیب و فراز، سماج و معاشرے کی صورت حال کو دیکھا محسوس کیا، اور اسی احساس کو غزل کا نازک پیکر عطا کیا، اور اس خوبی کے ساتھ کہ اس کا حسن بھی باقی رہا، تشبیہات و تمثیلات اور استعارات و علامات کی کائنات بھی سجی رہی، اور کائنات کا چہرہ بھی غزل کے آئینے میں نظر آنے لگا، اس کے چہرے پر لگے زخم بھی نمایاں ہوگئے، اور ان کا مرہم بھی تلاشنے کی کوشش کی گئی، ان موضوعات کو اختیار کرنے کے باوجود حفیظ کی غزلیں خبروں کا روپ لینے اور سپاٹ پن سے محفوظ ہیں، اور ان کا تغزل بھی باقی ہے، وہ غزل کے نرم و نازک اور خوبصورت پیکر کا تحفظ کرنے میں کامیاب ہوئے، جو ان کی بڑی کامیابی ہے۔

ان کے موضوعات روایتی نہیں ہیں، وہ پرانے جام کو نیا پیمانہ عطا کرنے کے عادی نہیں ہیں، وہ مشاہدہ کے لیے کھلی آنکھیں، اور محسوس کرنے کے لیے دھڑکتا ہوا دل رکھتے ہیں، اور ان موضوعات پر گفتگو کرنے کے لیے ایک نظریہ رکھتے ہیں، جو انھیں سچ کہنے کی ہمت اور حوصلہ عطا کرتا ہے، رات کو رات کہنے کی جرأت دیتا ہے، ان تمام عناصر سے مل کر حفیظ کی غزل وجود پذیر ہوتی ہے، اور سوز دروں اس کے تاثر کو دوبالا کر دیتا ہے۔ پروفیسر عتیق احمد صدیقی اُن کی شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"جو کچھ اس شاعری میں نظر آتا ہے وہ رسمی اور تقلیدی نہیں ہے بلکہ اُس کا تعلق قلبی محسوسات سے ہے، یہ مشاہدات وسیع ہیں اور ان کی وسعت کی وجہ سے شاعری کو متنوع موضوعات ملے ہیں اور یوں وہ خود کو روایت کے محدود دائرے سے آزاد کر سکی ہے اور نسبتاً ایک کھلی فضا میں سانس لیتی نظر آتی ہے۔"

(حفیظ میرٹھی، فن اور شخصیت، ص:27)

رات کو رات کہہ دیا میں نے
سنتے ہی بوکھلا گئی دنیا

جس سمت دیکھیے وہیں رستے ہوئے سے زخم
ویسے بڑا حسین ہے دور ترقیات

خون اس دور گرانی میں بہت سستا ہے
رات پھر ایک قتل ہوا گاؤں میں پانی پر

کیا برا وقت ہے مفلسوں کے لیے
خون بیچا گیا روٹیوں کے لیے

بہت سے اشعار ہیں جن کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے، اور ان کی شاعری میں موجود سماج و معاشرے کی صورت حال کو دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔

انسانی جذبات و احساسات کے قدردان تھے، اخلاقی اقدار کی پامالی انھیں تکلیف میں مبتلا کرتی تھی، اس تکلیف کا اظہار ان کی غزلوں سے بھی ہوتا ہے، حفیظ انقلابی مزاج کے حامل تھے، وہ برائی کا قلع قمع کرنا چاہتے تھے، انقلاب کی قندیل روشن کرنا، ان کی فطرت کا خاصہ تھا، وہ انقلاب کا انتظار کرنے والوں میں سے نہیں تھے، بلکہ انقلاب پیدا کرنا ان کی خواہش تھی، جس کا اظہار ان کی غزلوں میں جا بجا ہوتا ہے، وہ مادی ترقی اور انسانی اقدار و معیار کی تنزلی پر طنز کرتے ہیں، رشتوں کی صورت حال پر تکلیف کا اظہار کرتے ہیں، کردار سازی کا درس دیتے ہیں، کردار کی عظمت کو دولت عظمیٰ گردانتے ہیں، کردار کو انسان کی پہچان کا باعث گردانتے ہیں، مذہبی منافرت بھی انھیں پسند نہیں ہے، اور انسان کو محض مذہب کی بنیاد پر پہچاننا ان کا شیوہ نہیں ہے، سماج میں پیدا ہو رہی اس صورت حال پر طنز کرتے ہیں، اور اس کو انسانوں کی پہچان و شناخت پر حملہ کرنے والا گردانتے ہیں، تلمیحات بھی ان کی غزلوں میں موجود ہیں، جو اشعار کو مزید خوبصورت اور دلکش بناتی ہیں۔

زندگی کے ساتھ ساتھ ادب، شاعری اور مشاعروں کی صورت حال پر بھی حفیظ نے اپنی غزلوں میں اظہار خیال کیا ہے، اور حقائق کو غزل کا جامہ پہنا دیا ہے،

شاعروں کا اشعار پر گفتگو زیادہ کرنا اور شعر کم پڑھنا بہت سے شعرا آج بھی اس روش کو اپنائے ہوئے ہیں، حفیظ کو یہ پسند نہیں تھا، انھوں اپنی غزلوں میں اس حقیقت کو بیان کیا ہے، مشاعروں میں بڑا شاعر اسی کو خیال کیا جاتا ہے، جو زیادہ قیمت وصول کرے، ترنم ہی کامیابی کی شاہ کلید ہے، اس طرح کے موضوعات کو بھی انھوں اپنی غزلوں میں جگہ دی ہے، اور سادگی کے ساتھ غزل گوئی کو اپنا شیوہ بنایا، اسی کو پسند کرتے تھے، اشعار کے پس منظر پر گفتگو کرنا انھیں پسند نہیں تھا، انھوں شعرا پر تنقید کی، ساتھ ہی ہمدردی کا اظہار بھی کیا، اور تنقید کی عظمت سے بھی واقف کرایا۔

تنقید سے شاعر کی تقدیر سنورتی ہے
تعریف کے متوالے تنقید گوارا کر

حفیظ کی غزلوں میں علامہ اقبال کا رنگ بھی نظر آتا ہے، انھوں نے عشق و عقل اور خرد و جنوں کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے، جہاں اقبال کا نظریہ ہی اُن پر غالب ہے اور عقل کے مقابلے میں عشق کو انھوں نے فوقیت دی۔ خرد کو جنوں سے کم تر گردانا ہے۔ حفیظ کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے اور اس رنگ کو محسوس کیجیے:

خرد کرتی حقیقت آشنا کیا
سوائے وہم اُس کے پاس تھا کیا
مسلک عشق تو سیدھا سادہ تھا
عقل نے ڈال دی الجھنوں کی طرح

حفیظ نے اپنی غزلوں میں جن موضوعات کو اختیار کیا ہے، اس سے یقینی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے، کہ انھوں زندگی کو قریب سے دیکھا، اور اس پر تبصرہ کیا ہے، اور اصلاح حال کی کوشش کی، ان کی غزلیں ہر اس موضوع کو بڑی چابک دستی کے ساتھ بیان کرتی ہیں، جو نام نہاد نظم نگاروں کے موضوعات ہیں، ان تمام موضوعات کو حفیظ کسی نظریے اور کسی تحریک کی پابندی کے بغیر بیان کرتے ہیں، اور پورے طور پر اپنے احساس کو غالب رکھا ہے، البتہ اس بات کو یقینی طور کہا جا سکتا ہے کہ ان کے یہاں نئی لفظیات نہیں ہیں، انھوں نے جدید علامات اور لفظیات نہیں تراشے ہیں، بلکہ لفظیات میں وہ میر و غالب کے ہی پیروکار نظر آتے ہیں، ان کا کمال یہ ہے کہ اس قدیم لفظیات کو انھوں نے جدت کے حامل موضوعات عطا کیے ہیں، جس کے باعث وہ غزل گوئی میں کامیاب ہوئے، حالانکہ کہیں ان کی لفظیات میں جدت بھی نظر آتی ہے، لیکن عام طور پر وہ ان کا طرز شاعری نہیں ہے۔ انھوں نے سادہ و آسان الفاظ کی جانب رغبت کی ہے، مشکل ترین الفاظ اُن کی غزلوں میں کم نظر آئیں گے۔ حفیظ کی غزلوں کو سمجھنے کے لیے لغت کی حاجت کم ہوتی ہے، اُس کے ساتھ ہی ان کی غزلوں میں غنائیت کا عنصر بھی پایا جاتا ہے، اُن کی غزلیں زبان پر جاری ہو جاتی ہیں، اُن کا غزل پڑھنے کا انداز بڑا دلچسپ اور سادہ تھا، ایسا لگتا تھا جیسے آواز دل سے نکل رہی ہے اور دل پر دستک دے رہی ہے۔

حفیظ میرٹھی نے نظمیں بھی کہی ہیں، جن کے موضوعات اور فکر کا دائرہ محدود ہے، کچھ رثائی نظمیں ہیں، مثلاً اپنی اہلیہ کی وفات پر انھوں نے نظم کہی ہے، حفیظ کی دو شادیاں ہوئیں، لیکن اس کے باوجود انھیں تنہائی کی تلخ زندگی سے واسطہ پڑا، شریک حیات کی جدائی کے غم سے وہ ٹوٹ گئے، درد و غم کی اسی کیفیت کو انھوں نظم کا پیکر عطا کیا ہے، دوسری شادی کے بعد وہ سنبھلے اور زخم مندمل ہونے لگا، لیکن دوسری اہلیہ کی وفات پر وہ زخم ناسور بن گیا، قلب کی کیفیت ناگفتہ بہ ہوگئی، جیسے دریا میں تلاطم بپا ہو جائے، آہ و بکا سینہ چیر کر باہر نکل آئے، انہی کیفیات سے حفیظ زوجۂ ثانی کی وفات پر دوچار ہوئے اور غم کے جذبات و احساسات کو نظم کا لباس عطا کیا، نظم کا عنوان ہی اس حقیقت کی جانب اشارہ کرتا ہے، 'میں ٹوٹ گیا ہوں' اور 'درد ہمارا' وہ تمام چیزیں ان دونوں نظموں میں جمع ہو گئیں، جو رثا کی بنیاد ہیں۔

حفیظ جن علمی و ادبی شخصیات کو پسند کرتے تھے، ان کے نظریات و فکر پر اعتماد کرتے تھے، جن کا فن و فکر انھیں متاثر کرتا تھا، جن کے علم و ادب کے ثنا خواں تھے، ان شخصیات کی شان میں نذرانۂ عقیدت بھی پیش کیا ہے، اور ان کے مقام و منصب، ان کے افکار اور ان کی شخصیت کی خوبیاں و خصوصیات ظاہر کی ہیں، ان میں مولانا مودودی کی شان میں 'نذرانہ عقیدت' ہے، جو لندن کے ایک پروگرام میں پیش کیا، روش صدیقی اور بہادر شاہ ظفر کی یاد میں کہی گئی نظمیں ہیں، جو مختصر ہیں، لیکن ان شخصیات کے کمالات کو بخوبی ظاہر کرتی ہیں۔

حفیظ کسی ادبی نظریے کے پابند نہیں رہے، وہ ترقی پسند تحریک کے سکہ بند موضوعات تک محدود ہیں، اور نہ ہی کسی ادبی تحریک و تنظیم کی پابندی انھیں گوارا ہے، ان کی اپنی فکر اور اپنا دائرہ ہے، جس کی حدود کے باوجود وہ کامیاب ہیں، البتہ ابتدائی دور میں جب انھوں نے شاعری کی دنیا میں قدم رکھا تو ادبی دنیا میں ترقی پسند تحریک بام عروج پر تھی، اور میرٹھ بھی اس کے اثر سے خالی نہیں تھا، میرٹھ میں ظ انصاری کی صدارت میں ترقی پسندوں کی نشستیں ہوتی تھیں، حفیظ بھی ان میں شریک ہوتے تھے اور اپنا کلام پیش کرتے تھے، ایک نشست میں حفیظ نے اپنی نظم نغمۂ آدم سنائی جس کے حوالے سے ظ انصاری رقم طراز ہیں:

''ظ انصاری نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا کہ نشست شروع ہونے سے پہلے ترقی پسند ادب پر جو گفتگو ہو رہی تھی اس کے خلاصے کے طور پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ حفیظ صاحب کی نظم 'نغمۂ آدم' مکمل ترقی پسند ادب ہے۔''

(حفیظ میرٹھی حیات اور شاعری، ص:32)

حالات حاضرہ پر مبنی نظمیں بھی حفیظ کی شاعری میں موجود ہیں، انھوں نے دعائیہ نظمیں بھی کہی ہیں، اور شادی کے موقع پر سہرے بھی لکھے اور 'شبھ کامنائیں' کے عنوان سے ایک نظم کہی ہے، جو شادی کی خوشی کے اظہار دعاؤں اور مبارکباد پر مبنی ہے۔

حفیظ میرٹھی ہندو مسلم اتحاد و اتفاق کے علمبردار تھے، اتحاد و اتفاق کے قیام کے لیے انھوں نے دینک جاگرن اخبار کی فرمائش پر 'امن کی شبنم' نظم کہی ہے، حالانکہ وہ اس طرح فرمائشی شاعری کو پسند نہیں کرتے تھے اور اسے دباؤ کی شاعری کہتے تھے، اس کے باوجود انھوں نے ''امن کی شبنم'' نظم کہی اور اتحاد و اتفاق کی کوشش کی، فساد کے زخموں پر مرہم رکھا۔

ملاحظہ کیجیے اس نظم کے اشعار:

امن کی شبنم سے ہی کھلتے ہیں تیوہاروں کے پھول
اب نہ لے چمن میں کوئی آگ برسانے کا نام
ہم اگر تڑپیں گے تم بھی بے مزہ ہو جاؤگے
کون لے گا ماتمی ماحول میں گانے کا نام

حفیظ میرٹھی کی نظم 'ارتقا' بھی خوب ہے، جو انسان کی مادی ترقی اور سماجی اخلاقی مذہبی تنزلی کو بیان کرتی ہے، اس کے علاوہ، 'گیٹ اپ' کے عنوان سے بھی انھوں نے نظم کہی ہے، جو قرآن کریم کی ظاہری خوبیوں کو بیان کرتی ہے، اس کے الفاظ، چھپائی، رسم الخط وغیرہ کے حسن کو ظاہر کرتے ہے۔

حفیظ میرٹھی کی نظموں میں بھی غزلوں جیسی نغمگی موجود ہے، ان کی نظمیں سادہ ہیں، غزل کی سی غنائیت ان کی نظموں میں موجود ہے، علامات و استعارات پیچیدہ الفاظ اور بعید الفہم طرز کی بو بھی ان کی نظموں میں موجود نہیں ہے، موضوع سادہ، مفہوم بالکل واضح ہے، البتہ الفاظ کی نغمگی، سوز اور قلبی کیفیت کا برملا اظہار ان کی نظموں کو دلچسپ اور خوبصورت بناتا ہے، جس سے انتہائی محدود ہونے کے باوجود حفیظ کی نظمیں اپنا تاثر قائم کرنے میں کامیاب ہوتی ہیں، یہ نظمیں فطری طور پر غزل سے لگاؤ کی بین دلیل ہیں۔

■

Rahat Ali Siddiqui
Gaon, Mohammad Pur Mafi
Post Khatoli
Distt.:Muzaffar Nagar - 251201 (UP)
Mob.:9557942062

حیات اللہ انصاری کے افسانوں کا انفراد و اختصاص

ندرالاسلام

حیات اللہ انصاری (1912-1999) نے ایک ایسے عہد میں لکھنے کی شروعات کی، جب اردو افسانے کی روایت پر طویل عرصہ نہیں گزرا تھا۔ اس لیے اس عہد میں داستان کا اثر تھا یا پھر پریم چند کی روایت تھی، پریم چند نے اردو افسانے میں مثالیت پسندی اور حقیقت نگاری کی جو روایت قائم کی تھی وہ اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں ایک غالب رجحان کے طور پر آگے بڑھ رہی تھی، ہندی میں جینیندر کمار، بھیشم ساہنی اور جب کہ اردو میں سدرشن اور سہیل عظیم آبادی ایسے افسانہ نگار تھے جو پریم چند کی قائم کردہ اس روایت کو آگے بڑھا رہے تھے۔ ایسے میں حیات اللہ انصاری اردو افسانے کے افق پر نمودار ہوئے، ظاہر ہے اس عہد میں کوئی ایسا فن کار نہیں تھا کہ جس کا فن حد درجہ وسیع اور قابل تقلید ہو۔ حیات اللہ انصاری کے یہاں آدرش واد کا رویہ بھی پایا جاتا ہے اور پریم چند کی بے رحم سماجی حقیقت نگاری کا رنگ بھی ملتا ہے، ساتھ ہی کچھ نئے تجربات بھی نظر آتے ہیں۔ یعنی انھوں نے داستانوی روایت اور پریم چند کے اثرات کے ساتھ کچھ نیا رنگ بھی بکھیرا ہے۔ اس حوالے سے پروفیسر شارب ردولوی نے بہت ہی عمدہ بات کہی ہے:

”حیات اللہ انصاری اردو کے اہم ترین افسانہ نگار ہیں۔ جنھوں نے اردو افسانوں کو داستان اور پریم چند کی روایت سے ہٹ کر نئی بنیاد فراہم کی۔ حالانکہ انھیں پریم چند کے بیانیہ کا ایک مضبوط حصہ مانا جاتا ہے، لیکن قصہ گوئی کی بنیاد کو اگر دیکھیں تو محسوس ہوگا کہ پریم چند کے بیانیہ کے متوازی ایک اور بیانیہ ہے جو اپنے موضوع، رویے اور برتاؤ میں ان سے مختلف ہے۔ یہ بیانیہ حیات اللہ انصاری کا ہے، بلکہ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ ان کے افسانوں اور ناولوں میں اردو کے نئے فکشن کے آثار نظر آتے ہیں“۔

(شارب ردولوی، حیات اللہ انصاری کی کہانی کائنات کے بیک کور سے ماخوذ، مرتبہ: عشرت ناہید، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2017)

مذکورہ چند جملوں سے کئی باتیں واضح ہوتی ہیں اور ان باتوں کو انھوں نے بڑے ہی خوبصورت انداز میں پیش کر دیا ہے۔ گویا حیات اللہ انصاری کے افسانوں کا مزاج داستانوی ہے۔ پریم چند کی روایت کا اثر ہے، مگر حیات اللہ نے افسانے کی بنت اور موضوعات میں کچھ الگ راہ بنائی ہے۔ پریم چند اور حیات اللہ انصاری کے افسانوں کے مطالعے کے بعد کئی چیزیں الگ نظر آئیں گی۔ پہلی بات یہ ہے کہ پریم چند کے یہاں کسانوں کے مسائل کی عکاسی جس طرح زیادہ ہوئی، اس طرح حیات اللہ انصاری کے یہاں کم ہوئی ہے۔ ان کے موضوعات بھی مختلف ہیں۔ اس لیے پروفیسر شارب ردولوی کی زبان میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ پریم چند اور حیات اللہ کے افسانوں کی زمین تو ایک ہے لیکن دونوں کے افق الگ الگ ہیں۔

حیات اللہ انصاری کے افسانوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ان کے کل چالیس افسانے شائع ہوئے۔ ڈاکٹر عشرت ناہید نے ان کے افسانوں کا کلیات ”حیات اللہ انصاری کی کہانی کائنات“ کے نام سے شائع کیا۔ انھوں نے بھی افسانوں کی حتمی تعداد نہیں بتائی۔ انھوں نے اس کلیات کے جواز کے متعلق یہ لکھا کہ حیات اللہ کے افسانوں کے مجموعے نہیں مل رہے تھے اور کئی افسانے جو ادھر ادھر شائع ہوئے اور کسی مجموعے میں شامل نہیں تھے، ان سب کو جمع کر دیا ہے۔ انھوں نے اس کلیات میں کل 37 افسانوں کو شامل کیا ہے اور یہ لکھا ”حیات اللہ انصاری نے بہت زیادہ تعداد میں افسانے نہیں لکھے لیکن وہ اپنی منفرد پہچان بنانے میں اپنے پہلے افسانے سے ہی کامیاب ہو گئے۔“

(ڈاکٹر عشرت ناہید، مرتبہ: حیات اللہ انصاری کی کہانی کائنات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2017، ص 20)

اس لیے تلاش و جستجو کے بعد بھی یہ کہنا آسان نہیں ہے کہ حیات اللہ کے مکمل افسانوں کی تعداد کتنی ہے۔

حیات اللہ انصاری کا بہت ہی مشہور افسانہ 'ڈھائی سیر آٹا' ہے، جس کے بین السطور میں انھوں نے جہاں معاشی نظام کی ابتری کی طرف اشارہ کیا، وہیں سماجی اونچ نیچ کے معاملات کو بھی بڑی خوب صورتی سے پیش کیا ہے۔ اس افسانے کی جڑ میں سماجی نظام کی ابتری، بے مروتی اور دل شکن داستان پوشیدہ ہے۔ ایسا افسانہ لکھنے کے لیے کھلی

بلکہ برہنہ آنکھوں سے سماج کو دیکھنا لازمی ہے۔ حیات اللہ انصاری نے برہنہ نظروں سے سماج کے حقیقی پہلوؤں کو دیکھا اور دیکھنے کے بعد گہرائی سے غور و فکر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس افسانے کی سطر سطر کی فضا بھیگی بھیگی ہے۔ قاری نم دیدہ صفحات سے گزرتا ہے۔ یہ کہانی اکہری نہیں ہے، بلکہ متوازی طور پر دو کہانیاں آگے بڑھتی ہیں۔ ایک مولا کے گھر کی داستان ہوتی ہے اور دوسری کہانی شوکت میاں کے گھرانے سے جڑی ہوئی ہے۔ افسانہ نگار نے ان دونوں تہہ دار کہانی کو بڑی خوب صورتی سے برتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں تجسس اخیر تک باقی رہتا ہے۔ اس افسانے پر مزید کچھ بات کرنے سے پہلے ایک اقتباس پیش کرنا لازمی ہے:

''دس بجنے کے قریب تھے مگر کھانا ابھی تک تیار نہیں ہوا تھا۔ شوکت میاں اسکول جانے کو تیار تھے۔ ان کی پھوپھی نے جلدی جلدی دو چار روٹیاں ڈلوادیں اور چار کباب تل دیے۔ پھر جلدی سے ان کو میز پر چن، شوکت میاں کو کھانا کھانے کے لیے آواز دی۔ شوکت میاں ایک ہاتھ میں کتابیں لیے، دوسرے ہاتھ سے شیروانی کے بٹن لگاتے کھانے کے کمرے میں گھس گئے اور بلا ہاتھ دھوئے کھانا شروع کر دیا، مگر پہلا ہی نوالہ منہ میں رکھا تھا کہ ایسا منہ بگاڑا گویا کونین پی گئے ہوں۔ جلدی سے وہ نوالہ پانی کے سہارے پیٹ میں پہنچا دیا اور پھر روٹی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا توڑ کر منہ میں رکھا۔ چبایا پھر منہ بگاڑ بولے۔

''پھوپھی جان، آٹا خراب''

(حیات اللہ انصاری، بھرے بازار میں، تعلیمی پریس لاہور، 1935، ص 52)

اس اقتباس سے افسانے کا نکتۂ عروج واضح ہوتا ہے اور کہانی دل چسپی کی حدوں میں داخل ہونے لگتی ہے کیوں کہ اس میں ہی آٹے کا تذکرہ سامنے آتا ہے۔ یہ اختتامی اقتباس نہیں، بلکہ افسانے کے وسط سے ماخوذ ہے۔ اس اقتباس سے اس افسانے کی سفاک حقیقت نگاری سامنے آتی ہے اور مارکس کا نظریہ بھی شامل نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس افسانے کو نیاز فتح پوری نے اردو کا پہلا مارکسی افسانہ قرار دیا ہے۔ کیوں کہ اس میں افسانوی لب ولہجہ سماجی اونچ نیچ سے جا کر مل جاتا ہے اور مکروہ سماج ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس افسانے کی سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس میں مارکسی نظریہ کی شمولیت کے باوجود نہ گھن گرج ہے اور نہ ہی کوئی الجھاؤ، بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حیات اللہ نے تخیل کی دنیا میں تجربہ کیا ہے اور تخیل کی دنیا کے تجربے کو تخیل کی فکری بھٹی میں اس قدر پکایا کہ وہ خیال کندن بن گیا اور کندن بننے کے بعد ہمارے سماج پر ایک تیکھا طنز بن گیا ہے۔ اس حوالے سے انور سدید لکھتے ہیں:

''حیات اللہ انصاری نے طبقاتی تضاد کو حقیقی زندگی سے آشکار کیا۔ ان کے افسانوں میں درد اور کرب زیر میں سطح لہر کی طرح رواں دواں نظر آتا ہے۔ سہارے کی تلاش، انوکھی مصیبت، موزوں کا کارخانہ اور ڈھائی سیر آٹا میں حیات اللہ انصاری ایک بے رحم حقیقت نگار نظر آتے ہیں۔''

(انور سدید، اردو ادب کی مختصر تاریخ، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، 1991)

اسی طرح 'انوکھی مصیبت' حیات اللہ انصاری کا ایک بہترین افسانہ تسلیم کیا جاتا ہے، جو بہ ظاہر ایک مزاحیہ افسانہ ہے، مگر گہرائی سے اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں بھی انھوں نے بہترین انداز میں سماجی اونچ نیچ کے مسئلے کو بہتر طریقے سے پیش کیا ہے۔ اس افسانے سے اندازہ کرنا کوئی مشکل نہیں کہ اس میں زیریں لہریں مساوات کی ہیں۔ گویا انھوں نے افسانے کے آخر میں پیغام دینے کی کوشش کی کہ انسان برابر ہیں۔ اس لیے ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں ہونی چاہیے۔ 'ڈھائی سیر آٹا' کے بین السطور میں انسانی ہمدردی واضح انداز میں سامنے آتی ہے اور 'انوکھی مصیبت' میں بھی احترام آدمیت کا معاملہ بہت انوکھے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

اگر اس افسانے کو فنی اعتبار سے 'انوکھی مصیبت' کے پس منظر میں دیکھیں تو انتہائی کمزور افسانہ ہے اور غیر فطری بھی۔ کیونکہ اس افسانے کو جس انداز سے پیش کیا گیا اور کہانی کو بہت دور لے جانے کے بعد ختم کیا گیا، اس میں بناوٹ ہے۔ غیر فطری اس طرح ہے کہ کسی فرد کو قضائے حاجت کا معاملہ درپیش ہو تو وہ گھر گھر نہیں پوچھتا ہے، مگر اس افسانے میں قضائے حاجت کے لیے گھر گھر جا کر پوچھا جاتا ہے۔ گھر گھر جا کر پوچھنا تو اس سے بھی بری بات ہے کہ کوئی مالدار اور عہدے دار فرد جنگل میں ہی فارغ ہو جائے۔ اس میں یہ دکھایا گیا کہ جنگل میں ٹلکفر فارغ نہیں ہو رہا ہے اور وہ حکیم جی کے یہاں جاتا ہے۔ اس کے بعد ایک دوسرے فرد کے یہاں بھی جاتا ہے۔ شاید آج تک ہماری سوسائٹی میں ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا ہوگا کہ کوئی فرد گھر گھر جا کر قضائے حاجت کے لیے بیت الخلا طلب کرے۔ اگر کوئی ایسا واقعہ پیش آیا ہوگا تو بھی گھر گھر پوچھنے کی نوبت بالکل ہی نہیں آئی ہوگی، بلکہ پہلے ہی گھر والے نے اس کی اجازت دے دی ہوگی۔ کہانی کو 'انوکھی مصیبت' کے نام پر بہت دور تک لے جانے اور اسی کو مرکزی نکتہ بنا کر کہانی پیش کرنے سے افسانے میں تصنع کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ اس طرح یہ

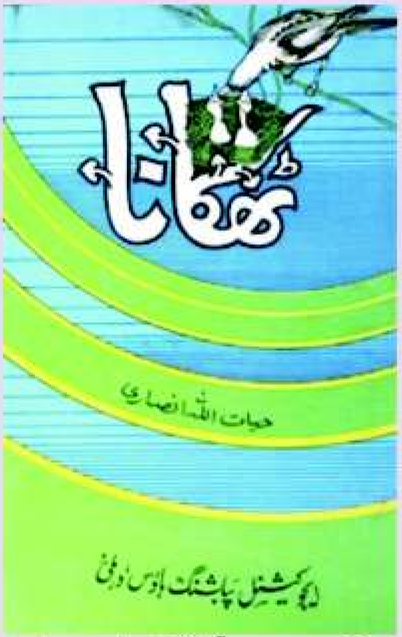

افسانہ کمزور ہو جاتا ہے۔ تصنع کی کئی مثالیں اس افسانے سے پیش کی جاسکتی ہیں۔

'انوکھی مصیبت' کو قضائے حاجت اور سماج سے جوڑ کر دیکھیں گے تو کہانی میں مصنوعی کیفیت نظر آئے گی، مگر اسی کہانی کو علامتی تسلیم کرلیں تو اس میں کچھ جان آجاتی ہے۔ 'انوکھی مصیبت' کو 'بنیادی حاجت' کے نام اور معاملات سے جوڑ دیں تو اس افسانے کی اہمیت مزید بڑھ جائے گی۔ وہ اس طرح کہ انسان بنیادی ضرورت کے لیے دوڑ دھوپ کرتا ہے۔ ادھر ادھر چکر کاٹتا ہے۔ اس کے بعد بھی اس کی پریشانی ختم نہیں ہو پاتی ہے۔ کیوں کہ سماج میں ایسے لوگوں کا سایہ ہے جو انسانی ہمدردی سے عاری ہیں۔ جیسا کہ اس افسانے میں حکیم صاحب کا کردار ہے۔ ان کے اندر انسانی ہمدردی کا مادہ نہیں ہے۔ بنیادی ضرورت کو پوری کرنے کے لیے دنیا میں ہر فرد پریشان ہے۔ یہاں تک بسا اوقات بڑے سے بڑا آدمی بھی پریشان ہے۔

حیات اللہ انصاری کے افسانوں میں تہذیب کا تصادم بھی بہت ہے۔ کیونکہ انھوں نے ایک طرف موجودہ عہد کے تہذیبی پس منظر کو پیش کیا ہے تو وہیں دوسری طرف انھوں نے ماضی کی تہذیب سے سبق حاصل کرتے ہوئے بہت کچھ لکھا ہے۔ 'شکستہ کنگورے' نامی افسانے کو اس ضمن میں اولیت حاصل ہے۔ اس افسانے میں حیات اللہ انصاری نے بڑے طمطراق سے ٹوٹتی بکھرتی تہذیب کو مجسم کیا ہے۔ پروفیسر شہزاد انجم نے اس افسانے کے متعلق لکھا ہے:

''افسانہ 'شکستہ کنگورے' اس شکست خوردہ اور مٹتی ہوئی تہذیب کا اعلامیہ ہے جس میں نئی نسل نئے خوابوں کو

ذہنوں میں بسا کر نئی تبدیلی کی خواہاں ہے۔ جاگیردارانہ نظام کا زوال ہو چکا ہے۔ اب ان کا سماج میں وہ وقار وافتخار باقی نہیں رہا۔ اس عظمت رفتہ کو حاصل کرنے کی خواہش بھی اس خاندان کی نئی نسل میں شدید ہے۔''

پروفیسر شہزاد انجم کی اس بات سے کلی اتفاق کیا جاسکتا ہے کہ اس افسانے کا سرا مٹتی ہوئی تہذیب سے ملتا ہے، مگر اس تناظر میں پوری کہانی کارآمد نہیں ہوتی ہے۔ البتہ کہانی کی ابتدائی سطروں میں پرانی تہذیب اور خاندانی دبدبے کے ختم ہونے والے معاملے سے مٹتی تہذیب کی جھلکیاں نظر آتی ہیں، مگر جب اس سے کسانوں کے حقوق کی بحالی کا مسئلہ جڑ جاتا ہے اور منیر کسانوں کا ہمدرد بن کر ابھرتا ہے تو افسانہ الجھ جاتا ہے۔

الغرض حیات اللہ انصاری کے افسانوں کے مطالعے کے بعد کہا جاسکتا ہے کہ ان کے یہاں زمانے سے انحراف کا رویہ پایا جاتا ہے۔ کیوں کہ انھوں نے پریم چند کے عہد میں قلم پکڑنا سیکھا۔ اس عہد میں انھوں نے آدرش کا رویہ دیکھا۔ داستانوی فضا میں عشقیہ جذبات اور ہندوستانی کھیتوں کی کہانیاں سنیں۔ ظاہر ہے ایسی کہانیاں سننے کے بعد ان کا اثر قبول کرنا لازمی تھا، لہٰذا انھوں نے ان باتوں کا اثر قبول کرکے داستانوی اسلوب بھی اختیار کیا ہے۔ 'کالا دیو' اور 'خوں خوں میاں' جیسے افسانوں میں داستان کا اثر قبول کرتے ہوئے بہترین انداز میں کہانیاں پیش کیں۔ گویا انھوں نے اپنے زمانے سے سرتاپا انحراف تو نہیں کیا، مگر اس میں جدت پیدا کرنے کی کوشش۔ ان کہانیوں میں ایسی جدت پیدا کی جو نہ صرف ان کے زمانے کے لحاظ سے جدید رویہ تھا، بلکہ آج کے عہد میں بھی وہ ایک جدید رویہ ہے۔ جدید رویوں سے سروکار رکھتے ہوئے انھوں نے اپنے زمانے سے آگے زمانے کی بات کہی۔ ان کے ان رویوں پر غور کرنے کے بعد کہنا پڑتا ہے کہ کوئی ادیب اپنے زمانے میں ہی قید نہیں رہتا ہے، بلکہ صدیوں آگے کی بات سوچتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حیات اللہ انصاری نے اپنے زمانے سے بہت آگے کی بات کی ہے، اسّی سال پہلے لکھی گئی کہانی میں آج کے زمانے کی عکاسی بہت خوب صورتی سے ہوئی ہے۔

داستانوی اسلوب کی ایک بڑی خصوصیت مقفّٰی و مسجع عبارت ہے۔ حیات اللہ انصاری کے افسانے پڑھتے چلے جائیں کہیں بھی عبارت آرائی کا احساس نہیں ہوتا ہے، بلکہ انھوں نے ہر جگہ بیانیے سے سروکار رکھا۔ عبارت آرائی سے کام نہیں لیا۔ فن کار کو جب اپنی فن کاری پر بھروسہ ہو تو غیر ضروری طریقوں سے قاری کو پریشان نہیں کرتا ہے۔ نہ عبارت آرائی کرتا ہے اور نہ ہی چونکانے کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ حیات اللہ انصاری اپنے فن سے مطمئن تھے، اس لیے انھوں نے غیر ضروری طریقوں سے اپنے افسانوں میں خوفناکی اور حیرانی کی فضا قائم نہیں کی ہے۔ افسانوں میں وہ جملوں پر جملے بٹھاتے نظر آتے ہیں اور ان جملوں میں از خود حقیقت بیانی اور سحر آگیں فضا قائم ہوتی چلی جاتی ہے۔

حیات اللہ انصاری کا تعلق چوں کہ صحافت سے بھی تھا، اس لیے انھوں نے صحافت کا بھرم کچھ یوں رکھا کہ عبارت آرائی سے خود کو محفوظ رکھا۔ صحافیوں پر زبان نہ جاننے کا الزام عائد بھی کیا جاتا ہے، مگر حیات اللہ انصاری کے فن میں زبان کی خامیوں کا ایسا کوئی عنصر نہیں ہے کہ اس پر متحسن کیا جائے گا۔ بازاری پن سے اپنے افسانوں کو انھوں نے بڑی کامیابی سے بچایا ہے۔ یہی رویہ انھیں منفرد بناتا ہے۔ حیات اللہ انصاری کے افسانوں کا بیانیہ اس قدر مکمل ہے کہ کسی بھی مقام پر بھرتی کی کیفیت نظر نہیں آتی۔

اس کے علاوہ حیات اللہ انصاری کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ خیال کو افسانہ بنانے کا ہنر جانتے تھے۔ کسی واقعے پر افسانوی رنگ چڑھانا آسان تو ہے، مگر خیال کو افسانہ بنانا بہت مشکل ہے۔ حیات اللہ انصاری کے یہاں یہ فن کاری نظر آتی ہے کہ وہ خیال کو افسانہ بنا دیتے ہیں۔ اسی طرح ان کے افسانوں میں طبقاتی سماج کا رویہ بہت واضح انداز میں ملتا ہے۔ ان کے عہد میں طبقاتی شعور کا معاملہ انتہائی پر پیچ تھا۔ انھوں نے اس پیچیدگی کو بڑی خوب صورتی سے پیش کیا ہے۔ ان کے افسانوں کے بین السطور میں طبقاتی نظام کی خطرناکی بہت واضح طور پر ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افسانے کی سرشت میں ایسی آواز بہت صاف طور پر سنائی دیتی ہے۔ ایک تو یہ اس عہد کا مزاج تھا۔ دوسرا یہ کہ انھوں نے سماج کو بڑی گہرائی سے دیکھا تھا اور ایک حقیقت پسند افسانہ نگار کے طور پر سماج کی تمام مثبت و منفی اقدار کو پرکھا تھا۔ ان کے افسانوں میں حساس نظروں کی کرشمہ سازی کچھ یوں واضح ہوتی ہے کہ ہم بھی اس عہد سے اچھی طرح واقفیت حاصل کر لیتے ہیں، جس عہد میں ہم موجود نہیں ہوتے ہیں۔ حیات اللہ انصاری کے افسانہ بننے کے طریقے سے یہ بات بہت واضح ہوتی ہے۔ ہم ان کے عہد میں نہ رہ کر بھی ان کے عہد کی بات سنتے ہیں اور وہ ہمارے عہد کے نہ ہو کر اپنے عہد میں رہ کر ہمارے عہد کی بات کرتے ہیں۔ یہی تو دراصل فن کاری ہے۔

یہ بات بھی اپنی جگہ مسلّم ہے کہ ہمارے عہد سے پریم چند کا عہد مختلف تھا۔ ساتھ ہی حیات اللہ انصاری کا عہد بھی مختلف تھا۔ پریم چند کے اثرات قبول کرنے کے ساتھ ساتھ حیات اللہ انصاری نے اپنا رنگ بھی جمایا ہے۔ موضوعات کے سلسلے میں وہ پریم چند سے ہم آہنگ بھی ہیں اور الگ بھی۔ ہم آہنگ اس طرح کے کہ ان کے یہاں بھی آدرش کا رویہ پایا جاتا ہے۔ ان کے یہاں بھی مثالیت پسندی ہے۔ خلوص کے ساتھ افسانے کو آگے بڑھایا جاتا ہے۔ داستانوی اسلوب اختیار کیا جاتا تھا، مگر ایک بات حیات اللہ انصاری کے یہاں یہ ہے کہ انھوں نے بہت کم افسانے لکھے۔ کل چالیس کے آس پاس ان کے افسانوں کا پتا چلتا ہے۔ پھر ان میں موضوعات کی رنگا رنگی بھی بہت خوب ہے۔ پریم چند کے یہاں گاؤں دیہات کے مسائل تو ہیں، حیات اللہ کے یہاں بھی ہیں، مگر حیات اللہ نے شہر کو بھی پیش کیا اور دیہات کو بھی۔ شہری مسائل پیش کرنے میں حیات اللہ انصاری ان سے بہت آگے ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ حیات اللہ انصاری نے 1936 کے بعد بھی دنیا دیکھی ہے۔ اس لیے انھوں نے شہروں کو بڑے سلیقے سے پیش کیا، حالاں کہ پریم چند کا انتقال بہت پہلے ہو چکا تھا۔ یہ بات تسلیم کرتے ہوئے بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ حیات اللہ انصاری کا مجموعہ 'بھرے بازار میں' پریم چند کی حیات میں ہی شائع ہو چکا تھا۔ اس مجموعے میں 'انوکھی مصیبت'، 'آخری کوشش' میں شہری مزاج اور شہری معاملات کو جس خوب صورتی سے پیش کیا ہے، اس کی عکاسی پریم چند کے یہاں نہیں ہوتی ہے۔ اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ حیات اللہ انصاری نے دیہی مناظر کو بھی بڑے حسین انداز میں پیش کیا ہے اور شہری مزاج کو بھی۔

حیات اللہ انصاری نے اپنے افسانوں میں حیات نو کا ایک منضبط نظام پیش کیا ہے جس میں سماج کی کراہ بھی سنائی دیتی ہے اور اس کراہ کو ایسی آواز دی گئی کہ ایوان بالا اور طبقۂ اشرافیہ کے محلوں میں زلزلہ آ جاتا ہے۔ سماجی اونچ نیچ کو اس پیرایے میں بیان کیا کہ ہر حساس دل میں چبھن سی ہونے لگتی ہے۔ اس طرح وہ نشتریت سے بھی کام لیتے ہیں اور طنز کے پہلو کو بھی ابھارتے ہیں۔ بات کہتے کہتے نہ وہ چیختے ہیں اور نہ ہی اتنا نرم رویہ اختیار کرتے ہیں کہ ان کی بات لوری بن جائے۔ باتوں کو اس سلیقے سے پیش کرتے ہیں کہ سلیقہ مندوں کو غور و فکر کا طریقہ ہاتھ آ جاتا ہے۔

■

Nazrul Islam
Room No: 308, Jhelum Hostel, JNU
New Delhi - 110067
Mob.:9250411070
Email.: nazruljnu27@gmail.com

تبصرہ وتعارف

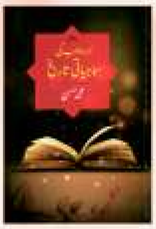

اردو ادب کی سماجیاتی تاریخ

مصنف: محمد حسن

صفحات: 334، قیمت: 160 روپے، طباعت ثانی: 2020

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: امتیاز احمد علیمی

S-2/5A تیسری منزل، فاطمہ اپارٹمنٹ، جوگا بائی نئی دہلی

سماجیات ایک مستقل شعبہ ہے جس میں سماجی علوم کی تعلیم دی جاتی ہے اور ادب کو سماج کے رشتوں اور سماج کو ادب کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ سماج کے وسیلے سے ادب کے صرف سماجی پہلو پر ہی دھیان نہیں دیا جاتا بلکہ اس کے عصری مسائل، اخلاقی واقداری روایات، اس کے ذوق جمال اور ذوق سلیم سبھی کی شناخت کرائی جاتی ہے۔ ایک ادیب یا تخلیق کار کی تخلیق کے ساتھ اس کی ذاتی زندگی، اس کے دیہی اور شہری تعلقات اور پیشے وغیرہ سبھی کو زیر بحث لاتی ہے۔ لیکن ادبی سماجیات، اس کی مبادیات اور اس کی تاریخ کیا ہے یہ اس کتاب کو پڑھتے ہوئے معلوم ہوا کہ ادب کی بھی اپنی سماجیاتی تاریخ ہوتی ہے۔ اس نئے علم کی روشنی میں اردو کی ادبی اور سماجیاتی تاریخ اور اس کے مختلف ادوار کو پیش کرنے کا کام بقول مصنف 'پہلی بار ہو رہا ہے'۔ یہ بات سچ ہے کہ اردو میں اس نئے موضوع کی طرف پہلی بار محمد حسن نے ہی متوجہ کرایا ورنہ اردو کی ادبی تاریخیں تو بہت لکھی گئیں لیکن اس نوعیت کی کتاب اردو میں نایاب ہے۔ محمد حسن نے سماجیاتی علوم کی روشنی میں اردو ادب کا مطالعہ کرتے وقت جن اہم پہلوؤں کو اپنے پیش نظر رکھا ہے ان میں سے ایک متن سے مختلف مفاہیم اور مطالب اخذ کرنے کی آزادی، دوسرا متن میں مختلف لکھنے والوں کے طبقاتی شعور اور ان کے انفرادی اور اجتماعی شعور کا اظہار اور اس کی نوعیت، تیسرا مختلف ادوار کے ادب میں اس دور کی عکاسی اور اس دور کے بعد کے ادوار میں اس کے معنی ومطالب کی توسیع اور چوتھا مختلف اصناف کے مصنفین کی طبقہ واری تقسیم۔ انھیں مذکورہ پہلوؤں کی روشنی میں اردو ادب کی سماجیاتی تاریخ پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس میں کامیابی بھی ملی۔

ادبی تاریخ کی تشکیل نو میں ایک ملک کے دوسرے ملک سے سماجی اور تجارتی روابط نے اہم کردار ادا کیا۔ قدیم، وسط اور جدید ہندوستان کی معاشی، تہذیبی وثقافتی اور تجارتی لین دین کے نتیجے میں شہری اور دیہی مرکزیت کا عمل کس طرح سے عمل میں آیا اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ سنسکرت، پراکرت، برج اور کھڑی بولی کے وجود پذیر ہونے کے اسباب کیا تھے۔ ان زبانوں کے نشیب وفراز نے دیہی، مدنی، قصباتی، علاقائی اور بین الاقوامی سطح پر کیا اثرات مرتب کیے۔ وسط اور مغربی ایشیا کے تاجروں کی آمد ورفت سے ہندوستان کی مختلف تمدنی اکائیوں، لسانی وحدتوں اور علاقائی منطقوں میں جس طرح کی ہلچل پیدا ہوئی اس کو تہذیبی اور سماجیاتی تاریخ کی روشنی میں بہت ہی منظم انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ابتدائی دور، رزمیہ دور، بھگتی دور، نشاط ثانیہ، انقلاب فرانس، صنعتی انقلاب، مغلیہ عہد، فورٹ ولیم کالج، 1857 کا غدر، جنگ آزادی وغیرہ کی سیاسی، سماجی، تہذیبی، مذہبی اور تجارتی اثرات کی روشنی میں اردو ادب کی تاریخ کی تشکیل نو کی گئی ہے۔ تفصیل کے لیے کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ محمد حسن نے ادبی سماجیات کے ایک بہت ہی اہم پہلو ادبی سرپرستی کے مسئلے پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ہر عہد میں ادب کی سرپرستی مختلف لوگوں اور طبقوں کے مابین رہی ہے جس کی وجہ سے تخلیقی ادب کے طرز اور روش، تکنیک اور انداز بیان پر ان طبقوں کے اثرات نمایاں رہے ہیں۔ مثلاً ایک زمانے میں دیہی سماج میں چوپال لوک گیتوں اور عوامی فن کاروں کی سرپرستی کا مرکز رہی پھر دیوان خانے اور درباروں کی، صنعتی دور میں عوامی ذرائع ترسیل کا، ان سبھی ذرائع اور وسائل نے ادب کے رنگ وآہنگ نفس مضمون، ہیئت اور تکنیک سبھی کو متاثر کیا۔ محمد حسن نے ادبی سماجیات کے مذکورہ پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ ادبی سماجیات کا بھی ایک اہم منصب ہے اور اسے نظر انداز کرنا ادب کی تفہیم اور اس کی سماجی معنویت کے ایک دلچسپ اور بصیرت آموز پہلو سے محرومی کے مترادف ہے۔ محمد حسن نے ماہرین سماجیات جنھوں نے سماج کے مطالعے میں ادب سے کام لینے کی روایت اور بنیاد ڈالی تھی ان کے پیش کردہ مختلف رویوں کا ذکر کیا ہے مثلاً ادب کو سماج کے کسی مخصوص دور کا آئینہ قرار دے کر اس سے اس دور کے بارے میں تہذیبی اور اقداری شہادتیں حاصل کرنا یا ادب کا جمالیاتی فن پارے کے بجائے مال تجارت کی حیثیت سے مطالعہ کرنا یا ایک مخصوص معاشرے پر کسی ادبی فن پارے کا ردعمل کس طرح ہوتا ہے وغیرہ۔ ادبی سماجیات جن اہم پہلوؤں پر اپنا نقطہ نظر مرکوز رکھتی ہے ان میں ایک ادب کی سرپرستی کرنے والے اداروں کا مطالعہ بھی شامل ہے اس کے علاوہ ادبی سماجیات کا سب سے زیادہ وسیع اور غالباً زیادہ معروضی شعبہ ادبی ذوق کا تجزیہ اس کے عوامل ومحرکات کا مطالعہ اور سماج پر اس کے اثرات کی نوعیت اور اس کے دائرۂ کار کا تعین ہے۔

مذکورہ بالا نکات کے علاوہ مزید جن اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے ان میں شاعری، ڈرامہ، داستان، ناول افسانہ وغیرہ بھی شامل ہیں۔ شاعری میں غزل، نظم، مثنوی اور مرثیہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ڈرامہ میں مشرقی اور مغربی ڈراموں کی روشنی میں ان کے سماجی پہلوؤں پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ داستان میں قصہ در قصہ کی روایت اور اس کے سماجی پہلو کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ ناول جسے صنعتی عہد کا رزمیہ کہا جاتا ہے اس کو سماجی نقطہ نظر سے دیکھنے اور پرکھنے کی سعی کی گئی ہے اسی طرح افسانے میں بھی اس کے مختلف جہات کو دیکھنے، سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے اور دونوں کے مابین بنیادی فرق کیا کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ ان تمام اصناف کے سلسلے میں انھوں نے مصنفین کے سلسلے میں تین حیثیتوں پر غور کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ پہلے پس منظر پھر پیشے یا ذرائع روزگار اور آخر میں ادبی سرپرستی۔ جب ان حیثیتوں سے کسی ادب اور فن کار کا مطالعہ کیا جائے گا تو اس کی تخلیقات میں سماجی پہلوؤں کو تلاش کرنا قدرے آسان ہو جائے گا۔ محمد حسن نے اردو ادب کی بیشتر اصناف سخن کی ادبیت اور سماجی پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور ہر صنف کے جانچنے اور پرکھنے کے کیا زاویے ہوتے ہیں یا ہو سکتے ہیں اس کو بھی بیان کیا ہے۔ اردو ادب کی سماجیاتی تاریخ کے مطالعے کے لیے یہ کتاب انتہائی اہم ہے۔ اس کے مطالعے سے ادب کی تفہیم کے مزید در وا ہوں گے۔ امید قوی ہے کہ علمی اور ادبی حلقوں میں اس کی مزید پذیرائی ہوگی۔

مکاتیب

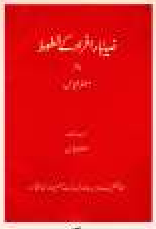

ضیابار افراد کے خطوط بنام اصغر عباس

ترتیب وتالیف: اصغر عباس
صفحات: 474، قیمت: 500 روپے
ناشر: ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ
مبصر: شارب ردولوی، C-95، سیکٹر-ای، علی گنج، لکھنؤ (یوپی)

خطوط ہماری زندگی کا بہت اہم حصہ ہیں۔ اس کی نوعیت بدلتی رہی ہے، کبھی اسے کبوتر لے جاتے تھے آج ان کی جگہ 'واٹس ایپ' نے لی ہے لیکن جب تک ایک انسان کا دوسرے انسان سے رشتہ ہے اس وقت تک پیغام رسانی کی اس کو ضرورت رہے گی، اور خطوط اسی پیغام رسانی کا سب سے اہم حصہ رہے ہیں۔ آج رفتہ رفتہ اس کی جگہ دوسرے ذرائع رسل و رسائل لیتے جا رہے ہیں لیکن خطوط کی اہمیت اپنی جگہ باقی ہے۔ اس لیے کہ خطوط صرف 'خیریت رسانی' کا ہی نہیں بلکہ کسی شخص، اس کے عہد اور اس کی شخصیت کے مطالعے کا بھی ذریعہ ہیں۔ غالب کے خطوط صرف اپنے دلچسپ مکالماتی اسلوب کے لیے ہی اہم نہیں ہیں بلکہ اس زمانے کے بہت سے حالات ایسے ہیں جن کے بارے میں صرف خطوط غالب ہماری معلومات کا ذریعہ ہیں۔ اس زمانے کی دلی کیسی تھی اور پھر اسے کس طرح کی مصیبتوں اور آفات سے گزرنا پڑا، اس کا چشم دید بیان صرف خطوط غالب میں ہی مل سکتا ہے۔ اس کے علاوہ خطوط ذاتی طور پر کسی شخصیت کو سمجھنے کے لیے ایک اہم ماخذ ہیں خواہ وہ مختلف اشخاص کے کسی ایک شخص کے نام ہوں یا کسی ایک شخص کے مختلف اشخاص کے نام۔ خط کی نوعیت کچھ بھی ہو لیکن محقق کے لیے وہ ایک تہذیبی وتاریخی اثاثے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

آج کسی بڑی شخصیت کے نام آئے ہوئے خطوط کی اشاعت کا ایک عام رواج ہے اس سے اس مرکزی شخصیت یعنی مکتوب الیہ کے حوالے سے ان علمی و ادبی شخصیتوں اور ان کے زمانے کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ابھی 'چند ضیابار افراد کے خطوط' کے عنوان سے پروفیسر اصغر عباس صاحب کے نام موصولہ خطوط کا مجموعہ شائع ہوا جسے خود پروفیسر اصغر عباس صاحب نے مرتب کیا ہے۔ یہ مجموعہ مع اہم تصاویر کے 474 صفحات پر مشتمل ہے جس میں اہم سماجی، علمی و ادبی شخصیات کے خطوط ہیں جس کا تعارف کراتے ہوئے اصغر عباس صاحب نے لکھا ہے کہ:

> ''ان خطوط کا کوئی موضوع سخن نہیں ہے۔ ان میں بحث مباحثہ بھی نہیں ہے لیکن ان سے ذاتی زندگی کے کچھ احوال بھی ہویدا ہوں گے، ان میں نفس کی پرچھائیاں بھی دکھائی دیں گی۔ بعض خطوط کو اگر کریدا جائے تو ان میں گندم نما جو فروش بھی مل جائیں گے۔ یہ خطوط ماضی بعید کے نہیں ماضی قریب کے ہیں۔ مکتوب نگاروں کے چہرے جانے پہچانے ہیں اس لیے ان خطوط میں دلچسپی کا سامان بھی وافر ہے۔''
>
> (شروع کی بات ص 10-9)

یہ خطوط چونکہ ماضی قریب کے ہیں اس لیے اس میں بیشتر چہرے آپ کے جانے پہچانے ہو سکتے ہیں اور آپ کو ان کے خطوط میں دلچسپی ہو سکتی ہے لیکن ہر خط اس لیے اہم ہوتا ہے کہ وہ مکتوب نگار کا راز بردار ہوتا ہے۔ خط ایک ذاتی اور صیغہ راز کی دستاویز ہے جب کوئی خط لکھتا ہے تو اپنے دل کی بات بے کم و کاست لکھتا چلا جاتا ہے۔ اسی لیے ماہرین نفسیات اسے کسی شخص کے اندر جھانکنے یعنی اندرونی پردوں میں چھپی ہوئی شخصیت کو سمجھنے کا ذریعہ قرار دیتے ہیں اس طرح جدید تنقید وتشریح میں وہ کسی شخص یا اس کے عہد کو سمجھنے کا ایک ذریعہ بن گئے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ 'ضیابار افراد' کے بیشتر چہرے 'جانے پہچانے' ہیں جنھیں اکثر لوگ قریب سے جانتے اور پہچانتے ہوں گے۔ ان لوگوں میں کوئی کسی کا استاد، ناقد، بزرگ یا دوست ہوگا لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے خطوط میں اس شکل سے مختلف نظر آئے جو اس نے اپنے ذہن میں بنا رکھی ہے۔ شخصیت کے یہ پہلو صرف اس کے خطوط کے مطالعے سے ہی ظاہر ہو سکتے ہیں۔ ان خطوط سے بہت سی تحقیقی اور علمی و ادبی باتوں کا علم ہوتا ہے۔

پروفیسر اصغر عباس صاحب ایک مشہور و معتبر محقق، ناقد اور متعدد اہم تحقیقی کتابوں کے مصنف ہیں ایک بڑی یونیورسٹی سے تعلق ہونے کی وجہ سے اردو دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو ان کے اسم گرامی سے واقف نہ ہو، ظاہر ہے کہ ایسے شخص کے جاننے والوں کا حلقہ بھی اتنا ہی وسیع ہوگا۔ ایسی صورت میں پروفیسر اصغر عباس کے نام آئے ہوئے خطوط بھی اپنی ایک علمی و ادبی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان میں آپ کو بہت سی ایسی باتوں کا ذکر بھی مل سکتا ہے جس کو کبھی جاننے کی فکر رہی ہو۔ اس کے علاوہ ان خطوط میں جہاں ادب و تحقیق سے متعلق گفتگو ہے وہ کافی اہم ہے۔

ان خطوط میں بحث و مباحثہ تو نہیں ہے لیکن علمی و ادبی معلومات کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ آل احمد سرور، شان الحق حقی، صدیق جاوید، ضیاء الدین ڈیسائی، رشید حسن خاں، ڈاکٹر ٹی آر رینا اور عابد پیشاوری کے علاوہ ایسے بہت سے لوگوں کے خطوط ہیں جو ہماری معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔ یہاں پر خطوط کے اقتباسات دینے کا کوئی موقع نہیں ہے لیکن ایک خط سے ایک اقتباس نقل کرنا چاہوں گا جس میں مکتوب نگار نے ہندوستانی شعری مزاج اور انگریزی شعری مزاج کے وسیع موضوع کو چند سطروں میں پیش کر دیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اسے پڑھ کر تکلیف ہو اس لیے کہ اردو کے ان قصائد کا تعلق شاعر کے ذریعہ معاش سے وابستہ تھا۔ ہمارا شاعر قلم کا مزدور تھا وہ نہ جاگیردار تھا، نہ سپاہی تھا، نہ منیم و منشی، اس لیے حقیقت سے واقفیت کے باوجود 'تعریف شہ' میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتا رہتا تھا۔ بہرحال آپ یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔ پروفیسر سید عاصم علی صاحب لکھتے ہیں:

> ''... انگریزی ادب اور اردو ادب کے ارتقائی معیار میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایسی چیز کیوں لکھی جائے ایک دیو قامت اور دوسرا بونا نظر آئے۔ مثال کے طور پر ذوق اور ورڈز ورتھ کو ہی لے لیجیے بادشاہت ہندوستان اور برطانیہ دونوں ملکوں میں ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ ایک بادشاہ کی حدود مملکت میں سورج کبھی نہیں غروب ہوتا اور دوسرے بادشاہ کے یہاں کبھی طلوع نہیں ہوتا۔ ایک حاکم اور فاتح ہے، دوسرا محکوم اور مفتوح... ایک تلوار کا دھنی ہے دوسرا بٹیر باز اور مرغ باز، ایک وہ کہ زمانہ جس کی رضا دیکھ کر حرکت کرتا ہے، دوسرا وہ کہ زمانے کی ستم ظریفیوں پر منظوم دکھڑے روتا ہے۔''

ان خطوط کو ترتیب دینا اور صحت متن کے ساتھ ان کی اشاعت ایک محنت طلب کام تھا لیکن پروفیسر اصغر عباس صاحب نے بڑی محنت اور دیدہ ریزی کے ساتھ اسے مرتب کیا ہے جو ایک علمی و ادبی تحفے کی حیثیت رکھتا ہے۔ میں اس مجموعہ 'ضیابار افراد کے خطوط' کی اشاعت پر ان کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

تحقیق و تنقید

دبستان ادب آگرہ کے ممتاز شاعر و ادیب سید محمد علی شاہ میکش اکبر آبادی

مرتبین: ڈاکٹر نسرین بیگم، سید فیض علی شاہ نیازی
قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2019

مبصر: پروفیسر محمد معظم الدین
ڈپارٹمنٹ آف ایجوکیشن ان لینگویجز، سری اربندو مارگ، نئی دہلی 16

علمی و ادبی حلقوں میں سید محمد علی شاہ میکش اکبر آبادی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ وہ ایک علمی اور صوفی خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ شاعری اور تصوف انھیں وراثت میں ملے تھے۔ ان کے اجداد میں حضرت امجد علی شاہ اصغر، حضرت منور علی شاہ اور خود ان کے والد محترم سید اصغر علی شاہ اپنے وقت کے ممتاز عالم اور مشہور صوفی بزرگ گزرے ہیں۔ تصوف کی مشہور کتاب 'جواہر غیبی' مصنفہ سید مظفر علی شاہ اسی خانوادے سے تعلق رکھتی ہے۔ میکش اکبر آبادی نے اسی ماحول میں آنکھ کھولی۔ رفتہ رفتہ شعر و ادب، فکر و فلسفہ اور عشق و تصوف ان کی گھٹی میں پڑ گیا۔ وقت سے پہلے ہی ان پر عالمانہ اور صوفیانہ رنگ غالب آ گیا جو بعد میں نہ صرف ان کا مسلک بلکہ ان کی شخصیت کی شناخت کا ایک سبب بن گیا۔ وہ آگرہ کی جامع کمالات شخصیت کے مالک تھے۔ وہ بہ یک وقت اخلاق و شائستگی، خاکساری و تواضع اور جوہر شناسی و قدر افزائی کا پیکر تھے۔

آستانۂ میکش پر علما و ادبا اور صوفیا کی محفلیں اکثر آراستہ ہوتی تھیں جو شہر اکبر آباد کی علمی و ادبی فضا پر دلالت کرتی ہیں۔ یہ سلسلہ میکش اکبر آبادی کی وفات 25/اپریل 1991 کو منقطع ہو گیا لیکن جلد ہی اس خوش گوار علمی و ادبی فضا نے اپریل 1992 میں 'بزمِ میکش' کی شکل اختیار کر لی جس کی بنیاد عقیدت مندانِ میکش بالخصوص ان کے پوتے سید اجمل علی شاہ نیازی نے رکھی۔ 1993 سے بزمِ میکش کے تحت علم و ادب کی عظیم شخصیات کو انعام دینے اور میکش اکبر آبادی پر یک روزہ سمینار کے انعقاد کا سلسلہ شروع ہوا جو آج تک جاری ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب میں سمینار میں پڑھے گئے مقالوں کو یک جا کر کے ایک اہم علمی و ادبی فریضہ انجام دیا گیا ہے جس کی اپنی تاریخی حیثیت ہے۔

چوبیس مضامین اور 286 صفحات پر مشتمل اس کتاب میں میکش اکبر آبادی کے جامع کمالات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ کتاب کا پیش لفظ ڈاکٹر نسرین بیگم کے قلم سے ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے 26 برسوں پر مشتمل تقسیم ایوارڈ کی روداد کی تفصیلات بھی فراہم کی ہیں۔ کتاب کے آخری 24 صفحات میں ضمیمہ کے طور پر غیر مطبوعہ عکسی خطوط اور میکش ایوارڈ یافتگان کی تصویریں شامل ہیں۔

کتاب کے ابتدائی تین مضامین خود میکش اکبر آبادی کے قلم سے ہیں جن میں انھوں نے بالترتیب مختصراً اپنے حالات زندگی، مرزا غالب کے مسائل تصوف اور اقبال اور وحدۃ الوجود پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ان مضامین کی شمولیت سے کتاب کی قدر و قیمت یقیناً بڑھ گئی ہے۔ بعد کے مضامین میں مختلف اہلِ قلم نے میکش اکبر آبادی کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کے فکر و فن پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جن میں ان کی سوانح و شخصیت، علم اور انسان دوستی، مذہبی رواداری، خود داری، غزل گوئی، تہذیبی شناخت، اقبال شناسی، ان کا تصور مساوات اور قومی یک جہتی، طریق صلح کل، صوفیانہ مسلک، ان کی کتابوں کے جائزے وغیرہ کو بالخصوص جگہ دی گئی ہے۔

اہم قلم کاروں میں راقم الحروف کے علاوہ پروفیسر مغیث الدین فریدی، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، پروفیسر عنوان چشتی، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر علی احمد فاطمی، پروفیسر شہاب الدین ثاقب، پروفیسر سراج اجملی، ڈاکٹر حبیب الرحمٰن نیازی، ڈاکٹر نفیس بانو، محمد عباس حیدر چشتی، اسرار اکبر آبادی وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے بعد طیب علی کاظمی کے دس قطعات کو بھی جگہ دی گئی ہے جن میں انھوں نے مختلف موقعوں پر قطعات کے ذریعے تاریخ نکالی ہے۔ ان قطعات سے کتاب کی تاریخی اہمیت دو چند ہو گئی ہے۔ بعد کے دو صفحات میں 27 قومی میکش ایوارڈ یافتگان کی تفصیل فراہم کی گئی ہے جس میں ان کے اسمائے گرامی، مقامات اور سنین کا بالخصوص ذکر کیا گیا ہے۔ بزمِ میکش سے قومی ایوارڈ یافتگان کی وابستگی یقیناً قابل قدر اور باعث فخر ہے۔

اس طرح یہ کتاب نہ صرف میکش اکبر آبادی کی ہمہ جہت شخصیت کا روشن منارہ ہے بلکہ شہر اکبر آباد کی علمی و ادبی فضا کا ایک استعارہ اور تہذیبی شناخت نامہ بھی ہے۔ اس سے میکش شناسی کی ایک نئی راہ وا ہوئی ہے۔

کتاب کے مرتبین بالخصوص ڈاکٹر نسرین بیگم شکریے اور داد کی مستحق ہیں۔ بزمِ میکش سے ان کی وابستگی یقیناً نیک فال ہے اور مستقبل میں بھی اس کی شہرت و عظمت کی ضامن ہے۔

کتاب کا سرورق دیدہ زیب اور خوش رنگ ہے۔ دور گرانی میں کتاب کے مشمولات کو دیکھتے ہوئے اس کی قیمت مناسب معلوم ہوتی ہے۔ امید ہے علمی و ادبی حلقوں میں اس کتاب کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

اردو اور عربی کے اہم قصیدہ گو شعرا

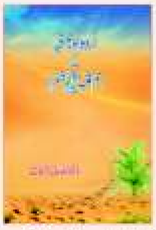

مصنف: ڈاکٹر یوسف رامپوری
صفحات: 400، قیمت 400، سال اشاعت 2020
ناشر: مرکزی پبلیکیشنز، نئی دہلی

مبصر: امیر حمزہ K-12، حاجی کالونی
غفار منزل، جامعہ نگر، نئی دہلی 25

قصیدہ شاعری کی وہ صنف رہی ہے جس کا زیادہ تر تعلق شاہی دربار سے رہا ہے۔ اس کو شاہی صنف سخن بھی کہا جاتا ہے، ہو بھی کیوں نا جس زبان میں اس صنف نے کمالات حاصل کیے بعد میں اسی زبان یا کسی اور زبان کا قصیدہ وہ مقام حاصل نہیں کر سکا۔ اس صنف کے ساتھ ایک دوسری خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ اس نے جس زبان میں بھی جس عہد میں ترقی کی وہ اس زبان کی شاعری کا عہد زریں رہا ہے جیسے عربی میں دور جاہلی، عہد اسلام، عہد اموی اور دور عباسی میں قصیدے کا زور تھا تو عربی میں بھی انہی ادوار کی شاعری کو عہد زریں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی طریقے سے فارسی میں دیکھیں تو سبک خراسانی، سبک عراقی، سبک ہندی اور سبک بازگشت میں عمدہ شاعری کی گئی ہے ان ادوار میں فارسی میں بھی قصیدہ کو عروج حاصل ہوا۔ اسی طریقے سے اردو کو دیکھیں تو دکنی شاعری کا اپنا دور تھا وہاں قصیدے نے ترقی کی پھر شمالی ہند میں ذوق و غالب تک اس صنف میں خوب طبع آزمائی ہوتی رہی۔ اسی شاہی صنف کا موازنہ اردو اور عربی کے حوالے سے ڈاکٹر یوسف رامپوری نے اس کتاب میں کیا ہے۔ اردو کی دیگر اصناف کا موازنہ فارسی سے ہوتا رہا ہے یہاں تک کہ ہمارے یہاں خیال بندی کی باتیں بھی دونوں زبانوں کے حوالے سے سامنے آتی رہی ہیں لیکن اردو اور عربی شاعری کا موازنہ جس وسیع پیمانے پر یوسف رامپوری نے پیش کیا ہے اس وسیع پیمانے پر نہیں بلکہ ایک محدود پیمانے پر چند شاعروں کے حوالے سے مطالعات سامنے آئے ہیں۔ اس

کتاب میں طویل علمی اور تحقیقی مقدمہ حقانی القاسمی کا ہے جس میں انہوں نے عربی میں قصیدہ نگاری کے حوالے سے بہت ہی معلوماتی و تحقیقی گفتگو کی ہے۔ اسی درمیان کئی مقامات پر اس بات کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ عربی قصیدہ نگاری پر جتنا کام انگریزی میں ہوا اتنا کسی اور زبان میں نہیں ہوا ہے۔ (اعنی: عرب اور عجم کی تفریق ہی زبان دانی پر ہے تو انگریز محققین و ناقدین نے عرب کے اس تعلّی پر کام بھی خوب کیا) حقانی صاحب نے کئی مقامات پر اس بات کا اعتراف بھی کیا کہ اردو اور عربی قصائد کے حوالے سے یوسف رامپوری نے جو کام کیا ہے وہ بالکل انوکھا ہے کیونکہ "انھوں نے عربی و اردو قصائد کے کینن، اشتراکات اور افتراقات پر نظر ڈالی ہے۔" مصنف نے کس طور پر نظر ڈالی ہے اس کو کتاب کے مطالعے سے معلوم کرتے ہیں۔

کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب 'اردو اور عربی قصیدہ گوئی: خصوصیات و امتیازات' ہے۔ اس باب میں مندرجہ ذیل نکات پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ قصیدے کے متعلق سب سے پہلے وہ وضاحتی بات یہ لکھتے ہیں کہ عربی میں قصیدہ بہت ہی وسیع مفہوم میں استعمال ہوتا ہے، سات یا اس سے زیادہ اشعار ہوں تو عربی میں قصیدہ ہوتا ہے موضوعات کی کوئی قید نہیں۔ اردو میں قصیدہ باضابطہ ایک صنف سخن ہے جس کے پہلے کے دونوں مصرعے ہم ردیف و ہم قافیہ ہوں یا صرف ہم قافیہ ہوں باقی اشعار کے دوسرے مصرعے بھی اسی نہج پر ہوں۔ اردو میں قصیدہ کے اجزائے ترکیبی میں مدعا کو بھی شامل کیا جاتا ہے جبکہ عربی و اردو دونوں میں اس کا التزام نظر نہیں آتا ہے۔ اس کے علاوہ جو دیگر چار عناصر ترکیبی اردو قصیدوں میں اہمیت کے حامل ہیں وہ عربی میں ایک ساتھ بہت ہی کم پائے جاتے ہیں۔ قصیدے کی خصوصیات میں سے شوکت الفاظ، نادر تشبیہات اور پرشکوہ الفاظ بھی ہیں اس میں عربی قصیدہ تو نمایاں مقام رکھتا ہی ہے اردو قصیدہ بھی اپنی کم دامنی کے باوجود بھرپور کوشش کرتا ہوا نظر ہوتا ہے۔ جوش تو عربی میں نظر آتا ہے اردو میں جوش لانے میں ایک طرح کا تصنع نظر آتا ہے۔ عربی قصائد میں فخر و تعلّی کی بات کی جائے تو قصائد کی بنیادی بات نظر آنے لگتی ہے جب کہ اردو قصیدہ نگاروں کے پاس کوئی ایسی چیز یا وجہ نظر نہیں آتی ہے جس پر وہ فخر و تعلّی کے اشعار پیش کریں، عرب والے تو اپنی نسل پر فخر تو کرتے ہی تھے ساتھ ہی اپنے گھوڑوں کی نسل و دیگر فنون پر بھی فخریہ اشعار پیش کیا کرتے تھے، جبکہ اردو میں ممدوحین کی بہادری و سخاوت کا ذکر کیا گیا ہے۔ وصف نگاری اور سراپا نگاری عربی قصیدوں میں فطری انداز میں نمایاں نظر آتی ہے جبکہ اردو والوں کے یہاں تخیل کی کارفرمائی کے بعد بھی غلو و مبالغہ دیکھنے کو ملتا ہے جس سے سراپا نگاری حقیقت سے بہت ہی دور چلی جاتی ہے۔ ہاں! اردو میں نظموں و مرثیوں میں عمدہ سراپا نگاری ملتی ہے۔ مبالغے پر مصنف لکھتے ہیں کہ "اگر مبالغہ کو قصیدہ کا معیار سمجھا جائے تو اردو قصیدے اس معیار پر کھرے اترتے ہیں اور عربی قصائد سے کئی قدم آگے بڑھ جاتے ہیں۔" بالآخر جب موضوعات کی جانب رخ کرتے ہوئے مصنف عربی و اردو قصائد کا تقابلی مطالعہ کرتے ہیں تو وہاں اردو قصیدے عربی قصیدے کی بہ نسبت زیادہ متنوع دکھائی دیتے ہیں۔

دوسرا باب 'عربی کے اہم قصیدہ گو شعرا' پر ہے۔ اس باب میں انہوں نے سولہ شعرا کا ذکر کیا ہے۔ زمانۂ جاہلیت سے امرؤالقیس، زہیر بن ابی سلمٰی، طرفہ بن العبد، لبید بن ربیعہ، عنترہ بن شداد العبسی اور اعشیٰ قیس کو شامل کیا ہے۔ عہد اسلام سے حسان بن ثابت، کعب بن زہیر اور حطیئہ ہیں۔ دور اموی سے اخطل، جریر، فرزدق، جمیل بثینہ اور عمر بن ربیعہ ہیں۔ عہد عباسی سے ابونواس اور متنبّی ہیں۔ ان تمام کے بیان میں مصنف نے ان شعرا کی زندگی، قصیدہ کے موضوعات، ان کے اہم قصائد کی خصوصیات، ماقبل کے قصیدہ گو شعرا سے کس طرح مختلف ہیں اور انھوں نے قصیدے میں کیسی زبان استعمال کی ہے اس کو بیان کیا ہے۔ مصنف نے کئی شعرا کے بارے میں یہ بھی بیان کیا ہے کہ ان کا تشبیب اور گریز کا معیار کیا ہے اور اس میں کن موضوعات کو بہ کمال ہنرمندی پیش کرنے میں وہ یکتا تھے۔ موازنہ کرتے ہوئے انہوں نے اس کی نشاندہی بھی کی ہے کہ جاہلی دور کے تقریباً تمام شعرا کی تشبیب ایک طرح کی نظر آتی ہے لیکن جیسے ہی وہ گریز سے گزرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں تو قصیدہ کے حوالے سے ان کی اپنی شناخت نظر آتی ہے۔ مصنف نے تمام شعرا کا ایک ہی نہج پر مطالعہ نہیں پیش کیا ہے بلکہ ہر ایک کی نمایاں خصوصیات کو سامنے لاتے ہیں اور کمیوں کو بھی پیش کیا ہے جیسا کہ متنبّی کے بیان میں وہ لکھتے ہیں کہ "مدح کی وجہ سے متنبّی کا مقام بلند بھی ہوا ہے اور وہ اپنے مقام سے گرا بھی۔" کیونکہ مدحیہ اشعار میں جھوٹ اور مبالغہ آرائی نے اس کو وہ مقام نہیں دلایا جو دیگر کو ملا۔ البتہ وہ عرض طلب میں بہت ہی بے باک اور فصیح بھی واقع ہوا ہے، کہ سیف الدولہ کی خدمت میں ایک بار میں ایک ہی شعر میں بائیس درخواستیں رکھ دیں۔ الغرض اس باب میں عربی قصیدہ نگاری کی تفہیم کے لیے بہت کچھ ہے۔

تیسرا باب 'اردو کے اہم قصیدہ نگار شعرا' پر ہے۔ اس باب میں بھی انہوں نے عربی کے سولہ شعراء کے مقابلے میں اردو کے سولہ شعرا کو شامل کیا ہے جن میں غواصی، نصرتی، ولی، شاکر ناجی، محمد رفیع سودا، انشا، مصحفی، ذوق، مومن، غالب، امیر لکھنوی، منیر شکوہ آبادی، محسن کاکوروی، اسماعیل میرٹھی، حالی اور نظم طباطبائی ہیں۔ اردو کے قصیدہ نگاروں کا مطالعہ کریں تو یہاں ترجیحات الگ نظر آتی ہیں اور پیش کش کے بھی مقاصد دیگر نظر آتے ہیں، یہاں موضوعات کا تنوع ملتا ہے ساتھ ہی متنبّی جیسا غلو بھی نظر آتا ہے۔ یہاں ایک دوسرے کا رنگ بھی دیکھنے کو ملتا ہے اور ساتھ ہی مدح میں احتیاط کا پہلو بھی نظر آتا ہے، کوئی بھاری بھرکم الفاظ و تراکیب پر توجہ دیتا ہے تو کوئی نادر مضامین پر۔ مصنف نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر آج قصیدے کا احیا ہوگا تو کن کے قصیدے نقش راہ ثابت ہوں گے۔ الغرض ڈاکٹر یوسف رامپوری کی یہ کتاب قصیدہ فہمی کے باب میں مطالعے کا نیا در وا کرے گی۔

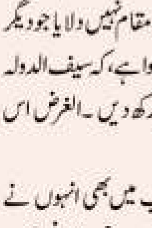

اظہار الاسلام : شخصیت و فن

مرتب: ڈاکٹر محمد فاروق اعظم

صفحات: 136، قیمت: 200، اشاعت: 2020

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: ڈاکٹر ساجد ذکی فہمی، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

'اظہار الاسلام (شخصیت و فن)' ڈاکٹر محمد فاروق اعظم کی تازہ ترین کتاب ہے، جسے عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی نے شائع کیا ہے۔ اس سے پہلے مرتب کی تین کتابیں بالترتیب 'دشت امکاں، شانتی رنجن بھٹاچاریہ حیات و خدمات اور تانیثیت اور اردو ادب منظر عام پر آکر قبول عام حاصل کر چکی ہیں۔ ڈاکٹر محمد فاروق اعظم کا تعلق صوبۂ بنگال کے ضلع بردوان سے ہے۔ اسی ضلع کے ایک چھوٹے سے شہر 'رانی گنج' (جو اظہار الاسلام کا مسکن بھی تھا) میں وہ درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ اور اپنے فرائض تندہی سے انجام دینے میں پوری طرح منہمک ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب میں مرتب نے 'اپنی بات' کے علاوہ کل تیرہ مضامین، ایک انٹرویو اور ضمیمہ کے طور پر اظہار الاسلام کے پانچ منتخب افسانوں کو شامل کیا ہے۔ 'اپنی بات' کے تحت مرتب نے اظہار الاسلام کی شخصیت، ان سے وابستگی، اپنی مشغولیات کے ذکر کے

ساتھ کتاب کو ترتیب دینے کے تئیں اپنے جذبات کا برملا اظہار بھی کیا ہے۔ بعد ازیں پہلا مضمون 'سوانحی خاکہ' کے عنوان سے بقلم مرتب شامل ہے، جس میں اظہار الاسلام کے جد امجد کا مختصر تعارف، تعلیم و تربیت، ملازمت، ادب سے وابستگی، علالت اور وفات تک کا ذکر موجود ہے۔ دوسرا مضمون 'اظہار الاسلام میری نظر میں' بھی مرتب کی جودت طبع کا نتیجہ ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے اظہار الاسلام کی علمی و ادبی سرگرمیوں اور ان سے اپنی وابستگی کا ذکر بڑے پُر لطف انداز میں بیان کیا ہے۔ تیسرا مضمون 'بیان اپنا' کے عنوان سے شامل ہے۔ یہ اظہار الاسلام کی خودساختہ تحریر ہے، لہٰذا اسے اظہار الاسلام کی کہانی خود ان کی زبانی سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اس مضمون کے ذریعے ان کی ادبی و سماجی زندگی کے نشیب و فراز کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ اس کے بعد شمس الرحمٰن فاروقی کا ایک مختصر مضمون بعنوان 'اظہار الاسلام کے افسانے' شامل کتاب ہے۔ راقم السطور کے نزدیک فاروقی کا کسی افسانہ نگار کے تئیں مثبت انداز میں قلم اٹھانا اس کے غیر معمولی ہونے کی دلیل ہے۔ فاروقی ان کے افسانوں سے متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک جگہ ان کے افسانوں کے متعلق لکھتے ہیں: ''میں اظہار الاسلام کے افسانے ایک عرصے سے پڑھ رہا ہوں۔ فنی اعتبار سے انھوں نے ایک ایسی راہ ہمیشہ اختیار کی جو دو انتہاؤں کے مابین چلتی ہے...ان کے اکثر افسانوں میں یہ بات فوری طور پر بالکل واضح نہیں ہوتی کہ افسانہ ہمیں کدھر لے جارہا ہے۔ انجام کا غیر متوقع ہونا تو ایک معمولی بات ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ افسانے کے مختلف منازل میں پڑھنے والے پر یہ نہ کھلنے پائے کہ افسانہ نگار کا اپنا کوئی رویہ ہے، یا اس کے کچھ پہلے سے طے شدہ نتائج ہیں، اور افسانہ نگار انھیں رویوں اور نتائج کو قاری کے اوپر جاری اور قائم کرنا چاہتا ہے۔ افسانہ وہی اچھا ہوتا ہے جس میں سے نتیجہ یا نتائج قاری خود نکالے۔ اظہار الاسلام اس نکتے کو بخوبی جانتے ہیں۔'' کتاب میں شامل پانچواں مضمون 'عہد جدید کا باغی افسانہ نگار: اظہار الاسلام' از مشرف عالم ذوقی ہے۔ اظہار الاسلام کی تحریروں نے مضمون نگار کو کس حد تک متاثر کیا ہے اس کا اندازہ مذکورہ مضمون کو پڑھ کر بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ مشرف عالم ذوقی، اظہار الاسلام کے افسانوں کا ذکر کرتے ہوئے عالم حیرت میں یہ کہتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ ''یار ایسی کہانیاں اب کیوں نہیں لکھی جارہی ہیں...''۔ اس کے بعد مزید سات مضمون مذکورہ کتاب میں شامل ہے جو بالترتیب 'اظہار' از رونق نعیم، 'واپسی' از ڈاکٹر سید عارفی، 'اظہار الاسلام کے افسانوں میں عصری معنویت' از ڈاکٹر علی حسن شائق، 'بے اعتنائی کے گرد میں دبا ہوا افسانہ نگار: اظہار الاسلام' از نصر اللہ نصر، 'اظہار الاسلام واپسی کے بعد' از ڈاکٹر محمد فاروق اعظم، 'اظہار الاسلام کا افسانہ اجنبی' از ڈاکٹر محمد فاروق اعظم اور 'کانچ کا پل' از ڈاکٹر قمر صدیقی ہیں۔ مضامین کے بعد ڈاکٹر علی حسن شائق کا اظہار الاسلام سے لیا گیا ایک انٹرویو بھی شامل ہے۔ جس سے اظہار الاسلام کی شخصیت اور فکر کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ کتاب کے آخر میں ضمیمہ کے طور پر اظہار الاسلام کے جن پانچ منتخب افسانوں کو شامل کیا گیا ہے، وہ دراصل ان کے دونوں مجموعے 'واپسی' اور 'کانچ کا پل' سے انتخاب شدہ ہیں۔ ان افسانوں کو شامل کرنے کا جواز پیش کرتے ہوئے مرتب نے 'اپنی بات' کے ذیل میں لکھا ہے کہ:

''...'واپسی' اور 'کانچ کا پل' سے پانچ منتخب افسانے کتاب میں شامل کیے گئے ہیں تاکہ قارئین مضامین کے ساتھ ساتھ افسانے کا لطف بھی اٹھاسکیں اور یہ فیصلہ کرسکیں کہ اظہار الاسلام کس طرح کے افسانہ نگار تھے۔''

مشمولات کے پیش نظر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مرتب کی یہ کتاب اظہار الاسلام کی شخصی زندگی کے ساتھ ان کی ادبی زندگی کا بھی احاطہ کرتی ہے۔ علاوہ ازیں اس بات کی بھی قوی امید ہے کہ اظہار الاسلام پر تحقیقی کام کرنے والے اس کتاب کو بنیادی ماخذ کے طور پر استعمال کریں گے۔

زیر تبصرہ کتاب کا انتساب مرتب نے 'اظہار الاسلام' کے ہی نام کیا ہے۔ کتاب کی پشت پر مشرف عالم ذوقی کے مضمون کا ایک اقتباس بھی شامل ہے۔ طباعت اور سرورق نہایت عمدہ اور دیدہ زیب ہے۔ صفحات کے اعتبار سے قیمت بھی مناسب معلوم ہوتی ہے۔ کتاب میں ایک خوش آئند بات یہ بھی ہے کہ اس میں 'اپنی بات' کے علاوہ چار مضامین بقلم مرتب شامل ہیں۔ پروف کی غلطیاں نہ کے برابر ہیں۔ بہر حال اس کتاب کے لیے میں ڈاکٹر محمد فاروق اعظم کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ان کا قلم آئندہ بھی اسی طرح رواں دواں رہے، بلکہ وہ ادبی دنیا میں خوب سے خوب تر کی طرف مراجعت کریں۔ ساتھ ہی مجھے اس بات کی بھی قوی امید ہے کہ ادبی حلقوں میں ان کی دیگر کتابوں کی طرح اس کی بھی پذیرائی کی جائے گی۔

رامپور منظرنامۂ تاریخ وتہذیب و ادب

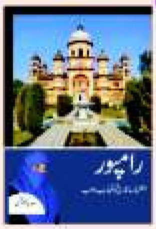

مصنف: سعدیہ سلیم شمسی

صفحات 194، قیمت: 126

ناشر: کتابی دنیا دہلی

مبصر: چودھری امتیاز احمد

ریسرچ اسکالر شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی، پریاگ راج

یوں تو علاقائی زبان و ادب پر صدیوں سے کام ہورہا ہے لیکن سعدیہ سلیم شمسی نے شہر رامپور جو ان کی جائے پیدائش بھی ہے اس کی تاریخ و تہذیب اور 1774 سے 2019 تک اردو ادب کے فروغ کے لیے کیے جانے والے کام کا ایک بہترین خاکہ کھینچا ہے کتاب کو مختلف ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے جس کا ذکر بالترتیب یہاں اختصار سے کیا جا رہا ہے۔ باب اول میں رامپور کی تاریخ و تہذیب کو بڑے اختصار کے ساتھ اور خوبصورتی سے پیش کر دیا ہے۔ مصنفہ نے جغرافیائی اعتبار سے بھی اس شہر پر روشنی ڈالی ہے۔ دہلی سے رامپور کی دوری، لکھنؤ سے رامپور کی دوری کے علاوہ رامپور میں داخل ہونے کے لیے مختلف راستوں وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ شہر رامپور کے وہ زمانہ قدیم کے گیٹ جنھیں مختلف نام دیے گئے تھے جیسے نواب دروازہ، شاہ آباد دروازہ، بریلی دروازہ وغیرہ کا تفصیلی ذکر اس باب میں ملتا ہے۔ علاوہ ازیں نوابین رامپور کا تفصیلی ذکر مع تواریخ مصنفہ نے اس باب میں پیش کر دیا ہے۔ اس باب کے آخر میں رامپور کے مشہور مدرسوں اور کالجوں کا بھی ذکر مل جاتا ہے

باب دوم ادبیات رامپور کے ذیل میں رامپور میں اردو نثر نگاری 1774 تا حال کے تحت اردو نثر نگاروں اور ان کی تصانیف کا تفصیلی ذکر مل جاتا ہے۔ نواب فیض اللہ خان کے عہد میں میر ضیاء الدین عبرت، میر غلام علی عشرت بریلوی ثم رامپوری، مولوی غلام جیلانی رفعت، محمد کبیر خاں تسلیم، عنبر شاہ خاں آشفتہ وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے ان کی تصانیف پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد آخون زادہ احمد خاں غفلت، شیخ علی بخش بیمار، مولوی مرزا عبدالقادر غمگین، مولوی غیاث الدین، طالب مینائی، منشی مظفر علی اسیر، میر ضامن علی جلال لکھنوی وغیرہ مختلف نوابین اردو نثر کے فروغ کے لیے کام کرتے رہے، جس کی خوبصورت عکاسی اس باب میں درج ہے۔ نواب کلب علی خاں کے عہد میں غالب آگرہ میں مقیم تھے اس کا ذکر بھی سعدیہ شمسی نے اس باب میں کیا ہے۔

اس میں انھوں نے مذکورہ تمام ادیبوں کے سوانحی کوائف کے علاوہ ان کے نثری

کارناموں کی بہترین تصویر کشی کی ہے۔ موصوفہ نے بڑی عرق ریزی سے ان تمام قلمکاروں کے حوالے سے مطالعہ ومشاہدہ کرکے ان کی نثری تصانیف پر سیر حاصل بحث کی ہے جس کے لیے سعدیہ سلیم شمسی مبارکباد کی مستحق ہیں

باب سوم میں شعرائے رامپور 1774 سے 2019 کا تفصیلی تعارف پیش کرتے ہوئے ان کی شاعری کا ذکر کیا ہے اس باب میں نواب محمد یار خاں امیر، غلام مصطفےٰ خاں، راز یزدانی، شبیر علی خاں شکیب، مولوی غلام جیلانی رفعت، میر ضیاء الدین عبرت، عنبر شاہ خاں آشفتہ، کریم اللہ خاں کرم، آخوندزادہ احمد غفلت، حکیم احمد خاں فاخر کا ذکر تو ملتا ہے ساتھ ہی ساتھ ان نامور شعرا کا ذکر بھی کیا گیا ہے جنھوں نے اس عہد میں رامپور میں قیام کیا۔ ان میں امیر مینائی، حکیم مومن خاں مومن، مرزا غالب، حالی، شیفتہ اور امیر اللہ تسلیم وغیرہ شعرا شامل ہیں۔ سعدیہ سلیم شمسی نے جن شعرا کا ذکر کیا ہے ان کی ایک طویل فہرست ہے۔ مصنفہ نے ان شعرا کا ذکر کرتے ہوئے ان کے اشعار بھی پیش کر دیے ہیں جس سے ان شعرا کی شاعرانہ خوبیوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے

باب چہارم میں ان شعرا کا ذکر کیا ہے جو رامپور کے نہیں تھے لیکن یہاں کی تہذیب وتمدن اور ادب دوستی ان کو یہاں کھینچ لاتی تھی اور کسی نہ کسی طرح ان کا تعلق رامپور سے رہتا تھا۔ ان شعرا میں قائم چاند پوری، میر ضیاء الدین عبرت، صغیر علی انصاری، حافظ بدھا شیفتہ، مومن خاں مومن، شیخ علی بخش بیمار، غالب، داغ، طالب مینائی، منشی مظفر علی اسیر، سید جامن علی جلال لکھنوی، آغا حجو ہندی، مہدی علی ذکی، منیر شکوہ آبادی، منشی امداد علی بحر لکھنوی، جان صاحب ریختی گو، صفی لکھنوی، عبدالحلیم شرر، سید اولاد حسین شاد بلگرامی، علامہ شبلی نعمانی، جوش ملیح آبادی، شیخ حیات بخش رسا، نیاز فتح پوری، خواجہ حسن نظامی، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ تاجور نجیب آبادی، عندلیب شادانی، حامد حسن قادری، آل احمد سرور، جگن ناتھ آزاد، رام بابو سکسینہ، نجم الدین نقوی، پروفیسر خورشید الاسلام، دواکر راہی، پروفیسر ذکا صدیقی، مالک رام، پروفیسر رشید حسن خاں، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر مظفر حنفی، خلیل الرحمٰن اعظمی، پروفیسر نثار احمد فاروقی جیسی مایہ ناز شخصیات کے روابط رامپور سے رہے جن کا ذکر سعدیہ نے کیا ہے

باب پنجم میں انھوں نے رامپور کی تاریخ وتہذیب اور ثقافت وادب کے ماخذ کا اجمالی جائزہ پیش کیا ہے شہر کی معزز شخصیات کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے وہاں کی تہذیب و ثقافت کا مکمل خاکہ پیش کیا ہے تذکروں اور اخباروں کا بھی ذکر ملتا ہے علاوہ ازیں مصنفہ نے کتاب کے آخر میں چند نامور شعرا وادبا اور ناقدین ومحققین کے اشعار اور اقوال بھی نقل کردیے ہیں جو رامپور سے متعلق کہے گئے ہیں

سعدیہ سلیم شمسی کی یہ کتاب کئی اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے رامپور کے کسی بھی شاعر یا ادیب پر کام کرنے والے ریسرچ اسکالر کے لیے یا پھر رامپور میں شاعری یا نثر یا رامپور کی تاریخ پر کام کرنے کے دوران ہر طرح سے یہ کتاب مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔

فکشن

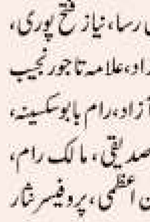

ممتا کی ڈور

مصنف: متین اچل پوری

صفحات: 128، قیمت: 80 روپے، سنہ اشاعت: 2020

ناشر: رحمانی پبلی کیشنز، مالیگاؤں (ناسک)

مبصر: اسلم جمشید پوری، ایچ اوڈی، اردو، سی سی ایس یونیورسٹی، میرٹھ، یوپی

بطور بچوں کے کہانی کار متین اچل پوری کی دوسری کتاب 'ممتا کی ڈور' ہے۔ اس سے قبل آپ کی کہانیوں کی کتاب 'یتیم کی آواز' منظر عام پر آچکی ہے۔ 'ممتا کی ڈور' میں آپ کی تقریباً بیس کہانیاں شامل ہیں۔ ان کہانیوں کے موضوعات میں کوئی Repitition نہیں ہے۔ ہر کہانی، دوسری سے الگ، بچوں کی عمر، نفسیات اور ماحول کے مطابق تحریر کردہ یہ کہانیاں کئی زاویوں سے نہ صرف منفرد ومختلف ہیں بلکہ آج کے عہد کے بچوں کی ذہنی سطح سے ہم آہنگ بھی ہیں۔ ان میں کئی کہانیاں ماحولیات کے تعلق سے ہیں۔ یہ بہت اچھی کوشش ہے۔ آج ماحولیات کتنا اہم موضوع ہے، یہ ہم سب پر واضح ہے۔ کہانیوں کے اس مجموعے میں ان کی کئی کہانیاں، جفت عدد طاق عدد، خط وکتابت، ایثار، الو کی عقلمندی، آدھا گلاس پانی، جنگل کی پگڈنڈی، پھول اور فولاد ماحولیات کو پیش خطرات اور اس کے تحفظ کے تعلق سے خاص اہم ہیں۔ 'جفت عدد طاق عدد' ایک چھوٹی سی کہانی ہے جس میں کہانی نویس نے دہلی میں ماحولیات کے تحفظ کے لیے دہلی سرکار کے ذریعے اٹھائے گئے اقدام آڈ، ایون فارمولے پر مبنی ایک اچھی کہانی لکھی ہے۔ جس میں مصنف نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ ماحول کی کثافت کے ساتھ ساتھ ہمیں ذہنوں کی کثافت کو بھی کم کرنا ہے اور ہندو مسلم منافرت کو بھول کر ایک دوسرے کی ضرورت میں کام آنا ہے۔ ذہنی کثافت اور خباثت دور کرکے اور ایک ہوکر ہی ہم ماحول کی آلودگی پر قابو پاسکتے ہیں۔

'جنگل کی پگڈنڈی' میں بھی متین اچل پوری نے بڑی فنی مہارت دکھائی ہے یہاں سڑک اور پگڈنڈی کے درمیان کی گفتگو کو کہانی کی شکل میں پیش کرکے Global Warming کے خطرات سے آگاہ کیا ہے۔ یہ مکالماتی انداز کی ایک خوبصورت کہانی ہے۔

متین اچل پوری نے 'خط وکتابت' نامی کہانی میں ایک کامیاب تجربہ کیا ہے۔ اس میں انھوں نے مکھی اور مچھر کے خطوط کی شکل میں کہانی پیش کی ہے۔ دونوں کے خطوط میں انسانوں کے ذریعے پھیلائی جانے والی گندگی اور صفائی کا موازنہ کیا گیا ہے۔ دونوں کا اپنے خطوط میں اپنی بقا کی فکر کرنا، دراصل انسان کا صفائی ستھرائی کے ذریعے ماحولیات کو تحفظ عطا کرنے کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔ کہانی کا یہ انداز قابل تعریف ہے۔

'آفاق اور چمن' بظاہر ہندو مسلم دوستوں کی کہانی ہے۔ لیکن یہ بھی ماحولیات پر ایک طنز ہے۔ کہانی میں آفاق کی سالگرہ میں چمن بہت لیٹ پہنچتا ہے جس کا سبب الیکشن کے نتیجے میں جام ہونے والا ٹریفک ہے۔ مصنف نے بڑی مہارت سے الیکشن کے ماحول پر مضر اثرات کو واضح کیا ہے۔ کہانی میں غبارے والے کی موجودگی خاص لطف دیتی ہے۔

'خوشی کے لمحے' کا زیریں تعلق ماحولیات ہی سے ہے۔ مصنف ایک چھوٹے سے پرندے کو غیر محفوظ سمجھ کے گھر لے آتا ہے اور اسے ایک پنجرے میں بند کرکے اس کا خیال رکھتا ہے۔ وہ پرندہ گھر کے بچوں کی توجہ اور دلچسپی کا مرکز بن جاتا ہے۔ دراصل وہ زخمی پرندہ تھا جسے مصنف نے گھر لاکر تحفظ دیا۔ بعد میں مصنف نے اسے آزاد کرنے کا اعلان کیا تو اس کا بیٹا عمر رنجیدہ ہوجاتا ہے اور کسی طور پرندے کو آزاد کرنے پر تیار نہیں ہوتا۔ مگر مصنف نے اسے ہنرمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سمجھایا تو آخرکار عمر اس کام کے لیے راضی ہوجاتا ہے اور اس پرندے کو آزاد کرکے خوشی خوشی تالیاں بجاتا ہے۔ بچے کی خوشی میں دراصل مصنف کے لیے اصل خوشی کے لمحات ہیں جو اسے 1947 کی یاد دلاتے ہیں۔

'ممتا کی ڈور' نئے زمانے میں ماں باپ کے ساتھ اولاد کے سلوک کی کہانی ہے۔ گھر کے حالات ایسے ہیں کہ جمیل اپنی بیوی کے سبب اپنی ماں کو نہ چاہتے ہوئے بھی 'آشرم' میں پہنچا دیتا ہے۔ بعد میں حالات بدلتے ہیں۔ اس کی بیوی کی آنکھیں کھل

جاتی ہیں۔ دراصل مصنف نے سعودی عرب کے ایک شخص کی 'ماں محبت' کے ذریعے دل کو پھیرنے کا کام لیا ہے۔ اور پھر وہ لوگ اپنی ماں کو اپنے گھر لے آتے ہیں۔

متین اچل پوری کی یہ کہانیاں بچوں کے تعلق سے خاص اہم ہیں۔ ان کہانیوں میں جہاں زبان و بیان عمدہ ہے وہیں مختلف النوع نئے تجربات بھی ملتے ہیں۔ ان کہانیوں میں زیادہ تر بچے کردار ہیں۔ بچے صرف کردار نہیں ہیں بلکہ زیادہ تر کہانیوں میں بچے عملی طور پر شریک ہیں۔ کھیل کھیل میں متین اچل پوری نے بچوں کی تربیت کرنے کی کوشش کی ہے۔ بہت سی ایسی معلومات بچوں کو فراہم کردی ہیں جنھیں سمجھانے کے لیے الگ سے وقت چاہیے۔ مثلاً گلوبل وارمنگ کو عمدگی سے سمجھایا گیا ہے۔ ہیلیم گیس ہوا سے ہلکی ہوتی ہے، یہ بات غبارے والے سے منظوم کہلوائی گئی ہے۔ آفاق کے معنی بھی بہترین ڈھنگ سے سمجھائے گئے ہیں۔ یہی نہیں مصنف نے پگڈنڈی، سڑک، مچھر، مکھی، پرندے کو بھی کردار کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ان کہانیوں میں خط نویسی، مکالمہ نویسی، ڈرامہ نگاری وغیرہ کا بھی درس دیا گیا ہے۔ ساتھ ساتھ مصنف نے وقفے وقفے سے قرآن کی نصیحتیں، اقوالِ زریں اور کارآمد باتیں بھی بچوں کو باور کرائی ہیں۔ 'ممتا کی ڈور' بچوں کے لیے ایک عمدہ تحفہ ہے۔ بچے اس کا مطالعہ کریں گے تو انھیں بہت کچھ حاصل ہوگا۔ ساتھ ہی ساتھ والدین کے لیے بھی یہ کتاب بہت کارآمد ہے۔ انھیں بچوں کی صحیح تربیت میں رہنمائی حاصل ہوگی۔

پورٹریٹ (افسانے)

مصنف: اقبال حسن آزاد

صفحات: 192، قیمت: 125 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: عالیہ خانم، D-31، لین نمبر 1، نورالٰہی نارتھ گھونڈہ، دہلی 53

اقبال حسین آزاد کا افسانوی مجموعہ 'پورٹریٹ' 23 افسانوں پر مشتمل ہے جن میں کچھ افسانے قابلِ ذکر ہیں۔ اقبال حسن آزاد اپنے افسانوں میں کسی ایک پہلو پر ہی نگاہ مرکوز نہیں رکھتے بلکہ ایک مختصر افسانے میں ہی کئی پہلوؤں کو محیط کرنے کا فن جانتے ہیں۔ سماجی عدم توازن پر ان کی گہری نگاہ ہے وہ سماج کی غلاظت سے منہ نہیں پھیرتے بلکہ اس کو اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہیں اور صاف لفظوں میں یہ کہنے سے نہیں چوکتے کہ ''کرپشن کو ہمارے پورے سماج نے قبول کرلیا ہے''۔ افسانہ 'شریف آدمی' میں انھوں نے ملک و سماج میں بڑھتے کرپشن کو ہی موضوع بنایا ہے اور قارئین کے سامنے معاشرے کی ان ناہمواریوں کو پیش کیا ہے جو آج سماجی سطح پر قبول کی جاچکی ہیں۔

''دراصل معاشرے میں جب کوئی برائی پوری طرح اپنا قدم جمالیتی ہے تو معاشرہ اسے ایک ناپسندیدہ حقیقت سمجھ کر قبول کرلیتا ہے جیسے کرپشن کو ہمارے پورے سماج نے قبول کرلیا ہے اور کسی کرپٹ آدمی سے ربط ضبط رکھنے میں ہم کوئی ہچک محسوس نہیں کرتے بلکہ بعض اوقات تو اس بات پر فخر محسوس کرتے ہیں۔'' (افسانہ: شریف آدمی)

ان کا افسانہ 'حصار' بھی ایک ایسے معاشرے کی عکاسی کرتا ہے جس میں اخلاقیات ناپید ہے اور معاشرے میں ہر طرف ایک بدبو پھیلی ہوئی ہے یہ بدبو دراصل اخلاقی زوال کی علامت ہے جو معاشرے کے اندر اور باہر موجود ہے لیکن انسان یہ سمجھنے میں قاصر ہے کہ یہ بدبو کہاں سے آرہی ہے لیکن یہ بو دراصل اس کے ضمیر کے اندر کی ہے۔ اقبال حسن آزاد اپنے معاشرے سے مایوس نظر آتے ہیں جو اخلاقی طور پر سڑ چکا ہے۔

اقبال حسن آزاد نے افسانے کے فن کا لحاظ رکھتے ہوئے بیانیہ اسلوب اختیار کیا ہے۔ ان کی یہ خوبی ہے کہ وہ کسی بھی واقعہ یا منظر کو مکمل احساس و جذبات میں ڈوب کر بیان کرتے ہیں جس سے کہانی قاری کی دلچسپی میں اضافہ کرتی ہے۔ ان کے بعض افسانے ایسے بھی ہیں جو قاری کو زندگی گزارنے اور زندگی میں آنے والے مسائل سے سمجھوتہ کرنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ 'مردم گزیدہ'، 'سوختہ ساماں' اور 'آسیب' قاری کو زندگی کے مختلف پہلوؤں سے روشناس کراتے ہیں۔ مثلاً 'مردم گزیدہ' میں وہ یہ پیغام دیتے ہیں کہ ہر انسان اذیت میں مبتلا ہے اور زندگی کا دوسرا نام ہی پریشانی ہے۔ نتیجتاً ہمیں سماج میں رہنے کے لیے ہر طرح کی اذیت میں صبر کرنا ہوگا۔ حالانکہ افسانہ نگار کے صبر کرنے کے فلسفے کو تسلیم کرنا مشکل ہے کیونکہ سماج میں یا زندگی میں ہو رہی ہر طرح کی اذیت پر صبر نہیں کیا جاسکتا۔

ان کا افسانہ 'آسیب' زندگی کی تلخ حقیقتوں پر مبنی ہے۔ دراصل یہ افسانہ ہندوستان میں پھیل رہی بے روزگاری کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ بھی بے روزگاری کا شکار ہے۔ تعلیم یافتہ لوگ بھی ایسے کام کرنے پر مجبور ہیں جو ایک ناخواندہ شخص کرسکتا ہے۔ اسی قسم کے لوگ مکمل طور پر تقدیر یا قسمت پر یقین رکھتے ہیں چونکہ اس کے علاوہ ان کے دل کی تسکین کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ افسانے میں زندگی کی کامیابی اور ناکامیابی کا حصول سب تقدیر پر قائم دکھایا گیا ہے اس میں ایک تعلیم یافتہ شخص اپنی تمام زندگی ایک گھریلو ملازم بن کر گزار دیتا ہے۔

اقبال حسن آزاد کا ایک اہم افسانہ 'پورٹریٹ' ہے جو غالباً ہنری جیمس کے ناول The Portrait of A Lady (1881) سے متاثر ہوکر لکھا گیا ہے۔ حالانکہ دونوں کا تھیم مختلف ہے پھر بھی کچھ چیزیں مشترک معلوم ہوتی ہیں۔ اقبال حسن آزاد نے فنی چابکدستی سے افسانے کو بالکل مختلف انداز سے پیش کیا ہے۔ افسانہ میں پوری ایک نسل کا فاصلہ یعنی جنریشن گیپ دکھایا گیا ہے۔ جس طرح قدیم لوگ اپنی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے انس اور محبت رکھتے ہیں لیکن ان کی اولاد کو اس محبت کا احساس نہیں ہوتا۔ مگر جب وہ خود اس عمر کو پہنچتے ہیں تو حقیقت سے روشناس ہوتے ہیں۔ افسانے میں گھر کی قدیم چیزوں کی قدر، آبائی مکان کی محبت اور اپنی آبائی زمین سے لگاؤ کا جذبہ نمایاں ہے۔ اسی کے ساتھ افسانہ نگار دنیا بھر میں پھیلی مذہبی شدت پسندی کی بھی مخالفت کرتا ہے اور اس بات پر مصر ہے کہ تاریخ خود کو ضرور دہراتی ہے مگر کچھ چیزیں من و عن ویسی ہی رہتی ہیں جیسے پہلے تھیں۔ مثلاً

''کبھی کبھی کسی نیوز چینل کی تلاش میں ریموٹ کنٹرول کا بٹن دباتے وقت اسے عجیب بے ہنگم کپڑوں میں ملبوس اچھلتے کودتے طالب علم نظر آئے تو اسے لگا جیسے واقعی بہت کچھ بدل گیا ہے لیکن جب اسے خبروں کے درمیان خون کے دھبے اور دھوئیں کے بادل دکھائی دیے تو محسوس ہوتا کہ کچھ بھی نہیں بدلا ہے۔''

یعنی کیلنڈر کی تاریخیں تو بدل رہی ہیں لیکن حادثات، بدعنوانی، قتل و غارت گری اور فسادات میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔

اسی طرح اقبال حسن آزاد کے زیادہ تر افسانے عصری سماج کی کڑوی حقیقتوں کا آئینہ دکھاتے ہیں لیکن کچھ افسانے جیسے 'مرد' اور 'کھنڈر' فنی طور پر کمزور ہیں۔

آخر میں کہا جا سکتا ہے کہ اقبال حسن آزاد کا مجموعہ 'پورٹریٹ' اشاعت و طباعت کے لحاظ سے جاذب نظر ہے لیکن پروف کی غلطیاں گراں گزرتی ہیں۔

تاریخ

غداروں کی کارستانیاں (1757 تا 1857 کے تناظر میں)

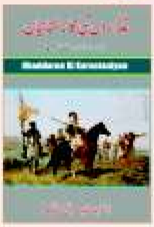

مصنف: ڈاکٹر محمد شاہد صدیقی (علیگ)

صفحات: 336، قیمت: 300، سنہ اشاعت: 2020

مطبع: کہکشاں گرافکس، دہلی

مبصر: ڈاکٹر خالد ظہیر

1172، وارڈ نمبر 4، محلہ: اسلام آباد، میرٹھ

ہر ملک کے اپنے سیاسی، سماجی، تہذیبی، ثقافتی اور اقتصادی حالات ہوتے ہیں۔ ہندوستان بھی اس سے اچھوتا نہیں ہے۔ یہاں کے بھی اپنے حالات رہے ہیں۔ ماضی میں یہاں کی سرزمین میں بھی بہت کچھ گزرا ہے جو اب قصہ پارینہ ہو چکا ہے، جس کو تاریخ کی آنکھوں سے ہم دیکھ سکتے ہیں، پڑھ سکتے ہیں اور ماضی کے ہندوستان سے واقف ہو سکتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد شاہد صدیقی (علیگ) مؤرخ ہیں۔ وہ تحقیق کے جویا ہیں، جب تک بات کی باریکی اور تہہ تک نہیں پہنچتے تب تک اس کو اپنی تحریر کا جزو نہیں بناتے، پھر چاہے اس کے لیے انہیں کہیں بھی جانا پڑے، کچھ بھی کرنا پڑے، کوشش جاری رہتی ہے۔ یعنی جب تک اس کی مکمل دلیل، ثبوت وشواہد اور سند نہ مل جائے ان کو صبر نہیں آتا۔ وہ دستاویزوں اور حوالوں کے ساتھ واقعات کو ترتیب وار پیش کرتے ہیں۔ تاریخی موضوعات پر لکھنے والوں میں ڈاکٹر محمد شاہد صدیقی (علیگ) کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی کتاب 'جنگ آزادی کے سرخیل' اس کی غماز ہے۔ ہندوستان کی جنگ آزادی سے متعلق ان کی ایک تاریخی پیش کش ''غداروں کی کارستانیاں (1757 تا 1857 کے تناظر میں) منظر عام پر آئی ہے۔ جس میں انھوں نے 1757 اور 1857 کے درمیان جو جنگیں ہندوستانی امرا و نوابین اور انگریزوں کے درمیان ہوئی ہیں، ان کو رقم کرنے کی سعی کی ہے۔ جیسا کہ کتاب کے نام سے موسوم ہے کہ اس میں اُن غدارانِ وطن کو نشان زد کیا گیا ہے جو انگریزوں کے مصاحب بنے ہوئے تھے، یعنی جنھوں نے قوم سے غداری کی اور انگریزوں کا ساتھ دیا۔ یہ کتاب 12 مضامین پر مشتمل ہے۔ فاضل مصنف نے معروضات سے کتاب کی شروعات کی ہے جس میں انھوں نے ہندوستان میں انگریزوں کی آمد، ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام اور مغلیہ سلطنت کے عہد زوال کو مختصراً پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ علاوہ ازیں صوبہ بنگال، جنگ بکسر، ریاست خداداد (میسور) سید احمد شہید، سقوط دلی، جھانسی، غدار فرمارو والیان ریاست، پنجاب، راجپوتانہ، وسطی ہند و دیگر ریاستیں، اجمالی تجزیہ اور کتابیات۔

صوبہ بنگال کے صوبے دار علی وردی خاں کے اولاد نرینہ نہ تھی۔ انھوں نے اپنی دختر گُر د آمنہ بیگم کے فرزند زین الدین خاں سراج الدولہ کو اپنا جانشین بنایا۔ علی وردی خاں کی وفات کے بعد 10 اپریل 1756 کو سراج الدولہ تخت نشین ہوئے۔ علی وردی خاں بہت ہی سمجھدار انسان تھے۔ انھوں نے انگریزوں کی نیت بھانپ لی تھی کہ ان کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔ انگریزوں نے بنگال کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک سازشوں کا جال بچھا رکھا تھا۔ سراج الدولہ کو اس کے جاسوسوں اور فرانسیسی خیر خواہوں کے ذریعے انگریزوں اور ہندوستانی غداروں کی سازشوں کی خبریں مل رہی تھیں۔ انگریز میر جعفر کو مسند نشین کرنا چاہتے تھے، سراج الدولہ کا فوج پر سے بھروسہ اٹھ چکا تھا۔ اس نے فرانسیسوں، مرہٹوں اور اودھ وغیرہ سے مدد مانگی لیکن سب بے سود۔ میر جعفر نے انگریزوں سے خفیہ معاہدہ کیا۔ میر جعفر بہت بڑا غدار تھا اس نے سراج الدولہ کے سامنے قرآن مجید کی جھوٹی قسم کھائی۔ جنگ پلاسی میں میر مدن اور راجہ موہن لال جاں نثاری سے لڑتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ میر جعفر اپنی فوجی ٹکڑی کے ساتھ کھڑا ہوا دور سے تماشا دیکھتا رہا۔ غداروں کی وجہ سے جنگ پلاسی میں انگریزوں کو فتح ہوئی۔

جنگ بکسر 23 اکتوبر 1763 کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہیکڑ زور اور مغل بادشاہ شاہ عالم، نواب شجاع الدولہ (اودھ) اور نواب میر قاسم (بنگال) کے درمیان ہوئی۔ جنگ پلاسی کی طرح یہاں بھی غداروں کی پوری پلٹن موجود تھی۔ میر قاسم کے جری، بہادر اور دور اندیش فوجی کمانڈر تقی خان کی تمام تحریکات اور تجاویز کو مرشد آباد کے نائب گورنر سید محمد خاں نے مٹی میں ملا دیا، جس کا انجام یہ ہوا کہ تقی خان جاں بحق ہو گئے اور میر قاسم شکست سے دوچار ہوئے۔

بکسر جنگ میں شاہ عالم (دوئم)، بنگال نواب میر قاسم اور اودھ کے نواب شجاع الدولہ کے عزت ووقار اور رتبے کو بہت زک پہنچی اور کمپنی کی بالادستی قائم ہوئی۔ ان تینوں حاکموں کی اب کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔ ان کے بعد جو تھوڑا بہت مقابلہ مرہٹوں اور سکھوں نے کیا وہ بھی جلد ہی سرد پڑ گیا اور اس طرح جنگ پلاسی کے بعد جو کسر باقی بچی تھی وہ جنگ بکسر نے پوری کر دی۔

انگریزوں نے ٹیپو سلطان کے خلاف اپنے زرخرید غداروں کا ایک پورا ٹولہ کھڑا کر دیا تھا۔ جن کی سازشوں اور غداری کی وجہ سے سلطنت خداداد کی بنیاد کھوکھلی ہو گئی اور ایک مستحکم قلعہ سری رنگا پٹم کمزور ہو گیا۔ انگریزوں نے جب سری رنگا پٹم کو اپنے شکنجے میں کس لیا اس کے بعد ٹیپو کو اطلاع ملی تب تک دیر ہو چکی تھی۔ اس کا جاں باز وفادار سید عبدالغفار بدقسمتی سے شہید ہو چکا تھا۔ انگریزوں نے قلعے پر حملہ کر دیا اور ٹیپو ایک معمولی سپاہی کی طرح پیدل ہی انگریز فوج سے سینہ سپر ہو گیا۔ بڑی بہادری، شجاعت، پامردی اور ہمت کے ساتھ دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ٹیپو نے بزدلی، پس ہمتی اور نامردی کے مقابلے بہادری، ہمت وشجاعت سے مقابلہ آرا ہو کر موت کو فوقیت دی اور وہ تاریخی جملہ کہا کہ ''شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔'' یہ جملہ تاریخ میں امر ہو گیا۔ حیدر علی اور ٹیپو سلطان یعنی دونوں باپ بیٹوں نے قرآن حکیم پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی تھی کہ برطانوی حکومت کے خلاف آخری دم تک لڑتے رہیں گے اور اس طرح وہ ملک عزیز کی حفاظت کرتے ہوئے جاں نثار شہید ہو گئے۔

جھانسی، پنجاب، وسطی ہند وغیرہ 1857 کے تعلق سے اہمیت کے حامل ہیں۔ فرنگیوں سے دیش کو آزاد کرانے کے لیے تمام تر کوششیں کی گئیں لیکن انگریزوں کی منصوبہ بندی اور حربوں کی وجہ سے کامیابی نہ مل سکی۔ انھوں نے سامان حرب کا استعمال تو بہت کم کیا لیکن جنگی چالیں اور آپسی منافرت یعنی بانٹو اور راج کرو والی پالیسی اختیار کر کے ملک میں غدار پیدا کیے۔ ان غدارانِ وطن نے انگریزوں کا پورا پورا ساتھ دیا وہ انگریزوں کو پل پل کی خبریں پہنچاتے رہے جس کی وجہ سے انھیں فتح یابی نصیب ہوئی۔ یعنی ملک عزیز کو غلام بنانے میں ہم وطن غداروں نے اہم کردار ادا کیا۔ غدارانِ وطن اور دغابازوں سے تاریخ ہند کے اوراق سیاہ ہوئے پڑے ہیں۔

تاریخ جیسے خشک مضمون کو اس شگفتگی سے تحریر کرنا کہ ذہن ودل اس طرح آمادہ و مائل ہو کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہے یہ شاہد صدیقی کی نثری صلاحیت کا کمال ہے۔ انھوں نے جن شعروں، محاوروں اور کہاوتوں کو برتا ہے اس سے نہ صرف نثر میں رنگینی پیدا ہوئی ہے بلکہ اس کی دلچسپی میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ زبان بہت آسان اور شستہ استعمال کی گئی

ہے۔کہیں کہیں دکنی الفاظ در آئے ہیں،عربی فارسی الفاظ کا بھی برمحل استعمال کیا گیا ہے۔کتاب کی پشت پر پروفیسر بی۔شیخ علی سابق شیخ الجامعہ منگلور اور گوا یونیورسٹی کا پر مغز مختصر مضمون ہے جس میں کتاب کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔کتاب مجلد، سرورق نہایت دیدہ زیب تصویر سے مزین،سفید دبیز کاغذ اور بہت مناسب قیمت پر دستیاب ہے۔امید ہے کہ یہ کتاب تاریخی،علمی وادبی حلقوں میں خوب پذیرائی حاصل کرے گی اور تشنگان علم کو سیراب کرے گی۔

شاعری

شگفت آگہی

شاعر:سلیم انصاری

صفحات: 160، قیمت: 107 روپے،سنہ اشاعت: 2020

ناشر:حالی پبلشنگ ہاؤس،نئی دہلی

مبصر :مبشر عالم، 275،گلی نمبر-6،للیتا پارک،لکشمی نگر،دہلی 92

'شگفتِ آگہی' سلیم انصاری کا دوسرا شعری اظہار ہے، جو حال ہی میں کتابی شکل میں شائع ہوا ہے۔اس سے قبل ان کی اولین شعری کتاب 1996 میں 'فصلِ آگہی' کے عنوان سے منظرِ عام پر آئی تھی جس نے ناقدین شعروادب کی توجہ اور پذیرائی حاصل کرنے میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کی تھی۔سلیم انصاری کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جتنے اچھے شاعر،نثر نگار اور ناقد ہیں اتنے ہی اچھے انسان بھی ہیں۔گذشتہ برس ان کے تنقیدی اور ادبی مضامین پر مشتمل کتاب 'مطالعے کا سفر' شائع ہو چکی ہے جسے ادبی حلقوں میں خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔

سلیم انصاری کا شمار 1980 کے بعد نمایاں طور پر اپنی شناخت بنانے والے ان شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے مابعد جدید شعری اور تخلیقی رویوں کو اپنی شاعری میں نہایت خوبصورتی اور ہنرمندی سے برتا ہے اور زندگی کے مختلف رنگوں اور عصری مسائل و مصائب سے اپنا تخلیقی مواد کشید کیا ہے۔اس حوالے سے دیکھیں تو وہ شاعری میں اپنے عہد کے تخلیق کاروں میں ممتاز اور منفرد نظر آتے ہیں۔سلیم انصاری نظم اور نثر میں یکساں دسترس اور مہارت رکھتے ہیں اور دونوں میدان میں ایک منفرد شناخت بھی رکھتے ہیں یہاں یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ سلیم انصاری کی نثر ہو یا نظم دونوں ادبی حلقوں میں توجہ اور سنجیدگی سے پڑھی جاتی ہیں۔انھوں نے اپنی تنقیدی کتاب 'مطالعے کا سفر' کے دیباچے میں یہ واضح کر دیا ہے کہ وہ بنیادی طور پر شاعر ہیں اور ان کی شناخت بطور شاعر کے ہی کی جائے،وہ یہ سب شاید اس لیے بھی کہتے ہیں کہ ان کا ذہن تخلیقی ہے اور وہ تخلیق کو تنقید پر ترجیح دیتے ہیں۔

شگفتِ آگہی میں اگرچہ غزلوں اور نظموں کے علاوہ آزاد غزلیں،دوہے، ماہیے اور ہائیکو وغیرہ بھی شامل ہیں مگر شاعری میں ان کی دلچسپی اور علاقہ غزل اور نظم جیسی معروف اصناف سخن سے ہی ہے،اور ان کی شناخت بھی انہی دونوں اصناف کے حوالے سے قائم ہے۔ وہ یہ بات واضح بھی کر چکے ہیں کہ ان کی شاعری کو نظم وغزل کے حوالے سے ہی پرکھا جائے کیونکہ انھوں نے دیگر اصناف سخن میں طبع آزمائی محض منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے یا پھر دوستوں کے اصرار پر کی ہے۔

'شگفت آگہی' کی غزلوں اور نظموں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلیم انصاری اپنے شعری اظہار کے لیے جو زبان استعمال کرتے ہیں اس پر مکمل گرفت رکھتے ہیں ان کی نظمیں ہوں یا غزلیں حشو و زوائد سے پاک ہیں مصرعے چست اور منفرد تراکیب لفظی سے مزین ہوتے ہیں۔یہی نہیں ان کے یہاں عصری شعور و آگہی کی آمیزش سے نیا شعری منظر نامہ خلق کرنے کی بھرپور صلاحیت موجود ہے۔ان کی بعض نظمیں مختصر بلکہ بے حد مختصر یعنی محض چند لفظوں پر مشتمل ہیں مگر تاثر کے اعتبار سے بھرپور اور جذبے کی شدت سے معمور ہیں۔ایک نظم رات ملاحظہ فرمائیں۔

رات
جنگلوں میں اتری تھی
مگر جگنوؤں نے اسے
شہروں کی طرف دھکیل دیا

میں سلیم انصاری کے دوسرے شعری مجموعے کی اشاعت پر انھیں مبارک باد پیش کرتا ہوں بلکہ پر امید ہوں کہ 'شگفتِ آگہی' کو 'فصلِ آگہی' سے بھی زیادہ پذیرائی ملے گی۔

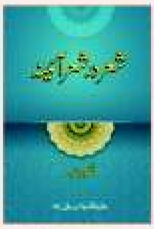

شعر در شعر آئینہ

شاعر :شکور انور

صفحات: 194، قیمت: 300 روپے،سنہ اشاعت: 2020

ناشر:حالی پبلشنگ ہاؤس،دہلی

مبصر:صبیحہ اطہر، 322،گلی نمبر 9،،للیتا پارک،لکشمی نگر،دہلی 92

'شعر در شعر آئینہ' راجستھان کے قابل ذکر شاعر شکور انور کا تازہ ترین شعری اظہار ہے جس میں حمد و نعت کے علاوہ غزلیں شامل ہیں۔اس سے قبل ان کے دو شعری مجموعے ہندی میں اور دو شعری مجموعے اردو میں شائع ہو کر قبولِ عام کی سند حاصل کر چکے ہیں۔شکور انور نظم اور غزل ہر دو اصناف سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔اس کے علاوہ ماہیوں پر مشتمل ان کا ایک مجموعہ بھی منظرِ عام پر آچکا ہے۔شکور انور جہاں ایک طرف غزل کے معروف شاعر ہیں وہیں انھیں نظموں کی تخلیق سے بھی گہرا شغف ہے۔

موجودہ عہد میں شاعری خصوصاً غزل اپنے عہد کے مسائل و مصائب کے اظہار میں پوری طرح کامیاب ہے۔شکور انور کے مطابق غزل کا کینوس بے حد وسیع ہے۔ یہ محبت،عشق اور عاشقی کے مضامین سے نہ صرف لطف اندوز کراتی ہے بلکہ اس کے ذریعے ذات وکائنات کا مشاہدہ بھی کیا جا سکتا ہے نیز یہ ہمیں زندگی کے رموز سے بھی واقف کراتی ہے۔اس حوالے سے اگر ان کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی غزل زندگی اور اس کے متعلقات سے عبارت ہے۔وہ جہاں ایک طرف اپنے احساسات اور جذبات کو غزل میں سمو سکنے پر قادر ہیں وہیں اپنے مشاہدات اور تجربات کو بھی اپنی غزل میں بیان کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔شعر در شعر آئینہ میں شامل ان کی غزلوں میں زندگی کے مختلف رنگوں اور ان کی مثبت سوچ سے سجی ہوئی ایک خوبصورت کہکشاں موجود ہوتی ہے جس کے سبب ان کی شاعری میں ایک انفرادی جہت پیدا ہو گئی ہے جو غزل کے سنجیدہ قارئین کے لیے دلچسپی کا سبب ہے۔چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

زندگی کھیلتی پھرتی تھی گلی کوچوں میں
اتنے مقتل سرِ بازار کہاں تھے پہلے
کس دورِ نامراد میں پیدا ہوا ہوں میں
کس درجہ بدحواس ملی زندگی مجھے
بدل سکتے ہیں ہم خود زندگی کو
مقدر سے بندھا کوئی نہیں ہے

شعر در شعر آئینہ کے مطالعے کے دوران میں نے محسوس کیا ہے کہ شکور انور کی شاعری میں روایتی اور جدید ہر دو طرح کے خیالات کی آمیزش ملتی ہے مگر انھوں نے اپنے شعری اظہار کے لیے جس زبان کا استعمال کیا ہے وہ بالکل روایتی ہے۔ان کی شاعری کا لہجہ سادہ اور براہِ راست قاری کے ذہن و دل تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ان کے یہاں غیر ضروری استعارات اور علامات سے بھی گریز کیا گیا ہے، جس کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ اردو کا عام سے عام قاری بھی ان کی شاعری کے معانی اور مفاہیم سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔دوسرے ان کی شاعری میں کسی بھی طرح کی معنوی پیچیدگی کا احساس نہیں ہوتا۔

شکور انور کی شاعری کو کئی زاویوں سے سمجھا جا سکتا ہے۔ان کی شاعری میں رومانی احساسات بھی ہیں، عصری شعور و آگہی بھی ہے، فرد اور معاشرے کے درمیان ٹوٹتے رشتوں کی داستان بھی ہے، زوال پذیر تہذیب کا نوحہ بھی ہے، اس سے بڑھ کر ان کی شاعری میں ایک طرح کی سادگی اور سچائی بھی ہے۔وہ انسانی ہمدردیوں کے شاعر ہیں۔ اس کے علاوہ اخلاقی قدروں کے انحطاط کا احساس بھی ان کی شاعری میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔جنگل، چاند، چراغ، آسمان، سفر، صحرا، دشت اور سمندر جیسے عام الفاظ کی مدد سے نئے شعری پیکر تراشنے کا عمل انھیں کئی ہم عصر شعرا کے مقابلے ممتاز کرتا ہے۔

تراجم

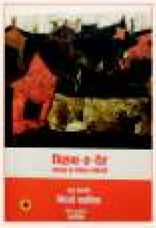

چراغ دیر

مترجم: صادق

قیمت: 299

ناشر: راج کمل پرکاشن، دہلی

مبصر: ڈاکٹر اسد رضا، 21/37, 3 cc، روڈ، دہرہ دون، اترا کھنڈ

اردو شعرا و ادبا ہندوستانی ادبی و مذہبی روایات سے نہ صرف متاثر ہوئے بلکہ اپنی تخلیقات میں ان کی عکاسی بھی کی۔ یہاں یہ تذکرہ بھی برمحل ہوگا کہ جہاں اردو کے غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں نے پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰؐ اور دیگر اسلامی شخصیات کو خراج عقیدت پیش کیا وہیں مسلم ادبا اور شعرا نے شری رام چندر و شری کرشن جیسی اہم ہستیوں سے اپنی جذباتی و روحانی وابستگی کا اظہار اپنی نثری و شعری تخلیقات میں کیا اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اردو کے اہم ترین شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالب نے بھی ہندوستان کی شاندار مذہبی و تہذیبی روایات پر نہ صرف نثر میں بلکہ نظم میں بھی خامہ فرسائی کی۔مرزا غالب کے یوں تو بے شمار اشعار اور خطوط ہیں جن میں ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی ترجمانی ہے لیکن اس عظیم شاعر کی وہ فارسی مثنوی جو انھوں نے تقریباً دو سو سال قبل اپنے قیام بنارس کے دوران کہی تھی اور جسے انھوں نے 'چراغ دیر' کا عنوان دیا تھا، آج بھی اہمیت و افادیت کی حامل ہے۔ اسی لیے اردو، ہندی اور فارسی زبانوں پر عبور رکھنے والے دہلی یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ اردو، ممتاز ناقد و مترجم، مصور اور شاعر پروفیسر صادق نے اس لازوال مثنوی کا ہندی زبان میں ترجمہ کیا نیز حاشیوں میں وضاحت بھی کی اس کی خاطر خواہ پذیرائی نہ صرف ہندی دنیا میں ہوئی بلکہ اس ترجمہ پر انگریزی، ہندی اور اردو زبانوں میں تبصرے بھی تحریر کیے گئے جو موقر جرائد میں زینتِ اشاعت بنے۔

دراصل بنارس جسے اب وارانسی کہا جاتا ہے، دنیا کے ان قدیم ترین اور مقدس شہروں میں سے ہے جن کی تہذیبی، تاریخی، مذہبی، سماجی اور روحانی اہمیت و افادیت ہمیشہ برقرار رہی اور جو آج بھی کروڑوں افراد کی عقیدت گاہیں ہیں۔ وارانسی اپنے مندروں، گنگا کے گھاٹوں، آرتیوں، پجاریوں، فلسفیوں، تلسی، کبیر اور رامانند جیسی مذہبی شخصیات کی بدولت نہ صرف ہندوستان میں بلکہ ساری دنیا میں مشہور ہے اور یہاں ہر سال کروڑوں افراد زیارت کرنے آتے ہیں۔مرزا غالب بھی اس پُر فضا اور مقدس شہر سے بہت متاثر ہوئے تھے اور 108 اشعار پر مبنی اپنی شہرۂ آفاق فارسی مثنوی ''چراغ دیر'' کہی جو دراصل ایک بیانیہ نظم ہے اور روحانی رفعت نیز بادِ مسرت و تحیر کی مظہر ہے۔ چونکہ غالب ہندوستانی تخلیقی ہنرمندی کے شاندار اور ماہر ترجمان ہیں۔ لہٰذا انہیں بنی نوع انساں کے گہوارہ بنارس نے اپنی جانب راغب کیا۔دراصل مرزا اسد اللہ خاں غالب کی پنشن انگریزوں نے روک دی تھی لہٰذا اپنی پنشن دوبارہ جاری کرانے کے لیے 1827 میں غالب نے کولکاتہ کا سفر کیا۔ واضح ہو کہ اس دور میں ہندوستان کی راجدھانی انگریزوں نے کولکاتہ کو ہی بنا رکھا تھا۔اس لیے انگریز حکومت سے اپیل کرنے کے لیے ہندوستان کے ہر خطے سے لوگوں کو کولکاتہ ہی جانا پڑتا تھا۔ غالب دہلی سے کولکاتہ کے لیے روانہ ہوئے تو لکھنؤ، باندہ اور الٰہ آباد سے گزرنے کے بعد وہ بنارس میں چار ماہ کے لیے ٹھہرے تھے۔وہ اگست 1827 میں وارانسی پہنچے اور نومبر 1827 تک وہاں قیام کیا اور اس شہر کے قدرتی مناظر، ہریالی و شادابی، مندروں کی شان، گنگا کے گھاٹوں کی خوبصورتی اور وہاں کی روحانی فضا کا غالب کے دل و دماغ پر گہرا اثر پڑا۔علاوہ ازیں اس شہر کے باشندوں کے حسن اخلاق، خلوص، خاطر تواضع، عزت افزائی اور ملنساری سے بھی غالب بہت متاثر ہوئے۔ بنارس میں قیام کے دوران غالب پر جو وجدانی کیفیت طاری ہوئی تھی وہ برسوں تک قائم رہی۔اسی لیے انھوں نے اپنے ایک دوست محمد علی خاں کو ایک خط میں لکھا ''اگر مجھے توہین مذہب کا خوف نہ ہوتا تو میں اپنا مذہب ترک کر دیتا اور مالا پھیرتا، جنیو پہنتا، اپنے ماتھے پر ٹیکہ لگاتا اور اسی طرح گنگا کے کنارے اپنی زندگی گزار دیتا۔'' اپنے روحانی وجدان اور تہذیبی عرفان کے زیر اثر ہی غالب نے ''چراغ دیر'' مثنوی کہی جس کے تراجم کئی زبانوں بالخصوص اُردو اور ہندی میں ہوئے۔

پروفیسر صادق نے اس مثنوی کا ہندی میں ترجمہ ہندی شعریات کے تمام لوازمات، لسانی روایات اور عصری تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر کیا۔انہوں نے متعدد فارسی الفاظ، تلمیحات اور ضرب الامثال کے مطالب عام فہم ہندی میں بیان کیے ہیں۔

معروف ہندی اسکالر ڈاکٹر نریندر موہن نے 'چراغ دیر' کے ہندی ترجمہ کی اپنے اس تبصرہ میں ستائش کی ہے جو ہندی دو ماہی 'سم کالین بھارتیہ ساہتیہ دہلی' میں شائع ہوا تھا۔موہن جی لکھتے ہیں۔ ''صادق کا یہ عمل نہایت مناسب تھا کہ انہوں نے غالب کے ان اشعار کو شعری پیکر میں ڈھال کر پیش کیا''۔

دراصل مترجم صادق پہلے تو غالب کی اس مثنوی کے دریائے سخن میں ڈوبے اور شاعر کے تخیلات کو گہرائی و گیرائی سے سمجھنے کی کامیاب سعی کی اور پھر انہیں ہندی زبان کے لب و لہجے میں جذب کیا۔ یہ ایک دقت طلب عمل تھا۔اسی لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اجمال نگاری اور معنویت سے پُر 'چراغ دیر' کو ہندی لہجۂ شاعری میں اُتارنا صادق صاحب کے فن ترجمہ نگاری کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ترجمہ کیا ہوا ایک ہندی شعر دیکھیے:

سانس کو رکتم بنانے والی/ ایک فریاد ہے/ جس میں/ جگر کے
رکت رنجت کن/ بھی شامل ہو گئے ہیں

یہاں 'رکتم' کا اردو میں مطلب ہے 'خون آلود' اور 'رکت رنجت کن' کے معنی ہیں 'خون میں آلود ذرات'۔

چونکہ مترجم صادق ایک مصور بھی ہیں اور رنگوں کی زبان سے بخوبی واقف ہیں لہٰذا انہوں نے اس مثنوی کے ان رنگوں کی بھی ہندی لب و لہجے میں عکاسی کی ہے جس میں غالب ڈوبے ہوئے تھے۔ اس طرح مترجم غالب کی شاعری کے متنوع اور دلکش

رنگوں میں شامل ہوکر 'چراغ دیر' کو ہندی میں منتقل کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ ایک شعر کا ترجمہ پیش ہے غور فرمائیے:

کتھا ویا تھا مری/محبوب کی زلفوں سے بھی/ زیادہ بکھری/ اور اُلجھی ہے
اور میر اروم روم/ جیبھ بن جانے کا دعویٰ کر رہا ہے/ خود سُنانے کو وہی
جو آج تک میں نے سہا ہے

پروفیسر شافع قدوائی نے انگریزی روزنامہ 'دی ہندو' نئی دہلی میں اس ترجمہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ "ہندوستانی جمالیات اور ادبی روایات پر گہری نظر کے باعث صادق میں ایک اکمل ترجمہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ انھوں نے غالب کی معیاری اور بے عیب فارسی کو نہایت ہنرمندی سے ہندی میں پیش کیا ہے۔ یہ مثالیں ہماری بات کو صحیح ثابت کرتی ہیں:

زمانے بھر میں یہ استقل مقام فخر کہلاتا ہے/ دہلی شہر تو اس کی پری کرما کو آتا ہے
شُشر ہو، گریشم یا ورشا رت ہو/ ان میں سے ہر ایک رُت میں
بنارس کی فضا جنت نظیر معلوم ہوتی ہے

صادق صاحب کا یہ ہندی ترجمہ راج کمل پرکاشن اور رضا فاؤنڈیشن دہلی نے مشترکہ طور پر شائع کیا ہے اور اس کی ہندی دنیا میں خاطرخواہ پذیرائی بھی ہوئی ہے لیکن ناشرین نے 124 صفحات کی اس ترجمہ پر مشتمل کتاب کی قیمت 300 روپے رکھی ہے جو ہندی کے عام قاری کے لیے زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ چونکہ غالب اور مترجم صادق صاحب کے نام بڑے ہیں لہٰذا اس کتاب کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ بہر حال صادق کا یہ ترجمہ ایک بڑا اور تاریخی کارنامہ ہے جسے غالب کے شائقین اپنے گھروں میں رکھنا پسند کریں گے۔

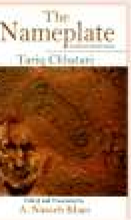

دی نیم پلیٹ

مترجم: اے نصیب خان
صفحات: 195، قیمت: 300 روپے
ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی
مبصر: حقانی القاسمی، موبائل نمبر: 9891726444

زبانیں جب اپنی زمین تک ہی محدود رہ جاتی ہیں تو پھر اس کا دائرہ بہت مختصر ہوجاتا ہے اور جب زبانیں سفر کرتی ہیں تو اس کے اثرات لامحدود ہوجاتے ہیں۔ اس طرح سے لسانی، ثقافتی تعامل اور تفاہم کی جو صورت نکلتی ہے وہ بہت سی غلط فہمیوں، شکوک وشبہات اور مفروضات کا ازالہ بھی کرتی ہے۔

ترجمے کا عمل نہ ہوتا تو شاید تہذیبیں ایک دوسرے سے مانوس نہیں ہو پاتیں اور مختلف قوموں، زبانوں کے مابین اجنبیت، بیگانگی کی دیوار ہمیشہ کھڑی رہتی۔ لیکن ترجمے سے بہت سے دریچے کھلے ہیں اور ایک دوسرے کے لسانی اور تخلیقی کلچر سے مانوس ہونے کا رجحان بڑھا ہے۔ اگر انگریزی سے اردو میں ترجمے نہ ہوئے ہوتے تو شاید ہم اہم علمی، ادبی اور ثقافتی سرمائے سے محروم ہوجاتے۔ ہماری زبان کی ثروت میں تراجم کے ذریعے بہت اضافہ ہوا ہے۔ اسی طرح اردو زبان سے انگریزی اور دوسری زبانوں میں جو ترجمے ہوئے ہیں ان سے اردو زبان کی اہمیت، معنویت اور عظمت بڑھی ہے اور دوسری زبانوں پر ہمارے افکار و تصورات کا عمدہ تاثر قائم ہوا ہے۔ اردو زبان کی خوش نصیبی ہے کہ اس کے بہت سے شاہکار انگریزی اور دوسری زبانوں میں منتقل کیے گئے جس کی وجہ سے دوسری زبانوں کے تخلیق کاروں اور ناقدین کو بھی اس زبان سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ اردو سے انگریزی میں ترجمے کا سب سے پہلا کام شاید ایک انگریز Duncan Forbes نے میر امن کے 'باغ و بہار' کے ترجمے کے ذریعے کیا۔

مشاہیر اردو شعرا کے انگریزی میں ترجمے ہوچکے ہیں، خاص طور پر غالب، میر، فیض، فراق وغیرہ کے ترجمے کیے گئے ہیں۔ اسی طرح فکشن کے ترجمے بھی انگریزی میں ہوتے رہے ہیں، خاص طور پر 'مراۃ العروس'، 'آگ کا دریا'، 'ایک چادر میلی سی'، 'بازار حسن'، 'امراؤ جان ادا' کے علاوہ عصمت چغتائی، انتظار حسین، نیر مسعود، سید محمد اشرف اور دیگر فکشن نگاروں کے ناولوں اور افسانوں کے ترجمے ہوتے رہے ہیں اور ترجمہ کرنے والے بھی ایسے لوگ ہیں جنھیں ادبی دنیا میں شہرت و مقبولیت حاصل ہے۔ اردو سے انگریزی میں جن ترجمہ نگاروں نے اپنی الگ شناخت قائم کی ہے، ان میں خوشونت سنگھ، قرۃ العین حیدر، شمس الرحمٰن فاروقی، کے سی کانڈا، سی ایم نعیم، کلدیپ سلیل، محمد عمر میمن، سعید نقوی، رخشندہ جلیل، طاہرہ نقوی، امینہ ظفر، انیس الرحمٰن، پروفیسر اسد الدین، بیدار بخت، جی ای وارڈ، ڈیوڈ میتھیوز، رالف رسل، اعجاز احمد، خواجہ طارق، Frances W Pritchett، باراں فاروقی، یوگیندر بالی، امینہ قاضی انصاری، نشاط زیدی، سیدہ سیدین حمید، عصمت جہاں، شرف علی فاروقی، جے ایل کول، سریندر دیول، محمود احمد کریمی، معاذ بن بلال وغیرہ بہت اہم ہیں جنھوں نے اردو کی شاعری اور فکشن اور دیگر تخلیقات کے ترجمے انگریزی زبان میں کیے ہیں اور ان کے ترجموں کو انگریزی حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا بھی گیا ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے A Bibliography of Short Stories in English Translation کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انگریزی میں اردو کی بہت سی شاہکار کہانیوں کے ترجمے ہوچکے ہیں۔ اس کے علاوہ ساہتیہ اکادمی کے انگریزی مجلّہ 'دی انڈین لٹریچر' اور محمد عمر کے 'دی اینول آف اردو اسٹڈیز' وغیرہ میں انگریزی میں اردو ادبیات پر مضامین اور ترجمے شائع ہوتے رہے ہیں۔

طارق چھتاری بھی ان خوش نصیبوں میں سے ہیں جن کے اردو افسانوں کے ترجمے انگریزی اور دیگر زبانوں میں ہوئے ہیں۔ طارق چھتاری اردو فکشن کا ایک معتبر نام ہے۔ جن کا افسانوی مجموعہ 'باغ کا دروازہ' بہت مشہور ہے۔ اس میں بہت سے ایسے افسانے ہیں جن پر تنقیدی گفتگو ہوتی رہی ہے۔ ایسے ہی عمدہ افسانوں کا انتخاب اور ترجمہ مشہور مترجم اور انگریزی کے شاعر اور ادیب ڈاکٹر اے نصیب خان نے کیا ہے جو بہ حیثیت مترجم نمایاں شناخت رکھتے ہیں۔ انھوں نے خالد جاوید کے مشہور ناول 'موت کی کتاب' اور معین احسن جذبی کے مونوگراف کے علاوہ غالب کے اشعار کا ترجمہ بھی کیا ہے اور انھیں دہلی اردو اکیڈمی کی طرف سے ترجمے کا ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔

عبدالنصیب صاحب انگریزی زبان پر عبور کے ساتھ ساتھ اردو زبان کے آداب و اسالیب سے بھی اچھی طرح واقف ہیں، مصدر اور مستہدف (Source & Target Language) دونوں زبانوں پر انھیں دسترس حاصل ہے۔ اسی لیے انھوں نے طارق چھتاری کے افسانوں کا بہت عمدہ ترجمہ کیا ہے۔ پروفیسر محمد اسد الدین نے یہ اعتراف کیا ہے کہ ان کی زبان میں Source Language کا ذائقہ موجود ہے۔ عبدالنصیب خان نے ترجمے میں اردو کی لطافت، سلاست اور نزاکت کا خاص طور پر خیال رکھا ہے اور کہیں بھی ترجمے میں سقم کا احساس نہیں ہوتا۔ وہی روانی و سلاست ہے جو طارق چھتاری کے اردو افسانوں میں ملتی ہے۔ انھوں نے انگریزی ترجمے میں اردو کے Essence کو برقرار رکھا ہے۔ عبدالنصیب خان نے صرف ترجمہ ہی نہیں کیا ہے بلکہ طارق چھتاری کے افسانوں پر ایک بیش قیمت مقدمہ بھی تحریر کیا ہے اور ان کے افسانوی ابعاد کا تنقیدی احاطہ بھی کیا ہے جس سے ترجمہ نگار کے تنقیدی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالنصیب قابل مبارکباد ہیں کہ وہ اردو زبان کے تخلیقی سرمائے سے انگریزی داں حلقے کو متعارف کرا رہے ہیں۔ یہ عمل بہت ضروری ہے کیونکہ انگریزی

جیسی زبان کے ذریعے ہی عالمی شناخت اور رسائی کا دائرہ وسیع ہوسکتا ہے اور دوسری زبانوں میں ترسیل کی صورت نکلنے سے ایک وسیع تر ریڈرشپ بھی حاصل ہوتی ہے۔ آج یہ بجا طور پر کہا جاتا ہے کہ عالمگیر مقبولیت اور گلوبل ریڈرشپ کے لیے انگریزی ترجمے کی نہایت شدید ضرورت ہے کیونکہ ہم نے بہت سے اہم تخلیق کاروں کو انگریزی کے وسیلے سے ہی جانا پہچانا ہے۔ گابریل مارکیز اور اوران پامک کو انگریزی کی وجہ سے بہت دور دور تک شہرت اور مقبولیت ملی ہے۔ مرزا غالب اور دیگر شعرا کی عالمی شہرت وشناخت کا ایک ذریعہ انگریزی ترجمہ بھی ہے۔ رابندر ناتھ ٹیگور کو نوبل پرائز بھی شاید 'گیتا نجلی' کے انگریزی ترجمے کی وجہ سے ہی ملا۔ اسی سیاق وسباق میں عالمی سطح پر اردو کی ثقافتی نمائندگی کا اہم سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ انگریزی اور دیگر زبانوں میں نمائندگی کا تناسب کیا ہے؟ اس پر غور کیا جائے تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ انگریزی سے اردو میں تو بہت سے ترجمے ہو چکے ہیں مگر اردو سے انگریزی میں کم ترجمے ہوئے ہیں۔ کیفیت اور کمیت کا بہت فاصلہ ہے جس کی وجہ سے ہمارے بہت سے اہم تخلیق کار تمام تر تخلیقی قوتوں کے باوجود عالمی شہرت وشناخت سے ہنوز محروم ہیں۔

اب یہ پتہ لگانا ضروری ہے کہ انگریزی میں اردو زبان کی شاہکار کتابوں کے کتنے ترجمے ہوئے ہیں، ان پر دوسری زبان کے قارئین اور ناقدین کا کیا ردعمل ہے۔ مجھے یقین ہے کہ دوسری زبانوں کے قارئین ایسے ترجموں سے نہ صرف محظوظ ہوں گے بلکہ انھیں ہماری لسانی اور ادبی قوت اور ثروت کا بھی احساس ہوگا۔

رسائل و جرائد

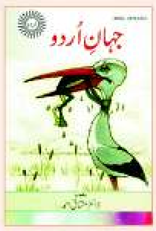

جہان اردو (ریسرچ جرنل)

مدیر: ڈاکٹر مشتاق احمد

صفحات: 272، قیمت: فی شمارہ 100 روپے

شمارہ: 79 (جولائی 2020 تا ستمبر 2020)

ناشر: ادارہ 'جہانِ اردو' رحم گنج، دربھنگہ، (بہار) 846004

مبصر: ڈاکٹر عفت پروین معاون اردو ٹیچر، +2 سمری ہائی اسکول، دربھنگہ (بہار)

کسی بھی زبان کے ادب کو فروغ دینے میں اس زبان کے ادبی رسائل وجرائد کی غیر معمولی اہمیت ہوتی ہے۔ کیوں کہ اکابر ادبا اور شعرا کے ساتھ ساتھ نئی نسل کے قلم کاروں کی شناخت کو استحکام بخشنے میں یہی رسائل وجرائد کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ اردو کے رسائل وجرائد کے سامنے سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ اب اردو معاشرے میں رسائل وجرائد خرید کر پڑھنے کا چلن ختم سا ہوتا جا رہا ہے۔ نتیجہ ہے کہ بیشتر معیاری ادبی رسائل کی اشاعت یا تو محدود ہوگئی ہے یا بہت سے رسالے کا وجود ہی ختم ہوگیا ہے۔ مقامِ شکر ہے کہ شمالی بہار کے دربھنگہ سے سہ ماہی 'جہانِ اردو' گذشتہ دو دہائیوں سے تواتر کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اور اس کے لیے مدیر ڈاکٹر مشتاق احمد کی جانفشانی قابلِ مبارکباد ہے۔ 'جہانِ اردو' نے حالیہ دنوں میں اردو رسائل کے درمیان اپنی ایک منفرد شناخت بنائی ہے۔ میرے پیشِ نظر شمارہ 79 بابت جولائی تا ستمبر 2020 ہے۔ ترتیب پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے ہی یہ حقیقت عیاں ہوجاتی ہے کہ یہ شمارہ بھی گذشتہ شماروں کی طرح وقیع ہے۔

'جہانِ فکر' اداریہ میں مدیر محترم ڈاکٹر مشتاق احمد نے نئی تعلیمی پالیسی کے مسائل اور امکانات پر بھرپور روشنی ڈالی ہے اور حکومت کے اس فیصلے کا خیر مقدم کیا ہے کہ پرائمری تعلیم بذریعہ مادری زبان کو یقینی بنایا جارہا ہے۔ انھوں نے اس پالیسی کو اردو کے لیے مفید قرار دیا ہے۔ 'جہانِ تحقیق وتنقید' کے باب میں پروفیسر محمد قطب الدین، ڈاکٹر نسیم احمد نسیم، ڈاکٹر محمد کاظم، ڈاکٹر سمیع الرحمٰن، ڈاکٹر مجی عبدالرحمٰن، ڈاکٹر نسرین بیگم، ڈاکٹر مشتاق صدف، ڈاکٹر زاہد الحق، سید محمد ظفر اقبال، ڈاکٹر عقیل احمد، ڈاکٹر عبدالرحمٰن ارشد وغیرہ کے تحقیقی وتنقیدی مضامین شامل ہیں۔ پروفیسر قطب الدین نے مولانا ابوالحسن ندوی کی ادبی خدمات کا جائزہ پیش کیا ہے اور ڈاکٹر نسیم احمد نسیم نے امداد امام اثر کا انتقادی اختصاص کو موضوع بنایا ہے جب کہ ڈاکٹر محمد کاظم نے قاضی عبدالستار کی افسانہ نگاری کا محاکمہ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر سمیع الرحمٰن نے اردو میں اسکرپٹ نگاری پر روشنی ڈالی ہے جب کہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن ارشد نے جگن ناتھ آزاد اور ادبِ اطفال کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔

''جہانِ دیگر میں جناب حقانی القاسمی کا مقالہ 'مقدس دیوانگی کی مثال: میرابائی' اور غلام مصطفیٰ کا مقالہ 'بدھ مت فلسفہ ہستی ونیستی کا تصور' شامل ہے۔ اس رسالے کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں 'جہانِ دیگر' کے باب کے تحت بین العلومی مطالعے کو ترجیح دی جاتی رہی ہے۔ حقانی القاسمی صاحب کا مقالہ موضوع اور مواد دونوں اعتبار سے چشم کشا ہے۔ اردو میں اس طرح کے مضامین خال خال ہی لکھے جاتے ہیں۔ حقانی صاحب نے میرابائی کی بھگتی شاعری کو جس انوکھے انداز میں پیش کیا ہے وہ اردو قارئین کے لیے ایک بڑا علمی تحفہ ہے۔ اسی طرح غلام مصطفیٰ نے بدھ مت اور فلسفہ پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ 'جہانِ خاص' اس بار خمار کی شخصیت اور شاعری پر مختص ہے۔ ڈاکٹر ریحان حسن، ڈاکٹر صالحہ صدیقی، ڈاکٹر تسنیم بانو اور ڈاکٹر نشاں زیدی نے خمار کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ 'جہانِ تجزیہ' میں 'آئینہ حیران ہے' کا پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، پروفیسر محمد علی جوہر، پروفیسر محمد آفتاب اشرف اور ڈاکٹر عفت پروین نے تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ 'آئینہ حیران ہے' کی شاعری کورونا اور پھر لاک ڈاؤن کے عرصے میں انسانی معاشرہ جس ہیجانی اور اضطرابی کیفیت سے دوچار رہا ہے اس کو شاعر ڈاکٹر مشتاق احمد نے تخلیقیت کا پیرہن عطا کیا ہے۔ 'جہانِ رفتگاں' کے باب میں ڈاکٹر راحت اندوری کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ مشرف عالم ذوقی اور مدیر ڈاکٹر مشتاق احمد نے راحت اندوری کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا ہے اور انھیں عہدِ حاضر کا مقبول شاعر قرار دیا ہے۔'

جہانِ فسانہ' کے تحت ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کا افسانہ 'وہ قربتیں یہ دوریاں' بھی کورونا اور لاک ڈاؤن کی ہولناکیوں کا ترجمان ہے جب کہ محمد سراج کے تین افسانچے تغیرِ زمانہ کی عکاسی کرتے ہیں۔ 'جہانِ شعر' میں حافظ کرناٹکی کی پانچ غزلیں شائع کی گئی ہیں۔ یہ غزلیں فن اور مواد دونوں اعتبار سے قابلِ مطالعہ ہیں۔

'جہانِ اردو' کا باب 'جہانِ احتساب' دورِ آغاز سے ہی مقبول رہا ہے کہ اس میں ڈاکٹر مشتاق احمد کے تبصرے شامل ہوتے ہیں۔ انھوں نے اس شمارہ میں پانچ کتابوں 'کچھ شگفتگی کچھ سنجیدگی' از پروفیسر ابنِ کنول، 'سرسید اور اردو زبان وادب' مصنف ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی 'مناظرِ ادب' پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، 'مونوگراف مظہر امام' از ڈاکٹر امام اعظم اور 'گیسوئے اردو یو جی سی نیٹ' از غزالہ فاطمہ پر تبصرے کیے ہیں۔ ان تبصروں کے مطالعے سے نہ صرف کتابوں کے موضوعات سے آگاہی ہوتی ہے بلکہ مدیر محترم کی تنقیدی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تبصرہ نگاری کو محض کتابوں کے تعارف تک محدود نہیں رکھتے۔

مجموعی طور پر حسبِ سابق یہ شمارہ بھی مشمولہ مضامین کے معیار و وقار کے لحاظ سے حوالہ جاتی حیثیت کا حامل ہے۔ خصوصی طور پر اس شمارے میں بھی نئی نسل کے قلم کاروں کو جگہ دے کر ان کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے اور یہ قابلِ تحسین عمل ہے کہ نئی نسل کے قلم کار ہی اردو ادب کے روشن مستقبل کے ضامن ہیں۔ رسالے کے مدیر ڈاکٹر مشتاق احمد اور معاون مدیر ڈاکٹر رابعہ مشتاق کی کوششیں قابلِ مبارکباد ہیں کہ اس کورونا اور لاک ڈاؤن کے دور میں بھی 'جہانِ اردو' پابندی کے ساتھ شائع ہوتا رہا ہے اور ادب کے سنجیدہ قارئین کے لیے علمی وادبی آسودگی کا سامان فراہم کرتا رہا ہے۔

شگوفہ (پروفیسر خالد محمود نمبر)

مدیر: ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال
صفحات: 70، قیمت فی پرچہ 25 روپے، سالانہ 400 روپے
ماہ اشاعت: دسمبر 2020، مقام اشاعت: حیدرآباد
مبصر: منظر امام C/o، IDC، C-2، مسجد نوح لین
جوگا بائی ایکسٹینشن، جامعہ نگر، نئی دہلی 110025

جنوبی ہند سے پانچ دہائیوں سے شائع ہونے والے ماہنامہ شگوفہ حیدرآباد کا دسمبر 2020 کا شمارہ اردو کے ممتاز ادیب، شاعر، محقق اور صاحب طرز مصنف پروفیسر خالد محمود کی مختلف تحریروں خصوصاً ان کے انشائیوں اور خاکوں پر مشتمل ہے۔ اس میں کل چار انشائیے اور آٹھ خاکے شامل ہیں۔ ساتھ ہی اس میں چار صفحات پر خالد محمود کے کچھ منتخب کلام جس میں گیارہ پیروڈیز اور 'در مدح آم' کے نام سے ان کی ایک مقبول نظم بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ مولوی انجم عثمانی دیوبندی ثم دہلوی اور پروفیسر شاہ عبدالسلام پر دو مختصر تحریریں بھی ہیں۔ اس پورے شمارے میں ادارے کی جانب سے پروفیسر خالد محمود کے سوانحی اشارے کے علاوہ پروفیسر خالد محمود۔ ایک تعارف، مراسلے اور اداریہ اور 'خالد محمود کے خاکے اور انشائیے' کے عنوان سے ڈاکٹر سید حامد حسن (مرحوم) کی ایک تحریر کے علاوہ ساری تحریریں خالد محمود کی ہی ہیں۔

شگوفہ کے اس خاص شمارہ کے مطالعہ سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ 'سٹی بس کا مسافر'، 'آخری اِفطار'، 'جب اچانک میکے سے......' اور 'مکتبہ جامعہ شاہد علی خاں لمیٹڈ' ایسی زندہ و جاوید تحریریں ہیں جو نہ صرف علمی اور ادبی مذاق کا اعلیٰ نمونہ ہیں، بلکہ اس میں قوم و ملت کی ثقافتی اور اخلاقی ربد اخلاقی کی بھرپور عکاسی کے ساتھ ساتھ اکیسویں صدی کے مایوس اور نت نئے الجھنوں اور اندیشہ ہائے پیہم میں گھرے ہوئے انسانوں کے لیے مسکراہٹ، تفنن اور تفریح طبع کا بہترین مواد ہے۔ سٹی بس کا مسافر پڑھیے اور اس طرح کے ظریفانہ انداز بیان کا لطف لیجیے۔ لکھتے ہیں کہ ''بس پر چڑھنے میں مدد کرنے والا ڈنڈا اگر ان کے ہاتھ میں آ گیا تو سوئی کے ناکے کے برابر جگہ سے بھی اپنے آپ کو نکال دیں گے اور اس کارروائی میں چند سیکنڈ سے زیادہ صَرف نہیں ہوگا۔ یوں بھی سرکاری سٹی بس کو سوار ہونے والوں کی بہ نسبت اترنے والوں کی فکر کم ہی رہتی ہے۔ مسافر اُترنے بھی نہیں پاتے کہ بس آگے بڑھ جاتی ہے۔ لوگ اُترتے بھی اس طرح ہیں جیسے بس کے اندر فرقہ وارانہ فساد ہو گیا ہو۔'' دہلی میں کئی سالوں سے مقیم ہونے کی وجہ سے یہاں کی بس کی سواری کے تجربات سے میں بخوبی واقف ہوں، لیکن اس کا اتنا خوبصورت بیانیہ پہلی مرتبہ سٹی بس میں قرائت کی نظر سے گزرا۔ یہ ایک منجھے ہوئے قلمکار کا ہی کمال ہو سکتا ہے کہ اپنے ذاتی تجربات کو اس طرح کاغذ پر اتار دے کہ ایک قاری کو مطالعہ اور ذاتی مشاہدہ میں کون زیادہ بہتر ہے اس کی تمیز کرنی مشکل ہو جائے۔

مکتبہ جامعہ شاہد علی خاں لمیٹڈ میں ایک مکتبہ کی تاریخ اور اس کی روایتوں کو جس انداز سے قید تحریر میں لایا گیا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے قاری ان لمحات کا خود بھی گواہ بنتا جا رہا ہے۔ اسے آپ خاکہ بھی کہہ سکتے ہیں اور انشائیہ بھی، کیوں کہ اس میں جہاں ایک شخص کی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے، وہیں اس میں ایک ادراہ، اس کی اہمیت، ضرورت اور خدمات کا بھی اعتراف ہے، اور یہ جملے ان دونوں باتوں کی ترجمانی کرتے ہیں کہ ''شاہد علی خاں کی دو بیویاں تھیں ایک میمونہ شاہد دوسری مکتبہ شاہد۔ ایک سے نکاح کیا تھا دوسری سے عشق۔ دونوں سے پانچ اولادیں ہیں۔ عابد، تسنیم، ماجد، کتاب نما، پیام تعلیم، آخر الذکر دو اولادیں مکتبہ سے ہیں۔''

تحقیق اور علمیت سے بھرپور نثری کتابیں اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ، ادب کی تعبیر اور شعر زمین اور سمندر آشنا جیسی شعری مجموعوں کے مصنف ڈاکٹر خالد محمود سے میری اب تک ایک قدرے تفصیلی اور دو تین مختصر سی ملاقاتیں رہی ہیں۔ ان کی شخصیت میں کوئی تضاد نہیں ہے، وہ دونوں جگہ پیہم پرکشش اور لائق احترام ہیں۔ انہوں نے اردو اور تعلقات دونوں کو ہی بڑی محبتوں سے سنوارا، نکھارا اور سنبھالا ہے۔ وہ ایک بہترین معلم اور مدرس رہے ہیں اور اور ایشیا، امریکہ اور یوروپ کے مختلف ممالک کے اسفار کا تجربہ رکھتے ہیں جس کی خوبصورت جھلک ان کی تحریروں میں نظر آتی ہے۔ یہ وہ تجربے ہیں جو صرف کتابوں کے صفحات پلٹنے سے نہیں حاصل نہیں ہو سکتے۔ بقول ندا فاضلی؎

دھوپ میں نکلو گھٹاؤں میں نہا کر دیکھو　　　زندگی کیا ہے کتابوں کو ہٹا کر دیکھو

پروفیسر خالد محمود کی تحریریں کتاب اور ماورائے کتاب دونوں کے علمی اور عملی تجربوں کی شاہد ہیں۔

اس سے پہلے شگوفہ نے کئی خصوصی نمبر شائع کیے ہیں جن میں یوسف ناظم نمبر، نصرت ظہیر نمبر، پرویز یداللہ مہدی نمبر اور خلیج نمبر وغیرہ شامل ہیں۔ اب شگوفہ نے پروفیسر خالد محمود پر ایک خاص نمبر نکال کر نہ صرف ایک جیتی، جاگتی، مسکراتی اور محبتیں لٹاتی بہترین علمی، ادبی اور سماجی شخصیت کی تخلیقات کو سچی خراج عقیدت پیش کیا ہے بلکہ اردو کی ایک ایسی خدمت انجام دی ہے جس کے لیے وہ شکریے کا مستحق ہے۔ ویسے پروفیسر خالد محمود صاحب کو اب تک جتنا پڑھا، عمدہ پایا، مگر مجھے ان کا یہ شعر خاص طور پر بہت ہی پسند ہے، جو ان کی کتاب شعر زمین میں ہے۔

اسے حیرت ہے میرا حوصلہ اب تک نہیں ٹوٹا
مرے دشمن کے چہرے پر بڑی تشویش طاری ہے

اپنی اشاعت کے 53ویں سال میں مدیر شگوفہ نے پروفیسر خالد محمود جیسے معزز انعام یافتہ شاعر، مصنف، محقق، ادیب، سابق صدر شعبۂ ارو، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور سابق وائس چیرمین، دہلی اردو اکیڈمی پر خاص شمارہ نکال کر ایک عمدہ کام کیا ہے جس کے لیے وہ تہۂ دل سے مبارکباد کے مستحق ہیں۔

■

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ھی کی ایک شکل ھے جس میں کتاب کے مواد ، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ھے۔ کتاب کے ماله وما علیه اور دیگر جزئیا ت کے حوالے سے قارئین کو بهت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ھیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رهی ھے، خاص طور پر قدیم مجلات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بهت ھی مفید تھا۔ بهت سے رسائل اور مبصرین کے تبصرے کتابی صورت میں شائع ھوچکے ھیں جو همارے لیے ایک ماڈل کی حیثیت رکھتے ھیں۔ آج بھی بیشتر رسائل میں تبصرے کا ایک مخصوص کالم ھے مگرهزاروں کتابوں میں سے صرف چند ھی کتابوں پر ھی تبصرے ھوپاتے ھیں۔ بهت سی اهم کتابوں تک تبصرہ نہ ھونے کی وجہ سے قارئین کی رسائی نهیں ھوپاتی۔ مبصرین کو چاھیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیرضروری تمهید سے گریز کرکے کتاب کے اهم اور افادی نکات کی ضرور نشاندھی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، هندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان و ادب سے متعلق جو کتابیں شائع ھوتی ھیں ان پر بھی اگر تبصرے کا سلسلہ شروع کیا جائے تو یہ زیادہ کارآمد اور مفید عمل ثابت ھوگا۔

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

شمس الرحمٰن فاروقی کا انتقال تنقید کے ایک عہد کا خاتمہ ہے: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

قومی اردو کونسل میں شمس الرحمٰن فاروقی کے سانحۂ ارتحال پر تعزیتی میٹنگ

نئی دہلی: شمس الرحمٰن فاروقی اس عہد کے عبقری شخص تھے جنھوں نے تنقید کو ایک اعلیٰ معیار عطا کیا اور جن کی تحریروں نے تنقیدی اور تخلیقی ذہنوں کو مہمیز اور متحرک کیا۔ ترجمہ، تخلیق اور تنقید کے باب میں ان کی جو خدمات ہیں انھیں اردو دنیا کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ ان کا انتقال تنقید کے ایک عہد کا خاتمہ ہے۔ ان خیالات کا اظہار قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے ممتاز ناقد شمس الرحمٰن فاروقی کے سانحہ ارتحال پر قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں منعقدہ تعزیتی میٹنگ میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ بیوروکریٹ ہوتے ہوئے اردو زبان و ادب میں شمس الرحمٰن فاروقی نے جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ قابل رشک ہے۔ انھوں نے صرف اردو زبان کی ثروت میں ہی اضافہ نہیں کیا بلکہ اردو ادبیات کو انگریزی اور دوسرے حلقوں میں بھی متعارف کرایا۔ یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ آئندہ کی نسلیں ان کی تصنیفات سے بطور خاص استفادہ کریں گی۔ سرسوتی سمان یافتہ شمس الرحمٰن فاروقی نے شعر شور انگیز، تفہیم غالب، اردو کا ابتدائی زمانہ، افسانے کی حمایت میں اور کئی چاند تھے سرآسماں جیسی کئی اہم تصنیفات اردو دنیا کو دی ہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ شمس الرحمٰن فاروقی نے 'شب خون' جیسے مجلّے کے ذریعے ایک پوری نسل کی تربیت کی اور جدیدیت جیسا رجحان دیا جس کی تقلید کرنے والے بہت سے تخلیق کار عصری ادبی منظرنامے کا ایک روشن دستخط ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان سے شمس الرحمٰن فاروقی کی وابستگی کے حوالے سے ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ این سی پی یو ایل سے ان کا بہت گہرا رشتہ رہا ہے۔ ترقی اردو بیورو کے ڈائرکٹر اور قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین کی حیثیت سے انھوں نے کونسل کو ایک وژن اور ایک نئی سمت دی ہے۔ قومی اردو کونسل کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر (ایڈمن) جناب کمل سنگھ نے کہا کہ شمس الرحمٰن فاروقی ایک اعلیٰ سوچ رکھنے والے شخص تھے۔ ان کی خاص بات یہ تھی کہ اچھے کام کرنے والوں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ قومی اردو کونسل سے ان کی گہری وابستگی تھی۔ اردو زبان کی ترویج اور قومی اردو کونسل کی توسیع کے لیے ان کے پاس بہت سے اہم مشورے اور تجاویز تھیں جنھیں وہ عملی جامہ پہنانے کے لیے فکرمند رہتے تھے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر کلیم اللہ (ریسرچ آفیسر) نے بھی شمس الرحمٰن فاروقی کے انتقال پر رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایک نابغہ روزگار شخص تھے۔ ان کی باتوں سے علمیت اور عظمت ٹپکتی تھی۔ ان کا مطالعہ وسیع اور نظر عمیق تھی۔ بجا طور پر انھیں استاذ الاساتذہ کہا جاسکتا ہے۔

اس تعزیتی میٹنگ میں قومی اردو کونسل کا عملہ موجود رہا۔ ان کی روح کی تسکین کے لیے دو منٹ کی خاموشی بھی اختیار کی گئی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 29 دسمبر 2020

ہندوستان کی ہمہ جہت ترقی کے لیے سوامی وویکانند کے نظریات پر عمل کرنا ضروری: شیخ عقیل احمد

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان میں یومِ نوجوانان کی مناسبت سے تقریب منعقد

نئی دہلی: سوامی وویکانند ایک وسیع الجہات مفکر اور سماجی مُصلح تھے۔ وہ بھارت کے 'اتیتھی دیو بھوا' اور 'واسودیو کٹمبکم' کے نظریے کو اس ملک کی طاقت سمجھتے تھے، ان کا کہنا تھا کہ اس ملک کی تاریخ رہی ہے کہ یہاں ہر دور میں دنیا کی ہر قوم اور ہر مذہب کا استقبال کیا گیا اور اسے دل سے اپنایا گیا ہے۔ اس ملک کی یہ خصوصیت ہے کہ یہاں رہنے والے ہر مذہب کے لوگ سماجی ہم آہنگی کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں اور اختلافی امور پر باہمی مذاکرہ و ڈائیلاگ میں یقین رکھتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر شیخ عقیل احمد نے سوامی وویکانند کے یومِ پیدائش کے موقعے پر کونسل کے صدر دفتر میں منعقدہ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے بتایا

کہ سوامی وویکانند انسانی اخوت اور بطور انسان ایک دوسرے کی عزت و تعظیم پر زور دیتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ''اگر تم اپنے بھائی کی جو خدا کی قدرت کا مظہر ہے عزت نہیں کروگے تو بھلا تم خدا کی عبادت کیسے کر پاؤگے جو مادی اعتبار سے یکتا اور ہر جلوے سے بے نیاز ہے۔'' سوامی جی کو اس بات کا یقین تھا کہ مستقبل بھارت کا ہے، جس کا اظہار انھوں نے مشی گن یونیورسٹی میں کچھ لوگوں سے مذاکرے کے دوران کیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ ''موجودہ حالات بھلے ہی آپ کے حق میں ہیں لیکن اکیسوی صدی بھارت کی ہوگی۔''

ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا کہ سوامی وویکانند ایسی اخلاقی قدروں سے متصف ہونے پر زور دیتے تھے جو انسانیت نوازی کی نمائندگی کرتی ہیں اور جن کو اختیار کرنے کے بعد ایک انسان دنیا کے ہر انسان کو اپنا بھائی سمجھتا ہے، چاہے وہ کسی بھی دھرم اور مذہب سے تعلق رکھتا ہو۔ سوامی جی نے طبقاتی تفریق اور ذات پات کے نظام کی سختی سے تردید کی۔ انھوں نے کہا کہ ذات پات کا دھرم سے کوئی لینا دینا نہیں ہے، ہر انسان پیدائشی طور پر برابر ہے، کوئی کسی سے اعلی یا ادنی نہیں ہے۔ مذہب یا ذات برادری کی بنیاد پر باہمی کشمکش اور فتنہ وفساد سے انھوں نے سختی سے روکا اور اسے بھارت کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ قرار دیا۔ سوامی جی نے خواتین کی تعلیم اور انھیں با اختیار بنانے پر بھی زور دیا، انھوں نے کہا تھا کہ بھارتی ثقافت میں خواتین کا خاص مقام ہے اور انھیں دیوی مانا جاتا ہے ایسے میں ان کی تعلیم کا نظم کرنا اور انھیں با اختیار بنانا ہماری سماجی اور مذہبی ذمے داری ہے۔ عمومی تعلیم کے سلسلے میں بھی ان کا نظریہ واضح تھا، وہ سماجی و انسانی اخلاقیات سے لیس کرنے والی مذہبی تعلیم کے ساتھ نئی دنیا میں رائج تعلیم کے حصول پر بھی زور دیتے تھے۔ وہ تعلیم کے ماڈرنائزیشن کے خلاف نہیں تھے، البتہ اس کے ویسٹرنائزیشن کو ملک کے حق میں مفید نہیں سمجھتے تھے۔ مرکزی حکومت کے ذریعے تشکیل دی گئی نئی قومی تعلیمی پالیسی سوامی جی کے نظریات کے مطابق ہی مرتب کی گئی ہے اور نئی نسل کو انھی نظریات کے سانچے میں ڈھالنے کا منصوبہ بنایا گیا ہے جو کہ قابل تحسین اور خوش آیند ہے۔

انھوں نے کہا کہ سوامی وویکانند کے عزم اور خواہشات کی تکمیل کا احساس پیدا کرنے کے لیے ہر سال سوامی جی کے یومِ پیدائش 12 جنوری کو نوجوانوں کے قومی دن کے طور پر منایا جاتا ہے۔ اس کا مقصد یہی ہے کہ سوامی جی کے پیغامات کو اپنی عملی زندگی میں اتارا جائے اور ملک کی تعمیر و ترقی میں ضروری کردار ادا کیا جائے۔ سوامی جی کے خوابوں میں جو بھارت بستا تھا، اسے بنانے کی ذمے داری تمام شہریوں کی ہے۔ شیخ عقیل نے کہا کہ سوامی وویکانند کے یومِ پیدائش کے موقعے پر ہم سب انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں اور ساتھ ہی یہ عہد کرتے ہیں کہ روحانی و مادی ہر اعتبار سے ترقی یافتہ، خوشحال، پرامن اور بقائے باہمی کے اصولوں پر یقین رکھنے والا سماج بنانے میں ہم سب اپنا مطلوبہ کردار ادا کریں گے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 12 جنوری 2021

قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام مذہب وثقافت پینل کی آن لائن میٹنگ

نئی دہلی: ہمارا ملک مختلف مذاہب اور ثقافتوں کا گہوارہ ہے۔ یہاں ہر مذہب وکلچر کے فروغ کے بھرپور امکانات موجود ہیں۔ اسی لیے مختلف ثقافتوں اور تہذیبوں کو یہاں فروغ حاصل ہوا۔ اپنے ملک کی اسی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے وزارت تعلیم حکومت ہند کے تحت چلنے والے ادارے 'قومی اردو کونسل' نے کئی برس قبل اپنے یہاں مذہب وثقافت کا پینل قائم کیا جس کے تحت اب تک مذہب، تصوف اور تہذیب وثقافت کے حوالے سے بہت سی کتابیں شائع کی جاچکی ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ ان خیالات کا اظہار قومی کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے قومی کونسل کے زیر اہتمام منعقدہ مذہب وثقافت پینل کی آن لائن میٹنگ میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ قومی کونسل سے اب تک مذہب وثقافت پر مبنی درجنوں کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ کووڈ 19 کے باوجود اس سال بھی کئی اہم کتابوں کی اشاعت عمل میں آئی۔ انھوں نے کہا کہ یہ پینل بلاتفریق مذہب وثقافت کتابیں شائع کرتا ہے اور متنازعہ اور مختلف فیہ مسائل اور چیزوں کی اشاعت سے گریز کرتا ہے۔ تاکہ تمام مذاہب اور ثقافتوں کے حامل افراد کے درمیان ایک دوسرے کے لیے محبت واخوت کا جذبہ پیدا ہو۔

پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ قومی کونسل اردو کا سرگرم ادارہ ہے اور یہ نہ صرف اردو زبان کے فروغ کے لیے کام کررہا ہے بلکہ عربی وفارسی جیسی زبانوں کے ساتھ مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کے لیے بھی کام کررہا ہے۔ یہاں کام کی رفتار بہت تیز ہے۔ کووڈ 19 کے سبب جب کہ ہر جگہ مہینوں تک ہر طرح کی سرگرمیاں ٹھپ رہیں، یہ ادارہ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کی سربراہی میں کام کرتا رہا اور اس نے اپنی رفتار میں کوئی کمی نہ آنے دی۔ یہی وجہ ہے کہ اس اثنا میں بھی آن لائن میٹنگوں، ویبناروں اور کانفرنسوں کا سلسلہ جاری رہا۔ آج کی میٹنگ کا انعقاد اس کا واضح ثبوت ہے۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کشادہ ذہن رکھتے ہیں اور سب کو مواقع دیتے ہیں۔ ان کے اس حسن سلوک کی وجہ سے قومی کونسل سے جڑنے والوں کی تعداد میں دن بہ دن اضافہ ہوتا جارہا ہے اور کونسل کی اسکیموں کا دائرہ بھی روزافزوں پھیل رہا ہے۔ مولانا قطب الدین رضوی نے کہا کہ ہمیں امید ہے کہ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کی سرپرستی میں نہ صرف کونسل کو تقویت حاصل ہوگی بلکہ اردو کے فروغ کا دائرہ بھی وسیع ہوگا۔ مولانا مجتبیٰ کوکب نے کہا کہ میٹنگ میں جن کتابوں کی اشاعت کی منظوری دی گئی اور جو تجاویز سامنے آئیں، وہ سب اہمیت کی حامل ہیں۔ اقبال انصاری نے کہا کہ یہ بہت مفید اور عمدہ پینل ہے اس کے بہت سے فوائد سامنے آرہے ہیں اور اس کے تحت عمدہ کتابوں کی اشاعت ہورہی ہے۔ آخر میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) شمع کوثر یزدانی نے مہمانان اور شرکائے میٹنگ کا شکریہ ادا کیا۔ میٹنگ میں جن حضرات نے شرکت کی ان میں پروفیسر زینت شوکت علی، پروفیسر سید شاہ حسین احمد، ڈاکٹر مشتاق احمد تجاروی کے علاوہ ڈاکٹر فیروز عالم (اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر)، محترمہ آبگینہ عارف، محمد افروز اور یوسف رامپوری بھی شریک رہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 1 جنوری 2021

قومی اردو کونسل میں ڈاکٹر یوسف رامپوری کی کتاب کی رسم رونمائی

نئی دہلی: 'قصیدہ' شاعری کی مایۂ ناز صنف ہے۔ اس کی ابتدا عربی سے ہوئی، پھر فارسی سے منتقل ہوکر یہ صنف اردو میں آئی۔ علوئے مضامین، شوکت الفاظ، رفعت تخیل اور نزاکت کے سبب جس طرح اس صنف پر طبع آزمائی کرنا آسان نہیں ہے، اسی طرح قصیدے پر تنقید لکھنا بھی جوکھم اور چیلنج بھرا کام ہے۔ اس کے لیے جہاں قصیدے کے فن سے واقفیت ضروری ہے، وہیں لسانیات کا گہرا علم بھی ناگزیر ہے۔ ڈاکٹر یوسف رامپوری نے 'اردو اور عربی کے اہم قصیدہ گوشعرا' کے عنوان سے جو کتاب تصنیف کی وہ نہایت وقیع ہے اور تحقیق کے باب میں مثالی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں انھوں نے تقابلی تنقید کا ایک عمدہ نمونہ پیش کیا ہے۔ ان خیالات کا اظہار قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کونسل کے صدر دفتر میں منعقدہ رسم اجرا کی تقریب میں کیا۔

انھوں نے کہا کہ یہ کتاب عہد حاضر میں اس لیے اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں اردو اور عربی کی قصیدہ گوئی کا تقابلی وتنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اور دونوں زبانوں کے ممتاز شعرا کے قصائد سے بحث کی گئی ہے۔ کتاب پر ایک نگاہ ڈالنے سے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ مصنف کی نگاہ عربی اور اردو دونوں زبانوں کی قصیدہ گوئی پر بہت گہری ہے اور انھیں دونوں زبانوں کی تاریخ وادب کی گہری معلومات کے ساتھ دونوں زبانوں پر عبور بھی حاصل ہے۔

اس موقعے پر حقانی القاسمی نے کہا کہ اردو زبان میں قصیدے کے تعلق سے یہ اپنی نوعیت کا بہت ہی اہم تقابلی مطالعہ ہے۔ اس میں عربی اور اردو دونوں زبانوں کے قصائد کا مربوط اور مرکوز جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ عربی اور اردو قصائد کے کینن، اشتراکات، افتراقات، موضوعاتی اور ہیئتی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ عربی اور اردو قصائد کے جملہ مباحث کو بہت ہی عمدگی سے سمیٹا گیا ہے اور زبان وبیان میں جامعیت اور معروضیت کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عبدالرشید اعظمی نے یوسف رامپوری کی تحقیقی و تنقیدی کتاب کی اہمیت ومعنویت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ فی زمانہ قصائد کو پڑھنا اور سمجھنا بھی مشکل ہوگیا ہے مگر یوسف رامپوری نے ژرف نگاہی سے عربی اور اردو دونوں زبانوں کے قصائد پر کام کیا ہے اس لیے یہ کتاب علمی اور ادبی حلقوں میں یقیناً قبولیت کی نظر سے دیکھی جائے گی۔ کتاب کے ناشر مولوی فیروز اختر قاسمی نے بھی اس موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ یوسف رامپوری کی نصف سے زائد کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہوچکی ہیں اور بہت سے تحقیقی وتنقیدی مضامین موقر رسائل وجرائد میں شائع ہوچکے ہیں۔ یہ کتاب یوسف رامپوری کی مطالعاتی وسعت اور محنت وریاضت کی عمدہ مثال ہے۔ صاحب کتاب یوسف رامپوری نے تمام سامعین اور مہمانان کا شکریہ ادا کیا اور کتاب کے تعلق سے تعارفی کلمات پیش کیے۔ محترمہ آبگینہ عارف نے پروگرام کی نظامت کے فرائض انجام دیے۔ رسم اجرا کی اس تقریب میں قومی اردو کونسل کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر (ایڈمن) جناب کمل سنگھ، ڈاکٹر کلیم اللہ (ریسرچ آفیسر)، ڈاکٹر فیروز عالم (اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر)، ڈاکٹر وسیم اقبال، ڈاکٹر نوشاد منظر، ڈاکٹر مسرت، مشہود عالم، محمد اکرام، محمد فہیم وغیرہ نے شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 30 دسمبر 2021

قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے

دبستان دیوبند کی ادبی وصحافتی خدمات

دیوبند: اسلامیہ ایجوکیشن اینڈ چیریٹیبل سوسائٹی کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (این سی پی یو ایل) کے اشتراک سے اسلامیہ ڈگری کالج میں 2 روزہ سمینار کا انعقاد 'دبستان دیوبند کی ادبی وصحافتی خدمات' کے عنوان پر کیا گیا جس میں دانشوران اور ادیبوں نے اردو زبان و ادب میں سرزمین دیوبند کی خدمات پر روشنی ڈالی۔ اپنے صدارتی خطاب میں انٹرفیتھ ہارمنی فاؤنڈیشن آف انڈیا کے چیئرمین ڈاکٹر خواجہ افتخار احمد نے دیوبند کی ادبی وصحافتی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ سرزمین دیوبند کا اردو زبان کے فروغ میں بنیادی کردار ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس شیریں زبان کو سرحد اور مذہب کی زنجیروں میں قید نہیں کیا جاسکتا ہے بلکہ اس کے شیدائی پوری دنیا میں ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ملک کی آزادی اور اس کی تعمیر وترقی میں اردو زبان اور اردو صحافت کا گرانقدر رول ہے، جسے بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ دوران نظامت پروفیسر تنویر چشتی نے اردو صحافت اور دیوبند کی اردو زبان کی خدمات پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ دیوبند ایسی سرزمین ہے جہاں کی ہواؤں میں بھی اردو بستی ہے۔ انھوں نے کہا کہ دیوبند نے نہ صرف اردو زبان کی ترویج وترقی میں اہم رول ادا کیا ہے بلکہ یہاں کی اردو صحافت کی خدمات بھی آب زر سے لکھنے کے لائق ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہاں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری علوم کا بھی بڑا نیٹ ورک ہے۔ انھوں نے اسلامیہ ڈگری کالج کی خدمات کی ستائش کرتے ہوئے کالج کے بانی مرحوم اکرام الحق کو خراج عقیدت پیش کیا اور کہا کہ گرلز ایجوکیشن کو پرموٹ کرنے لیے ان کا یہ قدم قابل ستائش ہے۔ اس دوران مقامی اردو صحافیوں کی خدمات کے اعتراف میں انھیں اعزاز سے نوازا گیا۔ سمینار کے دوران اسکالرز نے اپنے مقالے پیش کیے، جن میں خاص طور پر دیوبند کی اردو اور صحافتی خدمات کو بیان کیا گیا ہے۔ مقالے پیش کرنے والوں میں پروفیسر ارتضیٰ کریم، پروفیسر عبیدالرحمٰن ہاشمی، پروفیسر ارشد غازی، پروفیسر ایم معزالدین، مولانا شاہ عالم، ڈاکٹر اسجد ترکی، سید وجاہت شاہ، ڈاکٹر چاندنی عباسی، پروفیسر لاکھن شرما، عبدالرحمٰن سیف وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 21 دسمبر 2020

قومی کونسل کے سینٹر میں جلسہ تقسیم اسناد

فیروز آباد: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر نگرانی چلنے والے یک سالہ اردو ڈپلومہ اور عربک ڈپلومہ کورس کے سرٹیفکیٹ تقسیم انعامات پروگرام ابوہریرہ ہائی اسکول فیروز آباد میں منعقد ہوا جس میں مہمان خصوصی کے طور پر ڈاکٹر نسرین بیگم علیگ پروفیسر اردو بانکونشی دیوی گرلز کالج آگرہ اور مہمان ذیشان کے طور پر کلپنا راجوریہ برانڈ ایمبیسڈر سویپ اور محترمہ عرش لیکچرار سربلال کانونٹ سینئر سیکنڈری اسکول نے شرکت کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر نسرین بیگم نے کہا کہ اردو اور عربی زبان کے فروغ کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان بہتر کام کر رہا ہے، انھوں نے تمام طالبات سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ آپ کی انفرادی شخصیت میں زبان کا بڑا ہی اہم کردار ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان لوگوں کے دلوں کو جوڑنے والی زبان ہے۔ مجھے اس کالج میں آکر بڑی خوشی ہوئی کہ طالبات میں اردو عربی زبان سیکھنے کو لے کر سنجیدگی ہے۔ میں کالج کے مینیجر اور پرنسپل کو مبارکباد دیتی ہوں کہ اس موقعے پر محترمہ کلپنا راجوریہ نے کہا کہ آج کے زمانے میں طالبات کو اپنے آپ کو نکھارنا چاہیے۔ انھوں نے بیٹی پڑھاؤ بیٹی بچاؤ والے فارمولے کا بھی ذکر کیا۔ اس موقعے پر ڈائرکٹر ابوہریرہ ہائی اسکول مدینہ کالونی عالم مصطفیٰ یعقوبی نے کہا کہ زبانیں سماج کو جوڑنے اور پیار ومحبت کا پیغام دیتی ہیں۔ اس موقعے پر اردو اور عربی ڈپلومہ میں کامیاب ہونے والی طالبات کو مومنٹو اور کراؤن پہنا کر حوصلہ افزائی کی گئی، اردو ڈپلومہ میں فرسٹ مقام ام ادب نے حاصل کیا، دوسرے مقام پر رہی ندرانہ اور تیسرے مقام پر علیشا صغیر، عربی ڈپلومہ میں پہلے مقام پر عمرہ دوسرے مقام پر گل صبا، تیسرے مقام پر ناظرہ رہیں۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 29 دسمبر 2020

جن کتابوں نے متاثر کیا

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا نیا سلسلہ

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت و معنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبان علم و ہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔
صاحبان ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی و معروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

قومی

مہرشی اروند پر ڈاکٹر نشنک کی کتاب کی پہلی کاپی صدر جمہوریہ کو پیش

نئی دھلی: مرکزی وزیر تعلیم ڈاکٹر رمیش پوکھریال 'نشنک' نے ہندوستانی ثقافت، اقدار اور سناتن دھرم کے تئیں پوری طرح وقف مہرشی اروند کی زندگی، یادوں، ان کے افکار، مکمل یوگا اور زندگی کی جدوجہد کے بارے میں مہرشی اروند- مانوتا کے پرنوت، نامی ایک کتاب لکھی ہے، جس کی پہلی کاپی انھوں نے صدر رام ناتھ کووند کو پیش کی۔ اس کتاب میں مہرشی اروند کی

زندگی کا سفر، ان کی سوچ، مکمل یوگا اور زندگی کی جدوجہد کو ایک جگہ آسان زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ شری اروند مکمل طور پر ہندوستانی ثقافت، اقدار اور سناتن دھرم سے سرشار تھے۔ وہ ہندوستان کی انوکھی صلاحیت کو پہچانتے تھے اور ہر ملک کے شہری کو اس سے آگاہ کرنا چاہتے تھے۔ مرکزی وزیر نے کتاب میں یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح مہرشی اروند نے ہندوستان کو روحانی طور پر متحد کرنے اور ہندوستانی علمی روایت کے جھنڈے کو پھیلانے کے لیے ویدوں اور اپنشدوں کا سہارا لیا تاکہ ہندوستانی اپنے علم پر فخر محسوس کریں۔ اس کتاب میں ان کی زندگی سے متعلق اہم، متاثر کن اور دلچسپ مواد موجود ہے، جو تمام قارئین کی زندگی میں ایک نئے بدلاؤ کا احساس دلائے گا۔ انھوں نے کتاب لکھنے کے دوران اروند آشرم سے وابستہ متعدد ریسرچروں کی مدد لی ہے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 8 دسمبر 2020

دھلی

خودنوشت سوانحی ادب پر جے این یو میں دو روزہ ویبینار

نئی دھلی: مرکز برائے مطالعات عربی و افریقی جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی میں 5 اور 6 دسمبر کو خودنوشت سوانحی ادب کے موضوع پر دو روزہ ویبینار کا انعقاد کیا گیا۔ اکادمی آف ایکسیلنس کیرالہ کے اشتراک سے منعقد ہوئے اس ویبینار میں ہندوستان کے علاوہ بڑی تعداد میں مصر، مراکش، سعودی عربیہ، عراق اور کویت وغیرہ کے ممتاز اسکالروں، پروفیسروں اور ادیبوں نے شرکت کی۔

یہ ویبینار افتتاحی اور اختتامی جلسے کے علاوہ 9 نشستوں پر مشتمل تھا جس میں تقریبا 51 مقالے پیش کیے گئے۔ جے این یو کے وائس چانسلر پروفیسر ایم جگدیش کمار نے اپنے افتتاحی کلمات میں کہا کہ خودنوشت سوانحی ادب ایک اہم ادبی صنف ہے جس کا مطالعہ انسان کی آنکھیں کھولتا ہے اور اس کو سیلف سینٹرڈ (خودمرکوز) زندگی کے دائرے سے باہر نکالتا ہے۔ اسکول آف لینگویج کے ڈین پروفیسر عین الحسن نے افتتاحی جلسہ سے اپنے خطاب میں کہا کہ خودنوشت ادب انسان کو آگے بڑھنے کا رستہ دکھاتا ہے اور اس کے لیے راہ ہموار کرتا ہے۔ عبدالمالک السعدی یونیورسٹی مراکش سے مہمان خصوصی ڈاکٹر رشید کہوس نے افتتاحی جلسے میں اپنے کلیدی خطبے میں عربی میں خودنوشت سوانحی ادب کی تاریخ پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ آپ بیتی انسان کے ذاتی تجربہ کا خلاصہ ہوتا ہے جو اس کے بچپن سے خودنوشت لکھے جانے تک کے عرصہ پر محیط ہوتا ہے، جب کہ سوانح حیات تاریخی دستاویزات پر مبنی دیگر اشخاص کی پیدائش سے موت تک کے حوادث پر محیط ہوتی ہے۔ مرکز افریقی و عربی مطالعات کے سابق چیئر پرسن پروفیسر مجیب الرحمٰن نے ڈاکٹر رشید کہوس کے مقالے کا خلاصہ انگریزی میں پیش کرنے کے بعد کلمات تشکر پیش کیے۔ ویبینار کے کنوینر ڈاکٹر عبیدالرحمٰن نے آغاز میں ویبینار کی غرض وغایت اور اہمیت پر روشنی ڈالی اور پروفیسر رضوان الرحمٰن نے استقبالیہ کلمات پیش کیے۔ افتتاحی جلسہ کے بعد 9 اکیڈمک نشستوں کا انعقاد کیا گیا جن میں مقالہ نگاروں نے عربی، اردو، ہندی، انگریزی اور کشمیری زبانوں میں موجود خودنوشت سوانحی ادب کا جائزہ لیا اور عربی کے ساتھ ان کا موازنہ بھی پیش کیا۔ ویبینار کے کنوینر ڈاکٹر عبیدالرحمٰن طیب نے اخیر میں تمام مقالہ نگاروں اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ اس دو روزہ بین الاقوامی ویبینار کو ڈاکٹر سندیشہ راپا، ڈاکٹر سونو سیجی، ڈاکٹر صابر نواس اور ڈاکٹر محمد اجمل نے کوآرڈینیٹ کیا اور مرکز کے کچھ اسکالروں نے رضاکار کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 7 دسمبر 2020

فارسی نظم ونثر کی کتابوں کی رونمائی

نئی دھلی: ہندوستان میں جمہوریہ اسلامی ایران کے سفیر جناب ڈاکٹر علی چگینی نے فارسی کے ریسرچ ہفتہ کے موقع پر ہندوستان کو امن پسند ملک بتاتے ہوئے کہا کہ ہندوستان میں کثرت میں وحدت کا بے مثال تصور فارسی زبان وادب کی دین ہے۔ وہ ایران کلچر ہاؤس میں تحقیقی ہفتہ کے موقعے پر فارسی نظم ونثر کی کتابوں کی رونمائی تقریب سے خطاب کر رہے تھے۔ انھوں نے امن ویکجہتی کا پیغام دیتے ہوئے کہا کہ فارسی زبان دنیا کے لیے سرمایہ ہے، جہاں ایک طرف عشق ومحبت، انسانیت، اخوت، اخلاقیات اور انسانی حقوق کی پاسداری کی زبان ہے وہیں دوسری طرف وہ ظلم

و نابرابری اور جنگ وجدل کے خلاف مسلح ادب بھی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ میں نے اپنے مطالعہ میں پایا ہے کہ ہندوستانی لوگ امن وشانتی میں یقین رکھتے ہیں۔ ہند اور ایران مشترکہ تہذیب رکھتے ہیں اور دونوں کے درمیان صدیوں پرانے تہذیبی اور لسانی رشتے ہیں۔ اس موقعے پر ایران کلچر ہاؤس میں تقریبا 20 فارسی کتابوں کی رونمائی عمل میں آئی اور فارسی اساتذہ پروفیسر شریف حسین قاسمی، پروفیسر چندر شیکھر، پروفیسر آذرمی دخت، اور پروفیسر ریحانہ خاتون کو اعزازی رکن منتخب کر کے ان کو سفیر ایران ڈاکٹر علی چگینی کے دست مبارک سے اعزازی سند سے نوازا گیا۔ انھوں نے منتخب شدہ افراد کو مبارکباد پیش کی۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 10 دسمبر 2020

عہد کورونا میں اردو ادب (تخلیقات، تصانیف اور سرگرمیاں)

نئی دهلی: ورلڈ اردو ایسوی ایشن، نئی دہلی کی جانب سے دو روزہ عالمی سمینار اور مشاعرے کا انعقاد بعنوان 'عہد کورونا میں اردو ادب، تخلیقات، تصانیف اور سرگرمیاں' پر کیا گیا۔ 19 اور 20 دسمبر 2020 کی شام ورلڈ اردو ایسوی ایشن کی طرف سے آن لائن سمینار کا انعقاد کیا گیا، جس میں سپریم کورٹ آف انڈیا کے مشہور ومعروف وکیل خلیل الرحمان نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ صدور کی حیثیت سے پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین اور نصر ملک نے شرکت کی۔ مہمان اعزازی کی حیثیت سے ڈاکٹر اطہر فاروقی، پروفیسر عبدالرب استاد، ڈاکٹر عارف کسانہ، ڈاکٹر توحید خان، ایلدوست ابراہیموف، آذربائیجان اور اشفاق عمر پونے نے شرکت کی۔ ملکی اور غیر ملکی مقالہ نگاروں میں پروفیسر ثروت خان، پروفیسر محمد افضال بٹ، ڈاکٹر شگفتہ فردوس، ڈاکٹر یاسمین کوثر، ڈاکٹر طیب خرادی، ڈاکٹر فریدہ تبسم، ڈاکٹر زہرہ جبیں، ڈاکٹر ارم صبا، ڈاکٹر جمشید احمد، سیدہ ہما شہزادی، شاہ تاج خان وغیرہ نے کورونا عہد میں اردو ادب کی خدمات پر گراں قدر مباحث پیش کرتے ہوئے کہا کہ عہد کورونا نے جہاں دنیا کو ایک جگہ منجمد کر دیا، وہیں اردو ادب کے سرمائے میں قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔ کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے خلیل الرحمان نے کہا کہ کورونا وائرس نے انسانی زندگی کی حقیقت کو طشت ازبام کر دیا۔ ادبا وشعرا نے اس عہد سے نبرد آزما ہوتے ہوئے ادبی سرمائے میں وقیع اضافہ کیا ہے۔ ورلڈ اردو ایسوی ایشن نے بھی اس سمت میں کافی اہم کام کیا جس کی پذیرائی ہماری ادبی دیانت داری کا حصہ ہے۔ صدارتی خطاب میں پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ آپ سب نے بہت کم وقت میں اردو تخلیقات، تصنیفات اور ادبی سرگرمیوں پر بہت جامع مقالات تحریر کیے۔ نصر ملک صاحب نے بھی تمام مقالات پر اظہار خیال پیش کرتے ہوئے کہا کہ آپ سب نے ایک جدت برتتے ہوئے نئے عنوان پر مقالے لکھ کر ایک نمونہ پیش کیا ہے۔ اس عالمی سمینار کی نظامت ریشا قمر قمر النسا نے کی جبکہ اظہار تشکر ڈاکٹر محمد رکن الدین نے ادا کیا۔

روزنامہ 'میرا وطن'، 24 دسمبر 2020

عربی زبان کے فروغ میں دہلی کی یونیورسٹیوں کا کردار

نئی دهلی: اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا، دہلی کا یہ طرۂ امتیاز رہا ہے کہ وہ مدارس اور یونیورسٹیوں کے فارغین کو مختلف موضوعات پر بحث وتحقیق کے لیے پلیٹ فارم فراہم کرتی رہی ہے۔ ان خیالات کا اظہار اسلامک فقہ اکیڈمی کے جنرل سکریٹری مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے 'عربی زبان کے فروغ میں دہلی کی یونیورسٹیوں کا کردار' کے موضوع پر اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا دہلی کے سمینار ہال میں منعقدہ دو روزہ قومی سمینار کی افتتاحی تقریب میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ عربی زبان جہاں مصادر شریعت کی زبان ہے، وہیں اس زبان نے ملک کی معیشت کی رفتار کو بھی بڑھایا ہے۔ سمینار کے موضوع کا تعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر صفدر زبیر ندوی نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ افتتاحی نشست کی صدارت انڈیا عرب کلچرل سینٹر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ڈائرکٹر پروفیسر ایوب تاج الدین ندوی نے کی، انھوں نے کہا کہ اکیڈمی کے ساتھ میرے دیرینہ تعلقات ہیں، خاص طور پر اکیڈمی کے سابق سکریٹری مولانا امین عثمانی مرحوم کو یاد کرتے ہوئے کہا کہ اگرچہ وہ موجود نہیں ہیں لیکن ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ وہ پردے کے پیچھے ہم کو سن رہے ہیں۔ نظامت سمینار کے کنوینر ڈاکٹر مجیب اختر استاذ شعبۂ عربی ڈی یو نے کی جبکہ بحیثیت مہمانان خصوصی پروفیسر رضوان الرحمٰن، پروفیسر عبدالماجد قاضی اور ڈاکٹر نعیم الحسن اثری نے عربی زبان کی ترویج واشاعت میں دہلی کی یونیورسٹیوں کے کردار پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ کلمات تشکر مفتی امتیاز احمد قاسمی نے پیش کیے۔ بعد ازاں اکیڈمک نشستوں کا آغاز ہوا، ہر ایک نشست میں 8-8 مقالات پڑھے گئے۔ پہلی نشست کی صدارت ڈاکٹر نسیم اختر ندوی نے اور نظامت ڈاکٹر اصغر محمود نے کی۔ دوسری نشست کی صدارت ڈاکٹر محمد اکرم نے جبکہ نظامت ڈاکٹر محمد قاسم عادل نے کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 27 دسمبر 2020

اتر پردیش

اردو ادب پر تصوف کے اثرات

فیروزآباد: اشرف سوشل ویلفیئر سوسائٹی کے زیراہتمام اردو اکادمی اتر پردیش کے مالی تعاون سے آل انڈیا سمینار بعنوان 'اردو ادب پر تصوف کے اثرات' کے موضوع پر حبیبیہ ہال کشمیری گیٹ پر آل انڈیا سمینار کا انعقاد کیا گیا، جس میں اردو ادب پر تصوف کے اثرات کے موضوع پر اسکالرز نے اپنے مقالات پیش کیے۔ پروگرام کو دو سیشنز میں چلایا گیا۔ پہلے سیشن کی صدارت ڈاکٹر ظفر عالم نے اور دوسرے سیشن کی صدارت مولانا تنویر القادری رامپوری نے کی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے آل انڈیا مائنارٹی اسکول ایسوی ایشن کے صدر عظیم الدین ایڈوکیٹ نے موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ ہندوستان میں صوفی سنتوں اور بزرگوں نے مذہب کا پرچار پرسار یعنی تشہیر اردو زبان میں کی، چاہے وہ گرونانک ہوں، یا خواجہ غریب نواز، گیسو دراز ہوں یا سید مخدوم اشرف سمنانی ان تمام بزرگوں نے اردو زبان کا ہی سہارا لیا، اسی لیے اردو پر تصوف کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ پہلے سیشن میں ڈاکٹر صادق علی، نورالاسلام، محمد وسیم علیگ، حافظ رفیع الدین، ظفرالدین اور زاہد حسین نے اپنے مقالے پیش کیے اور دوسرے سیشن میں مولانا صادق رضا، مولانا جابر رضا، قادری عادل، ثاقب قادری برکاتی اور محمد ارشد خان رضوی نے اپنے مقالے پیش کیے۔ اظہار تشکر حاجی رئیس نے کیا۔ پروگرام کے آخر میں کنوینر محمد ارشد خان رضوی نے بھی حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'میرا وطن'، دہلی، 22 دسمبر 2012

بیکل اتساہی: فکروفن

علی گڑھ: ہلال ہاؤس نگلہ ملاح سول لائنس علی گڑھ میں انجمن محبان اردو علی گڑھ کے زیراہتمام ایک مذاکرہ

بعنوان 'بیکل اتساہی فکروفن' کا انعقاد عمل میں آیا جس میں مختلف انجمنوں اور اداروں کے اراکین اور ادبا وشعرا نے بیکل اتساہی کے فکروفن پر سیر حاصل گفتگو کی۔ پروگرام

کے مقاصد بیان کرتے ہوئے پروگرام کے کنوینر اور انجمن محبان اردو علی گڑھ کے سکریٹری محمد عادل فراز نے کہا کہ ہندوستان کی سرزمین پر چند ایسے شعرا گزرے ہیں جنھوں نے اپنی شاعری میں ہندوستانی تہذیب و تمدن اور اسلامی اقدار کی ترویج کو الفاظ کا جامہ پہنا کر قارئین کے سامنے پیش کیا۔ ان میں بیکل اتساہی کا نام سرفہرست ہے۔ ان کا کلام نہ صرف ہندوستانی تہذیب کی مثال پیش کرتا ہے بلکہ اسلامی قوانین اور اسلامی اقدار کی بھی مثال پیش کرنے میں پیش پیش نظر آتا ہے۔ بیکل اتساہی کا کمال سخن یہ ہے کہ اس میں سادگی و سلاست کے ساتھ نہایت گہری بات اور اچھوتے مضامین بیان کیے گئے ہیں۔ ان کو شاعری کی مختلف اصناف پر مکمل عبور حاصل تھا جس میں نعت، غزل اور گیت کی مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہلال ہاؤس میں آج کا پروگرام نہ صرف ان کے لیے خراج تحسین ہے بلکہ وہ نئی نسل کو اس بات پر بھی آمادہ کرے گا کہ بیکل اتساہی کے کلام کا مطالعہ باقاعدہ کیا جائے۔ اس موقعے پر علامہ قیصر اکادمی کے بانی و صدر ڈاکٹر رضی امروہوی نے کہا کہ بیکل اتساہی گنگا جمنی تہذیب کے نمائندہ شاعر تھے۔ انھوں نے نہ صرف غزل میں طبع آزمائی کی بلکہ دوہے اور گیت میں بھی ان کا ایک مختصر لہجہ اور مقام ہے۔ ان کی شاعری میں ہندی الفاظ کے ساتھ ساتھ عربی و فارسی الفاظ کی آمیزش ایک نیا لطف اور ایک نئی جاذبیت کا احساس کراتی ہے۔

روزنامہ 'سچ کی آواز' دہلی، 5 دسمبر 2020

بہار

اردو ڈائرکٹوریٹ کے زیر اہتمام رضا نقوی واہی یادگاری ویبینار

پٹنہ: محکمہ کابینہ سکریٹریٹ کے تحت اردو ڈائرکٹوریٹ کے زیر اہتمام ایک آن لائن پروگرام 'رضا نقوی واہی یادگاری ویبینار' کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت معروف افسانہ نگار مشتاق احمد نوری نے کی۔ اس ویبینار میں پروفیسر مولا بخش، ڈاکٹر ہمایوں اشرف، ڈاکٹر محسن رضا رضوی بحیثیت مقالہ خواں شریک ہوئے۔ مشتاق احمد نوری نے اپنی صدارتی تقریر میں رضا نقوی واہی کی شاعرانہ خوبیوں پر خاطر خواہ روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ واہی نے سماج کو آئینہ دکھانے کا کام کیا اور اس کی ناہمواریوں اور کجرویوں کو دور کرنے کے لیے اپنی شاعری کو ذریعہ اظہار بنایا۔ پروفیسر مولا بخش نے رضا نقوی واہی کے پہلے شعری مجموعہ 'واہیات' پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ اپنے عہد میں طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کا ایک دبستان تھے۔ واہی نے اپنی شاعری میں ترغیبات سے اجتناب کرتے ہوئے بڑے سنجیدہ متون کی تحریف (پیروڈی) کی بڑی عمدہ مثالیں پیش کی ہیں۔ ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ واہی مزاح برائے مزاح کے قائل نہیں۔ وہ ایک باشعور فنکار تھے۔ وہ اپنی نظموں کی بنیاد تصور پرستی پر قائم موضوعات کی بجائے اپنے تجربات کے آئینے میں نظر آنے والی تلخ سچائیوں پر رکھنا پسند کرتے ہیں۔ ویبینار سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر محسن رضا رضوی نے بتایا کہ انفرادیت کے سبب واہی کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کو بڑی آسانی کے ساتھ دوسرے تمام شعرا سے الگ کیا جاسکتا ہے۔ پروگرام کے آغاز میں اردو ڈائرکٹوریٹ کے ڈائرکٹر احمد محمود نے رضا نقوی واہی ویبینار میں تمام شرکا اور ویبینار سے جڑے سبھی ناظرین کا خیر مقدم کیا۔ رضا نقوی واہی کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ سرکاری ملازمت میں رہتے ہوئے بھی انھوں نے جس اعلیٰ پایہ کی شاعری کی، وہ ان کی شاعرانہ عظمت اور خداداد صلاحیت کی دلیل ہے۔ جناب محمود نے کہا کہ واہی صاحب اردو ادب کا ایک قیمتی سرمایہ ہیں جس کا تحفظ کیا جانا ضروری ہے۔ پروگرام کی ابتدا محمد اسلم جاوداں کے ابتدائی کلمات سے ہوئی۔ انھوں نے رضا نقوی واہی یادگاری ویبینار کا مختصر تعارف کراتے ہوئے کہا کہ وہ اپنے دور کے عبقری شاعر تھے۔ بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ اپنی فنی پیش کش، شعری معیار، عصری آگہی اور موضوع کی وسعت کے اعتبار سے اکبر الہ آبادی کے بعد رضا نقوی واہی کا نام پورے اعتماد کے ساتھ لیا جاسکتا ہے۔

روزنامہ 'قومی تنظیم'، پٹنہ 31 دسمبر 2020

مہاراشٹر

غالب پر آن لائن مذاکرہ

ممبئی: اردو کے عظیم شاعر مرزا غالب کے یوم پیدائش پر کل شب دیر گئے ممبئی میں پاسبان ادب کے زیر اہتمام

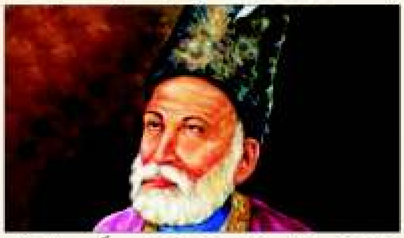

منعقدہ آن لائن مذاکرہ پر ایک خصوصی پروگرام میں شرکا نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ غالب پر خود اردو شاعری کو ناز ہے، غالب کی عظمت کا راز یہ ہے کہ اس مقام پر نظر آتے ہیں جہاں عام زبان میں گفتگو کرنا محال ہے۔ اس پروگرام میں شاعر و صحافی شمیم طارق نے غالب کی حیات و شخصیت اور شاعری کے حوالے سے اپنے خطاب میں کہا کہ غالب کو خود بھی اپنی حقیقت کا احساس تھا اور انھوں نے اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ اس خصوصی مجلس کا انعقاد 'پاسبان ادب' نے کیا تھا جس کے سربراہ قیصر خالد آئی پی ایس ہیں۔ قیصر خالد نے اس موقعے پر کہا کہ غالب میں ان لوگوں کی دلچسپی بھی بڑھ رہی ہے جو اردو نہیں جانتے۔ اس پروگرام کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ غالب کو اردو نہ جاننے والے طبقے میں بھی متعارف کرایا جائے۔

قیصر خالد نے کہا کہ شمالی ہند میں اور دلی کے آس پاس کے علاقوں میں بات چیت کے دوران غالب کے اشعار عام طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔ غالب کی شاعری عام آدمی سے وابستہ ہے۔ اس موقعے پر شمیم طارق نے اپنی طویل گفتگو کو چار حصوں میں تقسیم کیا، انھوں نے پہلے یہ بتایا کہ اردو کے اہم ناقدین نے غالب کے بارے میں کیا لکھا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے عبدالرحمٰن بجنوری، یاس یگانہ چنگیزی، آل احمد سرور، ظ انصاری اور پروفیسر گوپی چند نارنگ کی کتابوں کے اقتباسات پڑھ کر سنائے اور بتایا کہ یاس یگانہ نے غالب کو رد کرنے کی کوشش کی مگر وہ خود کو رد کر بیٹھے۔ انھوں نے علامہ اقبال کی ایک نظم 'مرزا غالب' کا تجزیہ پیش کیا اور کہا کہ غالب کو اس سے بہتر خراج عقیدت نہیں پیش کیا جاسکتا۔ انھوں نے کہا کہ غالب کا امتیاز ان کے نادر خیالات اچھوتے پیرایہ اظہار سے قائم ہوتا ہے۔ جب کہ غالب اپنے خیالات کی ندرت اور وسعت کی وجہ سے بھی ہندوستانی ہے اور پیرایہ اظہار کے سبب بھی۔ غالب کو ہندوستانیت نے اور یہاں کے فکر و فلسفہ نے فائدہ پہنچایا ہے کیونکہ منفی بات کہہ کر مثبت مفہوم نکالنا ہندوستانیت کی روح ہے۔ یہ روح غالب کی شاعری میں پوری طرح جلوہ گر ہوئی ہے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 29 دسمبر 2020

مدھیہ پردیش

پی ایچ ڈی کی ڈگری موصول ہونے پر بشیر بدر کا اظہار مسرت

بھوپال: اردو کے مشہور شاعر پدم شری ڈاکٹر بشیر بدر،

جوان دنوں بھوپال، مدھیہ پردیش میں رہتے ہیں، نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے 1973 میں پی ایچ ڈی مکمل کی تھی۔ وہ اور ان کے اہل خانہ پی ایچ ڈی کی ڈگری کو حاصل کرنے کے لیے بڑے پر جوش تھے۔ یونیورسٹی کی جانب سے انھیں ڈگری مہیا کرادی گئی ہے۔ ڈگری موصول ہونے پر انھوں نے مسرت کا اظہار کیا ہے۔ ڈاکٹر بشیر بدر نے اے ایم یو سے ہی ایم اے کی ڈگری 1969 میں حاصل کی تھی۔ انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ اور پدم شری سے بھی نوازا جا چکا ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 5 جنوری 2021

اعزاز و اکرام

پروفیسر شمیم حنفی کو دوحہ قطر عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ 2021

نئی دھلی: اس سال 'پچیسویں عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ، دوحہ قطر 2021' جیوری کی میٹنگ کووڈ کی وجہ سے آن لائن منعقد ہوئی جس میں اردو کے عالمگیر شہرت یافتہ

نقاد، دانشور و ڈراما نگار شمیم حنفی کو یہ ایوارڈ دینے کا اعلان کیا گیا جو ڈیڑھ لاکھ روپے نقد، طلائی تمغہ اور سپاس نامہ پر مشتمل ہے۔ عالمی فروغ اردو ادب، دوحہ قطر کا یہ ایوارڈ سلور جوبلی ایوارڈ ہوگا۔ جیوری کے چیئرمین پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ایوارڈ کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر شمیم حنفی کو یہ ایوارڈ ان کی مجموعی ادبی و نثری خدمات پر دیا جا رہا ہے۔ شمیم حنفی عہد حاضر کے ممتاز اردو نقاد، ڈراما نگار اور شاعر ہیں۔ آپ کی متعدد کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں جن میں جدیدیت کی فلسفیانہ اساس، نئی شعری روایت، غزل کا نیا منظر نامہ، کہانی کے پانچ رنگ، قاری سے مکالمہ، اقبال کا حرف تمنا، غالب کی تخلیقی حسیت وغیرہ اہم ہیں۔ آپ نے مٹی کا بلاوا، مجھے گھر یاد آتا ہے، زندگی کی طرف اور بازار میں نیند کے نام سے ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ متعدد کتابوں کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے آپ کو پروفیسر ایمریٹس کے عہدے سے سرفراز کیا ہے۔ مجلس فروغ اردو ادب، دوحہ قطر کا یہ پروقار ادبی ایوارڈ ہر سال ایک ہندوستانی اور ایک پاکستانی ادیب کو دیا جاتا ہے۔ ہندوستانی ایوارڈ یافتگان میں آل احمد سرور، قرۃ العین حیدر، جیلانی بانو، کالی داس گپتا رضا، جوگندر پال، سریندر پرکاش، نثار احمد فاروقی، سیدہ جعفر، جاوید اختر، عبدالصمد، گلزار، رتن سنگھ، شموئل، احمد مشرف عالم ذوقی، نند کشور وکرم، سید محمد اشرف، ف س اعجاز اور نور الحسنین وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ پینل آف ججز کا آن لائن اجلاس جیوری کے چیئرمین اور ممتاز نقاد و محقق پروفیسر گوپی چند نارنگ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اراکین جیوری میں پروفیسر شافع قدوائی، چندر بھان خیال، حقانی القاسمی اور نوید انجم شامل تھے جب کہ کوآرڈینیٹر کفایت دہلوی اور معاون محمد موسیٰ رضا بھی موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 جنوری 2021

شرومنی ساہتیہ کار ایوارڈ

پانی پت / جالندھر: پنجاب کے محکمہ السنہ (بھاشا وبھاگ) کے ذریعے اردو ادب کے الگ الگ زمروں میں ادبی خدمات انجام دینے والے پنجاب کے سینئر پولیس آفیسر آئی جی فیاض فاروقی (آئی پی ایس) کی اردو شاعری کو سراہتے ہوئے پنجاب سرکار نے 'شرومنی ساہتیہ کار ایوارڈ' دینے کا اعلان کیا ہے۔ پنجاب کے وزیر تعلیم ترپت راجندر سنگھ باجوہ کی صدارت میں ایوارڈ کا فیصلہ پنجاب بھون چنڈی گڑھ میں منعقدہ ریاستی مشاورتی بورڈ کے اجلاس میں کیا گیا۔ وزیر تعلیم ترپت سنگھ باجوہ نے کہا کہ شرومنی ساہتیہ ایوارڈ 5 لاکھ روپے، ایک میڈل، ایک توصیف نامہ اور ایک شال پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ پنجاب سرکار نے جن دوسرے اردو ادیبوں کے ناموں کا اعلان کیا ہے ان میں ندیم احمد ندیم، ٹی این راز، بی ڈی کالیہ ہمدم، محمد بشیر اور رحمان اختر کے نام شامل ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 دسمبر 2020

پروفیسر ثناء اللہ ندوی

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے شعبۂ عربی کے استاد پروفیسر محمد ثناء اللہ ندوی کو عربی زبان و ادب میں ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انٹرنیشنل آرگنائزیشن آف کریٹیویٹی فار پیس، لندن نے ایوارڈ سے نوازا ہے۔ پروفیسر ثناء اللہ کو عالمی یوم عربی کے موقعے پر آن لائن اجلاس میں 'سپریم رول آف آنر' سے نوازا گیا۔ پروفیسر ثناء اللہ نے عربی، انگریزی اور اردو میں ادب، ثقافت، فلسفہ، یوگا اور تصوف وغیرہ کے موضوعات پر 13 کتابیں اور 250 سے زائد تحقیقی مقالے تصنیف کیے ہیں۔ انھیں 2006 میں صدر جمہوریہ ہند نے عربی زبان و ادب کے میدان میں خدمات کے لیے مہرشی بدرائن ویاس سمان سے نوازا تھا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 5 جنوری 2021

میٹرک امتحان میں اردو میں نمایاں نمبر حاصل کرنے پر طالبات کو اعزاز

بھاگلپور: ناگرک سیوا سمیتی وارحم سماجی تنظیم نے بہار بورڈ 2020 کے میٹرک امتحان میں اردو مضامین میں بہتر مظاہرہ کرنے والی طالبات کو اعزاز سے نوازا، تقریب کی صدارت ناگرک سیوا سمیتی کے صدر رضوان خان نے کی۔ اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ ہماری بچیاں جس قدر تعلیم سے سرفراز ہوں گی اسی قدر ہمارا معاشرہ بھی روشن ہوگا۔ داود علی عزیز نے کہا کہ لڑکیوں کو نمایاں نمبر لانے پر انھیں اعزاز سے نوازنے کا مقصد ان کی حوصلہ افزائی کرنا ہے اور اردو زبان سے ان میں لگاؤ پیدا کرنا ہے۔ مہمان خصوصی ولی احمد خان نے اردو کی ترویج و اشاعت میں جس طرح کی سرگرمی کے ساتھ نئی نسل کو بیدار کرنے میں کوشاں ہیں، ایک دن ملکی سطح پر ان کی رہنمائی بھی بے مثال ثابت ہوگی۔ اس موقعے پر داؤد علی عزیز، ولی احمد خان، منٹو آرٹسٹ، شاہنواز وارثی، صفی اللہ، محمد فاروق سابق امیر مقامی جماعت اسلامی ہند وغیرہ موجود رہے۔

روزنامہ 'سچ کی آواز' دہلی، 17 دسمبر 2020

رسم اجرا

پیر ہرات

سہارنپور: چھتا جمبو داس نزد گمبر جین گرلز انٹر کالج کے میٹنگ ہال میں آل انڈیا اردو تعلیمی بورڈ سہارنپور کے زیر اہتمام ایک کتاب پیر ہرات کا اجرا ایم پی حاجی فضل الرحمٰن کے فرزند التمش قریشی و مشرف خطیب سہارنپوری نے کیا۔ کتاب کے مصنف خواجہ سلمان ناصری نے بتایا کہ کتاب پیر ہرات کا موضوع پانچویں صدی کے بڑے صوفی شاعر اور عالم خواجہ عبداللہ انصاری کی سیرت زندگی سے آراستہ ہے جو اردو زبان میں پہلی بار شائع کی گئی ہے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 24 دسمبر 2020

'فکر انقلاب' کا خصوصی شمارہ 'اکابر دیوبند نمبر'

دیوبند: اکابرین دیوبند کی علمی جدوجہد اور فکر دیوبند کی توسیع کے تسلسل کی بقا و تحفظ کے لیے آل انڈیا تنظیم وعلماء

حق کے ترجمان 'فکر انقلاب' کے خصوصی شمارہ اکابر دیو بند نمبر کی رسم رونمائی قاسم پورہ روڈ پر واقع معروف دینی ادارہ دار العلوم اشرفیہ میں علما کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس مناسبت سے منعقد تقریب میں دار العلوم دیو بند اور وقف دار العلوم دیو بند کے اصحاب علم وقلم اور اہالیان دیو بند نے آل انڈیا تنظیم علماء حق کی تحسین کی اور کہا کہ جو کام دیو بند کی سرزمین میں ہونا چاہیے تھا اس کام کو 'فکر انقلاب' کے مدیران نے مولانا محمد اعجاز عرفی کی نگرانی میں دہلی میں انجام دیا، جس کے لیے پوری ٹیم مبارکباد کی مستحق ہے۔ دار العلوم اشرفیہ کے مہتمم مولانا محمد سالم اشرف قاسمی نے اکابر دیو بند کی علمی، فکری جدو جہد پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ آل انڈیا تنظیم علماء حق مسلسل پندرہ سال سے اکابر دیو بند کے اوصاف وکمالات پر دستاویزی شمارے شائع کر رہا ہے، اکابر دیو بند پر عظیم تاریخی دستاویزی شمارہ 'اکابر دیو بند نمبر' کی اشاعت سے وہ تاریخ ساز کارنامہ انجام دیا ہے، جس کے لیے اہل دیو بند اور علماء دیو بند کو ممنون ہونا چاہیے۔ ترجمان دیو بند کے مدیر اعلیٰ مولانا ندیم الواجدی نے کہا کہ اس دور میں اکابر دیو بند کے حالات وکوائف کی ترویج واشاعت میں جو کردار آل انڈیا تنظیم علماء حق ادا کر رہی ہے وہ لائق تحسین اور قابل تبریک ہے۔ دار العلوم وقف کے استاذ مولانا نسیم اختر شاہ قیصر نے فکر انقلاب کے اکابر دیو بند نمبر کو ایک تاریخ ساز دستاویز قرار دیا اور کہا کہ اس شمارے میں عالمی سرکردہ شخصیات نے اپنے پیغامات میں اکابر دیو بند کے سلسلہ میں جن جذبات کا اظہار کیا ہے اس سے اس کی اہمیت دوبالا ہوجاتی ہے۔ قاری ابوالحسن اعظمی اور مولانا فریدالدین قاسمی نے بھی اکابر دیو بند نمبر کی ستائش کی۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ڈاکٹر عبید اقبال عاصم، سہارنپور سے مفتی ناصرالدین مظاہری، رکن شوریٰ دار العلوم دیو بند مولانا سید انظر حسین دیو بندی، نامور قلمکار سید وجاہت شاہ نے مشترکہ طور پر 'فکر انقلاب' کے اکابر دیو بند نمبر کو ایک انقلابی کارنامہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس کتاب کا مطالعہ یقیناً ذہن وفکر میں انقلاب برپا کرے گا۔ سابق رکن اسمبلی معاویہ علی نے بھی اپنی مسرت وخوشی کا اظہار کرتے ہوئے ذمہ دار کو اس کار خیر کے لیے مبارکباد پیش کی۔ تقریب کے دوران معروف عالم دین مولانا اعجاز عرفی قاسمی اور 'فکر انقلاب' کے مدیران مولانا اسعد مختار اور مولانا احسن مہتاب نے 'اکابر دیو بند نمبر' کی اہمیت اور مقصدیت پر روشنی ڈالی۔ دار العلوم دیو بند کے مفتی اعظم مفتی حبیب الرحمان کی دعا پر تقریب اختتام پذیر ہوئی۔ آخر میں کنوینر پروگرام مولانا سالم اشرف نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'سچ کی آواز' دہلی، 25 دسمبر 2020

افکار زاہد

حیدرآباد: اردو مسکن خواجہ شوق ہال خلوت میں حافظ و قاری ولی محمد زاہد ہریانوی کے دوسرے شعری مجموعہ 'افکار زاہد' کا اجرا سینئر شاعر وصحافی صلاح الدین نیر کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس موقعے پر صلاح الدین نیر نے کہا کہ میں ذاتی طور پر زاہد ہریانوی کو ان کے کردار وخوش مزاجی کی وجہ سے بے حد پسند کرتا ہوں۔ زاہد کے کلام سے میں بے حد متاثر ہوا ہوں۔ میں زاہد ہریانوی کے دوسرے شعری مجموعہ 'افکار زاہد' کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اسلم فرشوری نے کہا کہ زاہد ہریانوی کی شاعری کی زبان نہایت سادہ اور سلیس ہے۔ سید مسرور عابدی شرفی نے کہا کہ زاہد ہریانوی کی شاعری میں سلاست اور بلند خیالی ومشاہدات کی فراوانی اوج پر دکھائی دیتی ہے۔ ڈاکٹر خواجہ فریدالدین صادق زعیم ذومرہ اور مفتی مجاہد ہلال اعظمی مدیر ماہنامہ 'صدائے شبلی حیدرآباد' نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'منصف' 31 دسمبر 2020

مولانا محمد علی جوہر: آنکھوں دیکھی باتیں

رامپور: عظیم مجاہد آزادی مولانا محمد علی جوہر کی زندگی اور کارناموں پر مبنی دستاویزی کتاب 'مولانا محمد علی جوہر: آنکھوں دیکھی باتیں' کا اجرا کرتے ہوئے نامور اسکالر اور مولانا محمد علی کے قریبی رشتہ دار ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی نے کہا کہ "میں نے اپنی زندگی میں مولانا محمد علی جوہر پر اب تک جن چار سو کتابوں کا مطالعہ کیا ہے ان میں یہ کتاب سب سے منفرد دستاویز ہے، جسے جوہر شناسی میں سرفہرست رکھا جاسکتا ہے۔" رامپور کی صولت لائبریری کے حمایت ہال میں تقریب اجرا کو خطاب کرتے ہوئے فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے سابق چیئرمین ڈاکٹر حسن احمد نظامی نے کہا کہ مولانا محمد عبدالملک جامعی کی تصنیف اور صحافی معصوم مرادآبادی کی یہ تالیف ادبی اور تاریخی دونوں اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے اور یہ ایک قابل فخر کارنامہ ہے۔" صولت لائبریری کے چیئرمین سین شین عالم نے کہا کہ یہ کتاب مولانا کے شب و روز کے معمولات، افکار ونظریات اور دیگر مصروفیات پر دستاویزی حیثیت کی حامل ہے۔ مصنف کو نہ صرف مولانا محمد علی کے احباب میں شناخت حاصل تھی بلکہ جوہر کے اہل خانہ اور دیگر متعلقین خاندان سے بھی ان کا رابطہ تھا۔ اس لیے شخصی حوالوں سے ان کی معلومات کا دائرہ وسیع بھی تھا اور مستند بھی۔

کتاب کے مرتب معصوم مرادآبادی نے کہا کہ دستاویزی نوعیت کی یہ کتاب مدینہ منورہ میں لکھی گئی، دہلی میں اس کی ترتیب وتدوین ہوئی اور اب جوہر کے وطن رامپور میں اس کا اجرا ہو رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مولانا محمد علی جوہر کی زندگی اور ان کے افکار ونظریات پر اتنی اچھی کتاب اب تک شائع نہیں ہوئی۔" ڈاکٹر شریف احمد قریشی نے کلیدی خطبے میں کہا کہ "اس کتاب کو پڑھ کر یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ مولانا نہایت شگفتہ ومزاحیہ مزاج کے بھی حامل تھے۔" مہمان خصوصی اور ممتاز شاعر اظہر عنایتی نے اس موقعے پر کہا کہ کتاب کے مرتب معصوم مرادآبادی ہمارے ان چند کھرے اور سچے صحافیوں میں ہیں، جنھوں نے اپنی صحافتی زندگی کے طویل سفر میں خود کو ضمیر فروشوں اور قلم فروشوں کی بھیڑ سے بچائے بھی رکھا ہے اور قلم کی عظمت وحرمت کو برقرار بھی رکھا ہے۔" تقریب کا اہتمام کیئر ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی نے کیا۔ اہم شرکا میں مولانا جاوید اسلم قاسمی، ڈاکٹر شعائراللہ خاں، ڈاکٹر ممتاز عرشی، ڈاکٹر سید انوارالحسن قادری، نعیم نجمی، مختار تمہری، آل احمد خاں سرور، صحافی غفران فریدی، ذیشان مراد، ناصر خاں علیگ، رضوان احمد صدیقی اور سید شکیل غوث شامل تھے۔ پروگرام کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر رباب انجم نے انجام دیے اور آخر میں میزبان فیصل شاہ خاں نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 دسمبر 2020

ذرہ نوازی

امروہہ: انجمن ترقی اردو اترپردیش امروہہ کے زیر اہتمام ایک ادبی تقریب کا انعقاد ہوا جس میں بطور مہمان خصوصی عالمی شہرت یافتہ مزاحیہ شاعر ومصنف اکٹر سید اعجاز الدین میرٹھی عرف پاپولر میرٹھی نے شرکت کی۔ اس دوران نائب صدر انجمن ترقی اردو اترپردیش وسرکردہ سماجی کارکن ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی، ومہمان خصوصی پاپولر میرٹھی و دیگر مہمانان کے بدست عالمی شہرت یافتہ شاعر ڈاکٹر نواز دیوبندی کی شاعری وادبی خدمات پر مشتمل تازہ تصنیف ذرہ نوازی کی رسم رونمائی عمل میں آئی۔ قابل ذکر ہے کہ ڈاکٹر نواز دیوبندی کی شاعری وادبی خدمات پر مبنی اس تازہ تصنیف میں ڈاکٹر نواز دیوبندی کے منتخب کلام اور ان

کی ادبی خدمات کو یکجا کیا گیا ہے۔ 'ذرہ نوازی' پر تبصرہ کرتے ہوئے مہمان خصوصی پاپولر میرٹھی نے کہا کہ ڈاکٹر نواز دیوبندی خود میں ایک دیوان ہیں اعلیٰ درجہ کی شاعری سنجیدہ لب ولہجہ کے ساتھ ڈاکٹر نواز دیوبندی نے نعت گوئی اور غزل ونظم ہر شعبہ میں معیاری شاعری، سے اپنی منفرد شناخت قائم کی ہے۔ ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی نے کہا کہ ڈاکٹر نواز دیوبندی معیاری شاعر ہونے کے علاوہ بلند کردار انسان بھی ہیں۔ شاعری کے ذریعے حق گوئی ڈاکٹر نواز دیوبند کی شناخت ہے۔

روزنامہ 'سچ کی آواز' دہلی، 22 دسمبر 2020

مغربی بنگال میں اردو تحقیق

کولکاتہ: مغربی بنگال عہد قدیم سے ہی اردو زبان و ادب کا مرکز رہا ہے جہاں مسلسل ادبی بیداری تحریکیں دیکھنے کو ملتی رہی ہیں جنھیں اردو کی زندہ تحریکوں سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اسی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے گذشتہ 18 دسمبر 2020 کو کولکاتا کے مضافات کے شہر کمرہٹی کے کولکاتا میرج ہال میں ڈاکٹر سلمہ خاتون (شعبۂ اردو بیرکپور راشٹر گرو سریندر ناتھ کالج) کی کتاب بنگال میں اردو تحقیق کی رسم رونمائی کی تقریب منعقد ہوئی جس کی صدارت مغربی بنگال کے کہنہ مشق شاعر وادیب پروفیسر عاصم شہنواز شبلی نے کی اور نظامت کے فرائض معروف شاعر وادیب ممتاز انور نے انجام دیے۔ جلسے کا افتتاح یقین فاؤنڈیشن کے روح رواں اور رہبر فاؤنڈیشن کے رہبر خاص مولانا روشن ضمیر نے کیا۔ انھوں نے مصنفہ کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ کتابیں تاریخ کا حصہ ہوتی ہیں جن کے ذریعے قوم وملک کی تقدیر سنوارنے میں مدد ملتی ہے۔ ڈاکٹر جاوید ہمایوں نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ کتاب آنے والی نسلوں کے لیے سودمند ثابت ہوگی۔ حلیم صابر نے کہا کہ بنگال میں اردو تحقیق کے حوالے سے جو کتاب منظر عام پر آئی ہے یہ مغربی بنگال کے ادبی خزانے میں اضافے کا باعث بنے گی۔ ڈاکٹر رضی احمد نے مصنفہ کی پذیرائی کرتے ہوئے کہا کہ اس سلسلے کو مزید دراز کرنے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر سلمہ خاتون نے اپنی دلی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے معاونین ومحسنین کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: محمد انیس الرحمٰن، مغربی بنگال، 20 دسمبر 2020

تیمور کے دیس میں...

نئی دھلی: بستی حضرت نظام الدین میں واقع غالب اکادمی میں صحافی ڈاکٹر ممتاز عالم رضوی کی کتاب 'تیمور کے دیس میں: سفرنامہ ازبکستان' کی رسم اجرا تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر شاہجہانی جامع مسجد کے امام مولانا سید احمد بخاری نے کہا کہ زندگی میں کسی بھی سفر کی ایک الگ ہی اہمیت ہے اور یہ دنیاوی زندگی تو درحقیقت خود ایک سفر ہے۔ اگر ڈاکٹر ممتاز عالم ازبکستان کے سفر پر نہ جاتے تو یہ سفرنامہ تحریر نہ ہوتا، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انھوں نے جو سفرنامہ بعنوان تیمور کے دیس میں تحریر کیا ہے وہ صرف تحریر ہی نہیں بلکہ بولتی تصویر بھی ہے۔ پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے ڈاکٹر ممتاز کی کاوش کا اعتراف کرتے ہوئے امیر تیمور کا تذکرہ کیا اور بتایا کہ انھوں نے وصیت کی تھی کہ انھیں ان کے استاد کے قدموں میں دفن کیا جائے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ اس سفرنامہ کو پڑھ کر لگتا ہے کہ ازبکستان آنکھوں کے سامنے ہے، اس میں تاریخ وتمدن کا تذکرہ اس کی اہمیت کو اور بھی زیادہ بڑھا دیتا ہے۔ اس کے علاوہ سابق سفیر و ایم پی م افضل، سابق ایم پی ڈاکٹر شاہد صدیقی، انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے صدر سراج الدین قریشی، شاہی امام مسجد فتح پوری ڈاکٹر مفتی مکرم احمد نقشبندی، نائب شاہی امام سید شعبان بخاری، سابق ایم پی محمد سالم انصاری، ایم ایل سی ڈاکٹر محمد خالد انور، آل انڈیا کانگریس اقلیتی شعبہ کے چیئرمین ندیم جاوید، شکیل حسن شمسی ودیگر نے اظہار خیال کیا۔ قبل ازیں پروگرام کا آغاز مصور رضوی کی تلاوت کلام پاک سے ہوا اور متین امروہوی نے غالب کی زمین پر کلام پیش کیا، جبکہ پروگرام کی نظامت صوفی پیس فاؤنڈیشن کے چیئرمین ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن نے کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 4 جنوری 2021

حرف امتیاز

سہارنپور: کے آر پلازہ کے ایک خوبصورت ہال میں بعد نماز ظہر، ادیب اور شاعر انیس میرٹھی، حاجی یونس کوثر ایڈوکیٹ، راؤ منفعت علی خاں ایڈوکیٹ، طارق مرزا ایڈوکیٹ، شاہ عالم ایڈوکیٹ، سید قاسم، ڈاکٹر قدسیہ انجم اور سابق ممبر اسمبلی راؤ نعیم خان نے ایک ساتھ معروف وکیل اور شاعر سید رونق علی کے اردو مجموعہ کلام حرف امتیاز کا اجرا کرتے ہوئے مصنف اور مدیر سید رونق علی کو دلی مبارکباد پیش کی۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی انیس میرٹھی نے کہا کہ اردو شاعری کے ساتھ ساتھ ہندی انگریزی کے لیے بھی جو کچھ آپ نے لکھا اور پڑھا وہ کافی سراہا گیا۔ اپنے مجموعہ کلام (حرف امتیاز) کو جس تسلسل اور سہل زبان میں غزلیات، نظموں اور قطعات کی شکل میں ہمارے روبرو کیا وہ تحریر ان کی اعلیٰ ادبی اور شاعرانہ رتبہ کی ضامن ہے اور ہر لحاظ سے قابل تعریف ہے۔ مشہور مصنف، ادیب اور شاعر انیس میرٹھی نے کہا کہ سید رونق علی کا یہ مجموعہ کلام ہر زاویے سے قابل تعریف ہے ایک وکیل ہونے کے ساتھ ساتھ اردو ادب سے اس قدر محبت کیا کہنے۔ یونس کوثر نے کہا کہ سید رونق علی نے چالیس سالوں کی اپنی وکالت میں ملک وملت کی جس قدر خدمات انجام دی ہیں ان کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے، سید رونق علی جیسے وکلا اور خدمت خلق کو اپنی زندگی کا نصب العین تسلیم کرنے والے لوگ اب گنتی کے ہی رہ گئے ہیں۔ آپ قدم بہ قدم انسانی جذبہ اور انسانی ہمدردی سے شرابور رہتے ہوئے کار خیر میں شریک رہتے ہیں اور یہی آپ کے مجموعہ کلام کی خوبصورتی ہے۔

روزنامہ 'میراوطن' دہلی، 5 جنوری 2021

رضوان لطیف کی چار کتابوں کا اجرا

رامپور: صولت پبلک لائبریری رامپور کے زیر اہتمام ایک پروقار تقریب کا انعقاد کیا گیا جس میں معروف مصنف رضوان لطیف خاں کی چار کتب سنہرے اقتباسات، تحقیقی، تنقیدی اور ادبی مضامین، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے غیر تدریسی عملے کی ادبی خدمات اور دعوت قرآن کی رونمائی عمل میں آئی۔ تقریب کا افتتاح قاری انوار الحسن قادری نے تلاوت کلام الٰہی سے کیا اور نعت پاک پڑھنے کی سعادت معروف شاعر اظہر عنایتی نے حاصل کی اور مسقط کے شاعر عارف خاں نظم (گر ہند کو جانا تو علی گڑھ جانا) فائزہ زبیر نے بہترین لب ولہجہ میں پیش کی۔ اس پروقار تقریب کی صدارت ڈاکٹر حسن احمد نظامی (سابق چیئرمین فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی اتر پردیش) نے کی جب کہ مہمان ذی وقار کے طور پر ڈاکٹر سید عبداللہ طارق، ڈاکٹر شریف احمد قریشی موجود تھے۔ افتتاحی خطبہ میں صدر لائبریری س ش عالم نے رضوان لطیف کو فرزند رامپور کے لقب سے نوازتے ہوئے کہا کہ ہمارے لیے فخر کی بات ہے کہ رامپور کے فرزند نے جہاں اپنی اپنی خدمات اور صلاحیتوں کو دنیا بھر میں منوایا اور اپنی تصانیف کے ذریعے جو ادبی خدمت کی ہے وہ ناقابل فراموش ہے۔ میرا لگاؤ اس لائبریری سے بچپن سے رہا ہے اور آج بھی میں لائبریری کی ترقی کے لیے ہمہ وقت تیار ہوں۔ اپنے

صدارتی خطبہ میں حسن احمد نظامی نے کہا کہ رضوان لطیف صاحب کا خاندان دہائیوں سے درس و تدریس سے وابستہ ہے اور ان کے خانوادے کی یہ خدمات اللہ کی بارگاہ میں بھی مقبول ہیں اور دنیاوی طور پر بھی یہ عمل بہترین ہے۔ انھوں نے کہا کہ سرکاری نوکری میں رہتے ہوئے جس طرح رضوان لطیف خاں نے کتابیں تصنیف کی ہیں وہ قابل ستائش ہے۔ میں ان کی ادبی خدمات کو سلام کرتا ہوں۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 11 دسمبر 2020

گلہائے مدینہ

سنبھل: انجمن باغ ادب سنبھل کے زیراہتمام معروف شاعر مزمل خاں مزمل سنبھلی کے نعتیہ کلام 'گلہائے مدینہ' کی رسم رونمائی کی تقریب عاشق پبلک لائبریری میں منعقد ہوئی جس میں شہر کی ادبی وسماجی شخصیات نے شرکت کی، حکیم برہان سنبھلی نے کلام پاک کی تلاوت سے تقریب کا آغاز کیا، معروف شاعر وادیب وقار رومانی نے شمع روشن کرکے تقریب کا باقاعدہ آغاز کیا۔ ملک و بیرون ملک شہرت رکھنے والے شاعر وصحافی ڈاکٹر طارق قمر نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ انھوں نے اس موقعے پر اردو زبان کے فروغ کے لیے نئی نسل کو متحرک رہنے کی تلقین کی۔ ایم جی ایم کالج کے پرنسپل ڈاکٹر عابد حیدری نے اردو کے فروغ میں چھوٹی چھوٹی اردو تقریبات کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ایسی تقریبات نئی نسل کو اردو سے جوڑنے کا ذریعہ بنتی ہیں۔ ہند انٹر کالج کے سابق پرنسپل وقار رومانی نے کہا کہ اردو زبان ہماری تہذیب و تمدن سے جڑی ہوئی ہے۔ اس لیے اس کو زندہ رکھنے کی ذمے داری بھی ہم سب کی ہے۔ اس موقعے پر شاہ عالم رونق، گلزار نوشاہی، ڈاکٹر شاہ ویز، میر شاہ حسین، انتخاب سنبھلی، کوثر سنبھلی، تنویر اشرف اشرفی، توفیق آزاد، شفیع چشتی، کامل جنئیوی، سید حسین افسر، کامل وارثی، نظام سنبھلی اور شہاب الدین گوہر نے بھی اپنے کلام پیش کیے۔

روزنامہ 'سچ کی آواز' دہلی، 10 دسمبر 2020

وفیات

مشہور نقاد پدم شری شمس الرحمٰن فاروقی

پریاگ راج: اردو دنیا کے بہترین نقاد وادیب پدم شری شمس الرحمٰن فاروقی کا 25 دسمبر 2020 جمعہ کی صبح تقریباً ساڑھے 11 بجے الہ آباد میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 85 برس تھی۔ مرحوم کی تدفین اشوک نگر واقع نوادہ

قبرستان میں ہوئی۔ ان کی نماز جنازہ مولانا شمس الرحمٰن نے پڑھائی۔ اس موقعے پر ہندی اردو کے تمام ادبا وشعرا نے شرکت کی۔ پسماندگان میں دو بیٹیاں ہیں۔ ان کے بھائیوں میں پروفیسر نعیم الرحمٰن فاروقی، کلیم الرحمٰن فاروقی، شمیم الرحمٰن فاروقی، محمد احمد فاروقی، ابوالقاسم فاروقی آئی اے ایس ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کافی دنوں سے علیل تھے اور دہلی کے ایک اسپتال میں زیرعلاج تھے۔ آج 25 دسمبر ہی کو انھیں ایئر ایمبولینس کے ذریعے واپس الہ آباد لایا گیا تھا۔ جیسے ہی شمس الرحمٰن فاروقی کی رحلت کی خبر عام ہوئی۔ ادبی حلقے میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ الہ آباد شہر میں واقع ان کی رہائش گاہ پر اظہار تعزیت کرنے والوں کا تانتا لگ گیا۔ ان کی نماز جنازہ میں اہل شہر کی بڑی تعداد موجود تھی۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا نام اردو ادب میں انتہائی احترام سے لیا جاتا ہے۔ مرحوم کی دو درجن سے زائد کتابیں ہیں۔ دنیا کے بیشتر ممالک میں وہ لکچر دینے جاچکے تھے۔ انھیں علی گڑھ یونیورسٹی سے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری تفویض کی گئی تھی۔ فاروقی 'سرسوتی سمان' سے بھی سرفراز کیے گئے تھے۔ ہندوستان کی بیشتر صوبائی اردو اکادمیوں نے انھیں اپنے سب سے بڑے اعزاز سے سرفراز کیا تھا۔ ان کے تخلیقی کاموں میں میرتقی میر پر چار جلدوں میں 'شعر شور انگیز' اور 'اردو کا ابتدائی زمانہ' شامل ہیں۔ ان کا ناول 'کئی چاند تھے سرآسماں' اردو، انگریزی اور ہندی تینوں زبانوں میں شائع ہوچکا ہے۔ اس کے علاوہ 'تفہیم غالب' کتاب بھی بہت مقبول ہوئی۔ مرحوم پدم شری سے بھی نوازے گئے تھے ایک اور کتاب 'تنقیدی افکار' بھی ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے سرفراز کی گئی۔ شمس الرحمٰن فاروقی 1935 میں پرتاپ گڑھ میں پیدا ہوئے۔ تاہم 1953 میں الہ آباد آگئے۔ انھوں نے 1955 میں الہ آباد یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم اے کیا۔ کچھ دنوں تک شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج اعظم گڑھ اور بلیا میں انگریزی ادب کے لکچرر رہے۔ اس کے بعد انڈین پوسٹل سروس کے لیے منتخب ہوئے اور مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ وہ قومی اردو کونسل نئی دہلی کے ڈائرکٹر بھی رہ چکے تھے۔ محکمہ ڈاک کی ملازمت کے دوران ان کی کوششوں سے مرزا غالب، میر انیس، فراق گورکھپوری، اور حسرت موہانی وغیرہ پر یادگاری ڈاک ٹکٹ جاری ہوئے۔ ان کی نگرانی میں الہ آباد سے 1966 میں ماہنامہ 'شب خون' جاری ہوا جو ایک معیاری رسالہ تھا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 دسمبر 2020

پروفیسر ظفر احمد صدیقی

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے سابق صدر پروفیسر ظفر احمد صدیقی 29 دسمبر 2020 کو اس دارفانی سے رحلت فرمائے گئے۔ ان کی وفات ادبی دنیا

کے لیے بڑا خسارہ ہے۔ ان کی بے شمار کتابیں ہیں جن میں شبلی (مونوگراف)، مولانا شبلی: بحیثیت سیرت نگار، شرح دیوان اردو غالب، انتخاب مومن، نقش معنی، مقالات نذیر وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے 531 سے زیادہ مقالات ملک اور بیرون ملک خصوصاً پاکستان (نقوش، لاہور-اقبالیات، لاہور-صحیفہ، لاہور-قومی زبان، کراچی، وغیرہ) کے معیاری جرنل میں شائع ہوچکے ہیں۔ یہ سلسلہ آخری عمر تک جاری رہا۔ پروفیسر ظفر احمد صدیقی کو نقوش ایوارڈ لاہور (پاکستان) کے علاوہ بھارت کی مختلف اردو اکیڈمیز نے انعامات واعزازات سے نوازا۔ انھوں نے مختلف سمیناروں میں 331 مقالات متعدد کلیدی اور صدارتی خطبے پیش کیے، اس کے علاوہ بطور ریسورس پرسن 55 کانفرنسوں اور ورکشاپ میں شرکت کی۔ اکتوبر 2019 تک ان کی زیرنگرانی 48 پی ایچ ڈی اور ایم فل مقالات پر ڈگریاں تفویض ہوئیں۔

روزنامہ 'اودھ نامہ' لکھنؤ، 31 دسمبر 2020

پدم شری ایوارڈ یافتہ شاعرہ سوگا تا کماری

تریوانند پورم: پدم شری ایوارڈ یافتہ مشہور شاعرہ اور ماحولیاتی رضا کار سوگا تا کماری کا 23 دسمبر کے روز یہاں میڈیکل کالج اسپتال میں کورونا وائرس کے علاج کے دوران انتقال ہوگیا۔ وہ 86 سال کی تھیں۔ طبیعت زیادہ خراب ہونے کے بعد محترمہ سگاتا کماری کو پرائیویٹ اسپتال سے میڈیکل کالج اسپتال میں منتقل کیا گیا تھا۔ انھیں سانس لینے کی دشواری ہورہی تھی۔ قابل ذکر ہے کہ کیرالہ میں ماحولیاتی تحفظ اور حقوق نسواں کی تحریکوں میں قیادت کرنے والی شاعرہ محترمہ سوگا تا کماری ماحولیاتی تحفظ کمیٹی کی بانی سکریٹری تھیں۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 24 دسمبر 2020

ڈاکٹر فاراں شکوہ یزدانی

دربھنگہ: ایل این متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ کے شعبۂ اردو کے سابق استاد ڈاکٹر فاراں شکوہ یزدانی (ولادت 3 نومبر 1953 بمقام پوناس، کشن گنج، ولد جناب اکمل یزدانی مرحوم) کا انتقال 30 دسمبر 2020 شب پارس ہسپتال، پٹنہ میں ہوگیا۔ انھیں ایک ہفتہ قبل برین ہیمبرج ہوا تھا۔ ان کا جسد خاکی پوناس لایا گیا جہاں 31 دسمبر 2020 بعد نماز ظہر مولانا عابد نے نماز جنازہ پڑھائی اور انھیں وہیں آبائی

قبرستان میں سیکڑوں نمناک آنکھوں سے سپرد خاک کیا گیا۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ بیٹے اور بیٹیاں ہیں۔ مرحوم نومبر 2018 میں ایل این متھلا یونیورسٹی سے سبکدوش ہوئے تھے اور ان دنوں پوناس میں مقیم تھے۔ انھوں نے اس یونیورسٹی کو نومبر 1982 میں جوائن کیا تھا۔ بڑی باغ و بہار طبیعت پائی تھی۔ طلبہ سے ذہنی قربت رکھتے تھے اور ان کے مسائل پر خصوصی توجہ دیتے تھے۔ انھوں نے 'پورنیہ میں اردو زبان و ادب کا ارتقا' کے عنوان سے پی ایچ ڈی کی تھی اور ان کے مضامین رسائل و جرائد میں گاہے گاہے شائع ہوتے رہتے تھے۔ ان کے شاگردوں میں ڈاکٹر مشتاق احمد، پروفیسر آفتاب اشرف، پروفیسر سید احتشام الدین، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، ڈاکٹر وصیہ عرفانہ، احتشام الحق، آفتاب عالم، فضا امام وغیرہ بھی شامل ہیں۔ ان کی نگرانی میں پہلی پی ایچ ڈی ڈاکٹر ایم صلاح الدین نے 'منظر شہاب: شخصیت اور فن' کے عنوان سے کی تھی۔ مرحوم تقریباً ایک سال تک انچارج صدر، شعبۂ اردو، ایل این ایم یو بھی رہے۔ فکشن کی طرف ان کا میلان زیادہ تھا۔

روزنامہ 'تاثیر' پٹنہ، 1 جنوری 2021

سنیل کوٹھاری

نئی دہلی: پدم شری اعزاز یافتہ رقص کے تاریخ دان اسکالر اور نقاد سنیل ٹھاکر کا 27 دسمبر کو انتقال ہوگیا۔ وہ 87 برس کے تھے اور غیر شادی شدہ تھے۔ کوٹھاری گذشتہ نومبر

میں کووڈ 19 سے متاثر ہوگئے تھے اور انھیں اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا۔ وہ ٹھیک ہوکر گھر آگئے تھے لیکن انھیں دل کا دورہ پڑا تو پھر سے اسپتال میں داخل کرایا گیا جہاں صبح تقریباً 9 بجے انھوں نے آخری سانس لی۔ پدم شری یافتہ رقاصہ گیتا چندرن شوبھنا نارائن ملکہ سارا بھائی سمیت رقص کی دنیا کی مشہور شخصیات نے ڈاکٹر کوٹھاری کے انتقال پر گہرے رنج کا اظہار کیا ہے اور اسے ہندوستانی کلاسیکی رقص کی دنیا کا بڑا نقصان بتایا ہے۔ 20 دسمبر 1933 کو ممبئی میں پیدا ہوئے ڈاکٹر کوٹھاری پیشے سے چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ تھے لیکن رقص سے لگاؤ کے سبب وہ اس شعبے میں رچ بس گئے۔ انھوں نے ہندوستانی کلاسیکی رقص پر 20 کتابیں تحریر کیں۔ وہ ممبئی میں مصروف انگریزی ادیب ملک راج آنند کے دوست بھی تھے۔ انھوں نے بڑودہ یونیورسٹی میں رقص شاستر میں پی ایچ ڈی کی۔ پھر وہ وشو بھارتی یونیورسٹی میں اودے شنکر پروفیسر بن گئے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 28 دسمبر 2020

فاروق راہب

موتیہاری: اردو کے معروف افسانہ نگار فاروق راہب کا پٹنہ میں انتقال ہوگیا۔ منفرد فکر اور لب و لہجے کے سبب موصوف کی پذیرائی ترقی پسند اور جدید دونوں حلقوں میں یکساں طور پر تھی۔ فاروق راہب کا شمار عصر حاضر کے ممتاز

افسانہ نگاروں میں ہوتا تھا۔ ان کا تخلیقی رویہ موجود عہد کے دیگر افسانہ نگاروں سے بالکل منفرد تھا۔ ان کی تخلیقات کی تفہیم کے لیے غور و فکر کرنا پڑتا ہے کیونکہ ان کے بیانیے میں بیک وقت کئی پہلوؤں کی شمولیت ہوتی ہے۔ فاروق راہب بطور انسان بھی ہر دل عزیز اور نہایت درجہ نفیس و شریف الطبع آدمی تھے۔ درس و تدریس ان کا مشغلہ تھا۔ موتیہاری کے ایک اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ ستمبر 2005 میں وہ سبکدوش ہوئے تھے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 24 دسمبر 2020

ملک العزیز

چنئی: تمل ناڈو کے مشہور و معروف صحافی و کاتب ملک العزیز صاحب کا بلورتھ اسپتال، چنئی میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 70 برس کی تھی۔ ملک العزیز تمل ناڈو کے مشہور صحافی اور اردو زبان کے عظیم خدمت گزار تھے۔ انھوں

نے شہر بنگلور کے روزنامہ 'سالار' میں محمود ایاز کے دور میں اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا تھا اور راز امتیاز، سالک ناظمی، کاظم نائطی کے ہمراہ اردو زبان و ادب کی خدمت انجام دی تھی۔ اس کے بعد وہ چنئی چلے آئے تھے اور یہاں بھی وہ مختلف اخبارات میں لکھتے رہے۔ اردو اخبارات کے علاوہ انگریزی اخبارات میں بھی لکھتے رہے۔

پریس ریلیز: اکبر زاہد تمل ناڈو، 3 جنوری 2021

محمد نسیم اختر

نئی دہلی: اردو اور سائنس کو زندگی بھر سینے سے لگائے رکھنے والے اور سی ایس آئی آر، حکومت ہند کی جانب سے شائع ہونے والی باوقار اردو میگزین 'سائنس کی دنیا' سے وابستہ محمد نسیم اختر 70 سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ وہ شاہدرہ حلقہ کی جھلمل کالونی میں رہائش پذیر تھے۔ ان کے پسماندگان میں ایک بیٹا اور دو بیٹیاں شامل ہیں۔ محمد نسیم اختر کے انتقال کو عظیم سانحہ قرار دیتے ہوئے آل انڈیا یونانی طبی کانگریس کے اعزازی سکریٹری جنرل ڈاکٹر سید احمد خان نے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم نے اردو اور سائنس کو ایک ساتھ لے کر چلنے کے لیے پوری زندگی وقف کر رکھی تھی جن کے انتقال سے اردو دنیا کا بھی ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے۔ مرحوم نے ایک کتاب بھی 'جہان سائنس' کے نام سے قلم بند کی جو مرحوم کے لیے صدقہ جاریہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ مرحوم محمد نسیم اختر نے اردو اور سائنس کی دنیا میں جو خدمات انجام دی ہیں، انھیں فراموش کرنا ممکن نہیں ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 1 جنوری 2020

اقبال احمد خان

نئی دہلی: کلاسیکل موسیقی میں دہلی گھرانہ کے خلیفہ استاد اقبال احمد خان کا 17 دسمبر کو انتقال ہو گیا۔ جیسے ہی ان کے انتقال کی خبر عام ہوئی سرود کے استاد امجد علی خاں،

طبلے کے استاد اکرم خاں اور سارنگی نواز استاد کمال صابری نے اپنے اپنے تعزیتی پیغام میں اس حادثہ کو ایک عظیم خسارے سے تعبیر کیا۔ سوشل میڈیا پر بھی استاد اقبال احمد خان کے انتقال کی خبر پر غم و اندوہ کی لہر دیکھنے کو ملی۔ کئی سرکاری و غیر سرکاری اعزازات سے نوازے گئے 66 سالہ استاد اقبال احمد خان نے پرانی دہلی کے سوئی والان میں واقع اپنے پشتینی مکان میں آخری سانس لی۔ ان کے انتقال پر استاد امجد علی خاں، استاد اکرم خاں اور استاد کمال صابری نے گہرے غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ 2020 نے ان سے کئی سارے عمدہ اداکار چھین لیے۔ انھوں نے بتایا کہ استاد جی (اقبال احمد خاں) کو ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کا گہرا علم تھا۔ انھوں نے دہلی گھرانے کو آگے بڑھانے کے لیے بے شمار شاگردوں کو موسیقی کی مفت تعلیم دی۔ استاد امجد علی خاں نے استاد اقبال احمد خاں کے انتقال پر اپنی تکلیف بیان کرتے ہوئے کہا کہ دہلی گھرانے کے مشعل بردار کا جانا واقعی بہت بڑا خسارہ ہے۔ کلاسیکی موسیقی کی باریکیوں اور اپنے گھرانے کی خوبصورتی کے ماہر خلیفہ جی اچھے موسیقار، گلوکار زبردست انسان تھے جنھوں نے موسیقی کو گا کر نہیں بلکہ جی کر دکھایا، طبلہ میں اجراڑا گھرانے کے استاد اکرم خاں خلیفہ استاد کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''جب استاد چاند خاں صاحب کا انتقال ہوا تھا تو لگا کہ گھرانے کا چراغ کیسے روشن ہوگا۔ لیکن خلیفہ نے سب کچھ سنبھال کر روایت کو خوشحال بناتے ہوئے اسے آگے بڑھایا۔ لیکن ایک بار پھر لگتا ہے کہ اب کیا ہوگا؟ اب کون اور کیسے سنبھالے گا نسلوں کی اس روایت کو۔ واضح رہے کہ دہلی گھرانے کی شروعات امیر خسرو سے مانی جاتی ہے اور خلیفہ استاد اقبال احمد خاں نے موسیقی کی شروعاتی تعلیم اپنے والد استاد چاند خاں سے حاصل کی تھی۔ اس کے بعد ان کی صلاحیت کو استاد ہلال احمد خاں اور استاد نصیر احمد خاں نے نکھارا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 18 دسمبر 2020

شمس الدین جونپوری

جونپور: کھیتاسرائے قصبہ واقع محلہ سالار گنج رہائشی طنز و مزاح کے شاعر شمس الدین (شمس جونپوری) کا 65 سال کی عمر میں حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہو گیا۔ ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں مرحوم کی تدفین بعد نماز عصر آبائی قبرستان میں عمل میں آئی۔ مرحوم کی نماز جنازہ قاری محمد معراج اویسی نے ادا کرائی۔ پسماندگان میں 5 بیٹے اور تین بیٹیوں کے علاوہ اہلیہ ہیں۔ مرحوم ریلوے کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد اہل خانہ کے ساتھ آبائی گھر میں مستقل طور پر سکونت پذیر تھے۔ تدفین میں علاقہ کی ادبی اور معزز شخصیات نے شرکت کر کے اہل خانہ کو تعزیت پیش کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 جنوری 2021

احسن شکارپوری

نئی دہلی: شکارپور کی ادبی شخصیت شاعر اہل بیت احسن شکارپوری کا حیدرآباد میں حرکت قلب کے بند ہوجانے سے انتقال ہو گیا۔ وہ تقریباً 70 سال کے تھے۔ ان کی تدفین حیدرآباد میں ہوئی، جس میں شامل ہونے کے لیے ان کے بیٹے اور دیگر ورثا دہلی سے حیدرآباد پہنچے۔ ان کے پسماندگان میں 6 بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔ واضح رہے کہ احسن شکارپوری کا رثائی ادب میں کافی نام رہا ہے اور بہت سی ماتمی انجمنوں میں ان کے کہے ہوئے کلام پڑھے جاتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ مرحوم کے کہے ہوئے مرثیے اور سلام و قصیدے وغیرہ بھی ثناخوان اہل بیت کی جانب سے پیش کیے جاتے رہے ہیں۔ دہلی کی بھی مختلف محفلوں میں احسن شکارپوری مرحوم کا آنا جانا تھا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 جنوری 2021

خراج عقیدت

جاوید اقبال

نئی دہلی: ڈاکٹر جاوید اقبال سیماچل کے تعلیمی و ادبی حلقے کی مشہور و معروف شخصیت تھے، جنھوں نے مختلف علمی، ادبی و تاریخی موضوعات پر کام کیا اور اپنی گرانقدر تصنیفات کے ذریعے بڑے کارنامے انجام دیے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار اردو کے مشہور ادیب و نقاد حقانی القاسمی نے فورم فار انٹیلکچول ڈسکورس کے تحت مرحوم ماسٹر محمد جاوید اقبال پر منعقد تعزیتی نشست میں کیا۔ اس موقعے پر پروگرام کے صدر مولانا اسحاق عادل نے اپنے خطاب میں کہا کہ جاوید اقبال صاحب کی شخصیت تصوف کی نسبت کے ساتھ ساتھ علمی گہرائی میں بھی اپنی مثال آپ تھی۔ پروگرام کو خطاب کرتے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر خالد مبشر نے کہا کہ جاوید اقبال کے کارنامے بے شمار ہیں، مرحوم نے بہ حیثیت استاد ہزاروں طلبا و طالبات کو تعلیم سے روشناس کرایا اور ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی تصنیف و تحقیق سے اہل علم و فکر کو متاثر کیا اور ادب و شاعری میں بھی طبع آزمائی کی۔ پروگرام کے ناظم اور مشہور ریسرچ اسکالر منظر امام نے اپنی گفتگو میں جاوید اقبال مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ ہماری ذمے داری ہے کہ ہم اپنے مرحومین کے کارناموں سے نئی نسل کو روشناس کرائیں اور ان کے علمی و ادبی سرمائے کو منظر عام پر لائیں، منظر امام نے قلمکاروں سے گذارش کی کہ وہ مرحوم کی شخصیت کی مختلف کاوشوں پر مضامین تحریر کریں جسے بعد میں کتابی شکل دی جائے گی۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہمیں مختصر کتابچے شائع کرنے پر زیادہ توجہ دینی چاہیے تا کہ کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام انجام دیا جا سکے۔ پروگرام کا انعقاد بٹلہ ہاؤس کے ڈائنامک انگلش انڈیا کے ہال میں منعقد ہوا، اس موقعے پر ڈاکٹر سرفراز احسن ڈپٹی رجسٹرار جامعہ ہمدرد نئی دہلی، ڈاکٹر انوار الحق، ڈاکٹر نعمان قیصر، محمد فیاض عالم، ماسٹر نسیم

حیدر، توقیر عالم جامعی، سینئر صحافی عبدالمنان، عمار جامی سمیت متعدد علمی ادبی، سماجی وصحافتی میدان کے ماہرین نے شرکت کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 21 دسمبر 2020

جون ایلیا

امروھه: بزم زندہ دلان امروہہ کی جانب سے مشہور و معروف شاعر جون ایلیا کے یوم پیدائش پر ایک خصوصی پروگرام ہاشمی ہاؤس محلہ قاضی زادہ میں کیا گیا جس میں جون ایلیا کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت ہاشمی ایجوکیشنل گروپ کے چیئرمین ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی نے کی اور نظامت نوجوان شاعر سید شیبان قادری نے کی۔ اس موقعے پر بولتے ہوئے ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی نے کہا کہ جون ایلیا ہمارے عہد کے بڑے شعرا میں سے ایک ہیں جنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے قاری کو

چونکنا ہونے پر مجبور کیا ہے۔ جون نے ہجرت کے بعد ہمیشہ امروہہ کی شاندار روایات اور تہذیب وتمدن کو پروان چڑھایا۔ وہ کراچی میں ضرور زندگی گزارتے رہے لیکن ان کا دل پوری طرح امروہہ میں رہا۔ سید مسرور حسن جوہر نے کہا کہ جون ایلیا نے پہلا شعر صرف آٹھ سال کی عمر میں کہا اور پھر عمر بھر سخنوری کرتے رہے۔ جون ایلیا کا اصل نام سید جون اصغر تھا اور وہ 14 دسمبر 1931 کو امروہہ میں پیدا ہوئے تھے۔ جون کے وصال کے بعد ان کی شائع ہونے والی تصانیف میں یعنی، گویا، لیکن اور گمان شعری مجموعے ہیں جب کہ ان کی معرکۃ الآرا نثری تحریریں 'فرنود' کے نام سے شائع ہوچکی ہیں۔ ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی نے کہا کہ جون ایلیا کی نثری تحریروں سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ جون صاحب ایک مشاق اور منجھے ہوئے نثر نگار ہیں۔ ان کی تحریر کا انداز بالکل بے تکلفانہ ہے، جو نہایت شیریں، دلچسپ اور پرتاثیر ہے۔ سید شیبان قادری نے کہا کہ اردو شعر وادب میں جون ایلیا اپنے لہجے اور اسلوب کے نئے پن، کلاسیکی مزاج کے ساتھ نئی جوت جگانے کے لیے اپنے داخلی شعور کو سامنے لاتے ہیں اور زندگی کی معنی خیز ترجمانی کرتے ہیں۔

روزنامہ 'سچ کی آواز' دہلی، 15 دسمبر 2021

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا / چاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر.................................... بتاریخ.................................... بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

قومی پالیسی برائے تعلیم 2020

وزارت تعلیم، حکومت ہند

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 116

قیمت: 35 روپے

بھارت کا آئین

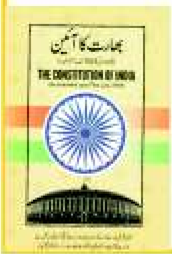

چھٹی اشاعت: 2019

صفحات: 515

قیمت: 330 روپے

آثار الصنادید (جلد اوّل، دوم، سوم)

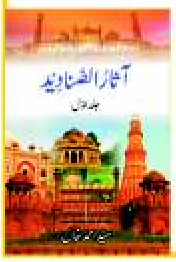

مصنف: سر سید احمد خان

تیسری طباعت: 2020

صفحات: جلد اوّل 386، جلد دوم: 297، جلد سوم: 424

قیمت (مکمل سیٹ): 950 روپے

دربارِ اکبری

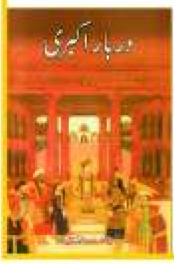

مصنف: شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد

تیسری طباعت: 2020

صفحات: 1070

قیمت: 475 روپے

گرو نانک: حیات و خدمات

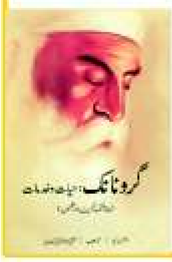

مرتبین: اختر الواسع، محمد حبیب

مفتی محمد مشتاق تجاروی

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 190، قیمت: 110 روپے

آج کے عالمی تناظر میں اردو کا تحفظ اور فروغ

مرتب: شیخ عقیل احمد

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 467

قیمت: 240 روپے

راسخ عظیم آبادی: کلاسیکیت، شعریت اور انفرادیت

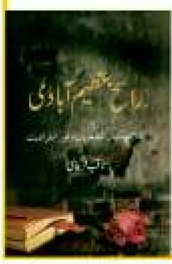

مصنف: ثاقب فریدی

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 422

قیمت: 200 روپے

حیاتیاتی تنوع اور ماحولیات کے مسائل

مصنف/مترجم: حافظ شائق احمد یحیٰی

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 132

قیمت: 90 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

URDU DUNIYA Monthly, February-2021, Vol.23, Issue:02
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2020-22
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/01/2021
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025